بلوچ

ایک توضیحی مطالعہ

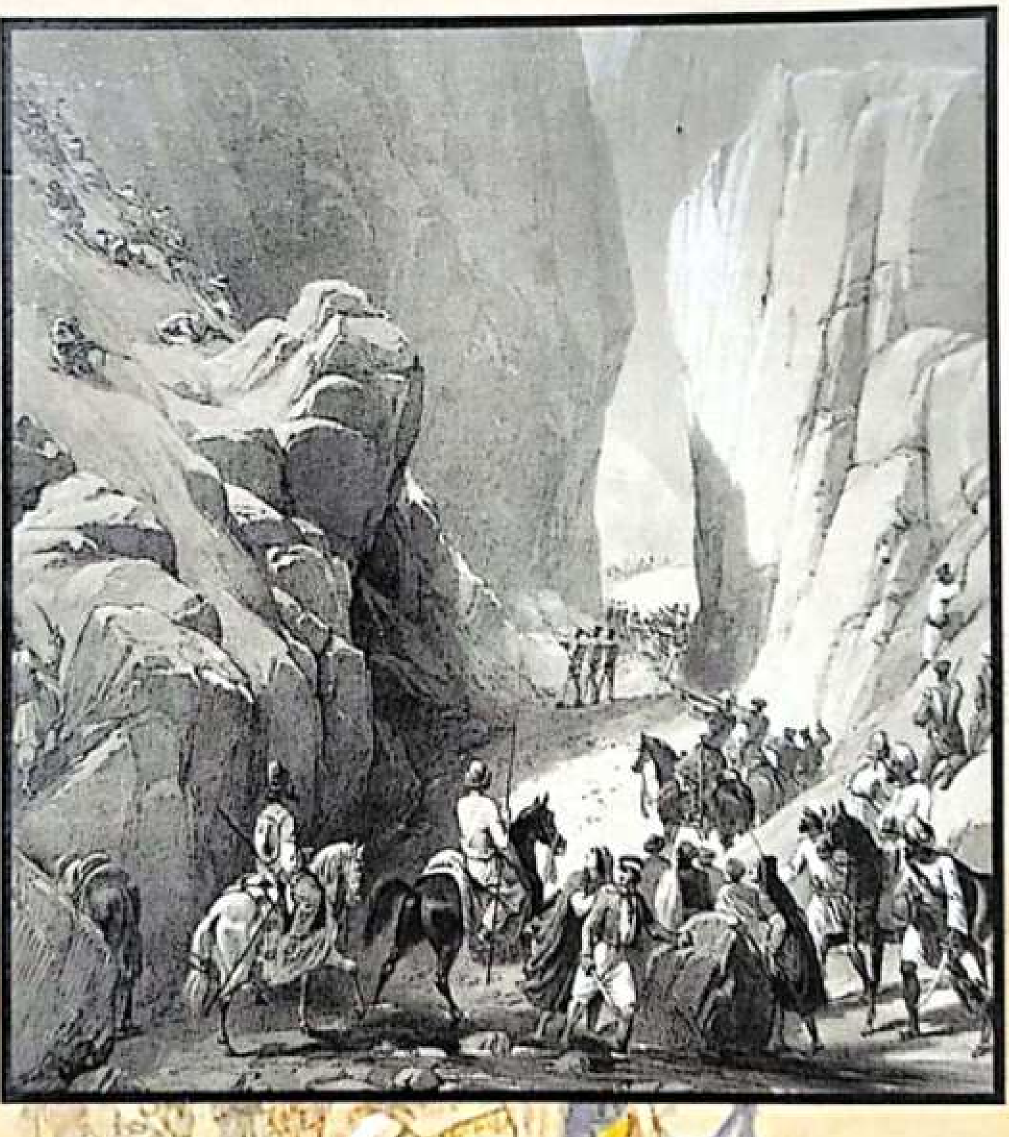

الفت نسیم

(A-8
10)

تاریخ نسیمی

بلوچ اور بلوچستان

(10)

Balochi Academy Quetta
ACC NO. 974/2
LIBRARY

بلوچ

ایک تاریخی توضیحی مطالعہ

اُلفت نسیم

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

www.balochiacademy.org
Email: balochiacademy@gmail.com

© بلوچی اکیڈمی کوئٹہ

کتاب کا نام	:	بلوچ ایک تاریخی توضیحی مطالعہ
مصنف	:	اُلفت نسیم
کمپیوٹر کمپوزر	:	عزیز جمالدینی
ڈیزائننگ	:	نذر بلوچ
پرنٹر	:	شوکت برادرز پریس، کراچی
اشاعت	:	2016ء
تعداد	:	500
قیمت	:	300

ISBN: 978-969-680-002-6

Balochi Academy Quetta LIBRARY
ACC.NO. 274/2

فہرست

صفحہ	مضامین	نمبر شمار
1	پیش لفظ	1
4	بلوچ نسل	2
29	حواشی	3
53	بلوچستان کے بلوچ	4
78	حواشی	5
134	بلوچ سندھ گزیٹر میں	6
138	حواشی	7

140	سندھ کے بلوچ	8
152	حواشی	9
173	تالپور بلوچ حکمرانان سندھ	10
246	حواشی	11
261	خوانین بلوچ قلات	12
296	حواشی	13

پیش لفظ

"بلوچ۔ ایک تاریخی توضیحی مطالعہ" ہمارے زیر مطالعہ رہنے والی بے شمار تحقیقی تصنیفات کا حاصل ہے۔ جو بلوچ تواریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کی خدمت میں پیش کیجارہی ہے۔ اور جو اپنے قاری کو بے حساب ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں شائع کی گئی سینکڑوں تصنیفات کے براہ راست اور صبر آزما مطالعے کے علاوہ ان کی مہنگی خریداری سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

تاریخ نویسی کی بنیاد تحقیق پر رکھی گئی ہے جو ایک مشکل اور جہادی کام ہے۔ جو کئی کئی سالوں پر محیط ہوتی ہے۔ پھر "تاریخ بلوچ و بلوچستان" کے موضوع پر تحقیقی کام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ جس نے بھی شروع میں تاریخ کی دلچسپی کے پیش نظر کمر باندھ کر اس بحر بیکراں میں غوطہ لگایا۔ جلد ہی جان کی امان پا کر نکل آیا اور پھر اسے آلودہ کرنے کی ٹھان لی۔ اور اسے دروغگوئی اور خود ساختہ مفروضات سے گدلا کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بحر کی تہہ میں پڑے ہوئے ہیرے تب تک کوئی نہیں پا سکتا جب تک کہ اسکی سطح کے گدلے پن کو شفاف نہ کیا جائے۔ ہماری بھی دو ڈھائی دہائیوں کی "شوہاز کاری" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ جس میں ہمیں یقیناً

کافی سے زیادہ کامیابی ملی ہے اور یہ کامیابی بلوچ اور بلوچستان کی تاریخ کے قاری کو نظر آ گئی ہے۔

موجودہ صدی کی تحقیقات کے دائرہ کار کو چار دانگ عالم سے پھیلنے والی تصنیفات اور تراجم نے لائبریوں تک محدود کر دیا ہے۔ علم دوست ممالک نے زندگی کے مختلف شعبوں میں تحقیقی کاموں میں رغبت پیدا کرنے کیلئے کروڑوں روپے کے اخراجات سے عظیم الشان لائبریریاں اور ریسرچ کمپلیکس تعمیر کئے اور قائم کئے ہیں جن میں محقق اور علم کے متلاشی اپنے اپنے ذوق کے مطابق فائدہ اٹھاتے ہیں۔ جہاں تک ہمارے علم دشمن حکمرانوں کا تعلق ہے ان کے ''دولت سمیٹو اور موج اُڑاؤ'' تاریک اذہان میں علمی مراکز اور ریسرچ کمپلیکسوں کی تعمیر و قیام کا تصور جگہ نہیں پا سکا ہے۔ اسی لئے یہاں پر تحقیقی کاموں کیلئے بڑی بڑی لائبریریاں اور تحقیقی مراکز عنقا ہیں اور تحقیق و تصنیف کے متلاشی بکسیلرز کی دکانوں، پرانی کتابوں کے کھوکھوں، میونسپلٹیوں کی اِکا دکا چھوٹی لائبریریوں اور یار دوستوں کے پاس موجود کتابوں کے پیچھے بھاگتے رہتے ہیں۔ جہاں سے جو کچھ ہاتھ آیا انہی پر انحصار کر کے کام چلاتے ہیں۔

اس طریقے سے کام چلانے والوں میں ہم بھی شامل ہیں۔ گذشتہ چند مطالعاتی سالوں میں ''بلوچ'' موضوع پر جو کچھ ہماری نظر سے گذرا اُسے پلے باندھا اور اپنی تحقیقات اور معلومات کی روشنی میں ان کو جانچا اور رائے زنی کی۔ اس کتاب میں یہی کچھ ہم اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

اِس کتاب کی تدوین کے سلسلے میں بھی میں اپنے ان تمام بزرگوں، دوستوں اور مہربانوں کے احسان تلے دبا ہوا ہوں جن کے نام اس سے پہلے کی ایک دو کتابوں میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ اسی طرح میں بلوچی اکیڈمی کے ارباب اختیار کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے کبھی بھی بلوچ اور بلوچستان بارے تصنیفات کی حسب استطاعت اِشاعت میں تنگ نظری کا ثبوت نہیں دیا اور کبھی گروہیت کے چکر میں نہیں پڑے۔ ہماری نیک تمنائیں ان کے ساتھ ہیں۔

الفت نسیم

خضدار بلوچستان

14 دسمبر 2014

بلوچ نسل

بلوچ قوم کا ماخذ یا بلوچ نسل کی تاریخی جستجو کے سلسلے میں کئی محققین اور مصنفین نے اپنی کاوشوں کو مختلف مقالاتی اور کتابی شکل میں پیش کیا ہے۔ یہاں اُن کی تحریروں کا خلاصہ پیش کیا جاتا ہے۔ جنہیں پڑھ کر ''بلوچ اصل و نسل'' کی جستجو کرنے والے اپنے ذہن میں بلوچ کی ابتدائی تاریخ کا ایک نقشہ قائم کر سکتے ہیں۔ جبکہ بیسوں کتابیں الگ الگ ان کے پیش منظر و پس منظروں کے مطالعہ کے ساتھ ان کے اذہان میں بلوچ نسل کے بارے میں کوئی نظریہ قائم نہیں کر سکتے واضح ہو کہ عربی تواریخ میں ''بلوچ'' کیلئے ''بعلوص، بیلوص'' استعمال کیا گیا ہے۔

شیخ محمد اکرم کردستانی نے اپنی کتاب ''تاریخ مردوخ'' میں قدیم اسرائیلی تصنیفات کے حوالے سے ''نمروذ'' کو پہلا کلدانی بادشاہ بتاتے ہوئے اُسے نمرود بیلوص کے لقب سے یاد کیا ہے (1) اور لکھا ہے:

''سمی رامس، بیلوص (2) کی بیٹی
تھی جس نے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور

دریائے سندھ پار کر گئی لیکن ہندوستان کے

. بادشاہ نے اسے شکست دیدی۔ می رامس کے

مرنے کے بعد اِس کا بیٹا بیلوص دوئم تخت پر

بیٹھا۔"

کروستانی نے بلوچ موضوع پر تفصیلاً بات نہیں کی ہے لیکن اس کی نگارشات سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے کہ وہ پہلے بادشاہ کالدیا "بیلوص" (بلوچ) کو ہی بلوچ نسل کا جدِّ امجد مانتا ہے۔ جس کا بیٹا اور جانشین نمرود اوّل تھا۔ یوروپی محقق پروفیسر رالنسن بلوچ نسل کو بابل کے بادشاہ "بیلوص" سے منسوب کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

"بیلوص، بابل کا بادشاہ گذرا ہے

اور یہ وہی شخص تھا جس کا ذکر کتاب مقدس

میں نمرود بن کوش کے نام سے ملتا ہے (3)

نمرود بابل کا مہادیو لنگھم دیوتا تھا اس کو

"بیکچوس" بھی کہتے تھے جو دراصل لفظ

"برکوش" کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔

"برکوش" کے معنی ہیں "کوش کا بیٹا"۔ چنانچہ

علماء بھی اسے تسلیم کرتے ہیں کہ "برکوش" یہی

نمرود تھا جو چیتے کی کھال پہنتا تھا۔ چیتے کو

عبرانی زبان اور کلدانی زبانوں میں ''نمر'' کہتے ہیں پس نمرود کے معنی ''چیتے کو زیر کرنے والا'' کے ہوتے ہیں۔''

معروف مورخ جناب سردار خان بلوچ اپنی تصنیف ''بلوچ اور بلوچستان'' میں لکھتے ہیں:

''بیلوص (بلوچ) کلدانیوں کا عظیم دیوتا سورج دیوتا تھا۔ اسی مناسبت سے کلدانیوں کا بادشاہ نمرود اپنے کو نمرود بیلوص کہلواتا تھا............ انجیل میں نمرود کو کوش کا بیٹا کہا گیا ہے، نمرود کو نمرود بیلوص اور شہر نمرود کو شہر بیلوص کہتے تھے (4) نمرود کو ایک مجازی خدا یا دیوتا مانا جاتا تھا۔ نمرود ہی پہلا کلدانی نسل بادشاہ تھا جسے بلوص کہا جاتا تھا۔ کوچ کلدانی نسل کی بادشاہت تقریباً سولھویں اور سترھویں صدی قبل مسیح کے درمیانی عرصہ میں زوال پذیر ہوئی، ''یہ حکمرانوں کی ایسی نسل تھی جو تقدیر کے پنجہ استبداد کا ناگہانی شکار بن گئی۔

ایک ایسی نسل ، جو دنیا کی اوّلین پرعظمت تہذیب وتمدن کی خالق تھی، اس طرح گوشہ گمانی میں چلی گئی کہ عبرت ہوتی ہے۔ از منہ قدماء کی تاریخ کے ان کلدانیوں کو، شورش اور افراتفری کا شکار ہونے کے بعد، زمانہ مابعد، اس نام سے سُنا تک نہیں جاتا۔ بلکہ تاریخ کے وسطی ادوار میں ان لوگوں کو دیار غیر میں غیروں کی حکومت میں بلوچ یا بلوص کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ وہ اِس نام سے اپنے محبوب دیوتا، مخصوص مذہب، بیلوص دیوتا اور بلوص مندر کی نسبت سے مشہور و معروف ہوئے۔"(5)

یہی مُصنف بلوچ سلسلے کی بحث کو بڑھاتے ہوئے آگے "بلوچ فارس میں" کے تحت یوں رقمطراز ہیں:

"مشاہدے میں آیا ہے کہ داخلی افراتفری اور طوائف الملو کی اور بیرونی حملوں کے مختلف ادوار میں بابلی قبائل نے کس طرح

اپنے اصلی مادر وطن کو خیر باد کہا اور شام اور شمالی فارس کے بالائی علاقوں کی جوانب کا رخ کیا۔ قابل تعظیم اور معزز کلدانیوں نے شمالی فارس میں سکونت اختیار کرنے کے بعد ایک نئے دور میں داخل ہو کر اختلاط کے عمل کا آغاز کیا۔ چند صدیوں کے اندر اندر پوری نسل نے بابل کے سامیوں کے ساتھ اپنا نسبی اور لسانی رشتہ فراموش کر دیا۔ اپنے تاریخی مادر وطن بابل کو بھلا دیا، اپنی زبان بھول گئے، اپنے نسلی شہرہ اور عظیم تابناک تاریخ کی یادوں کو محو کر دیا۔ وہ رفتہ رفتہ دنیا کی آئندہ تواریخ میں بلوچ مشہور ہو گئے۔ انہوں نے اپنے نسلی اور رر خون کے فطری افتخار، نسلی روایات و رواجوں کے علاوہ اپنی ہر متاع عزیز گنوا دی۔

تاریخ کی تمام ناانصافیوں کے باوجود منتشر حالت میں بھی ایک ایسی نسل رہے جو تفخر و افتخار سے سرشار رہی گو کہ اس کی نہ تو کوئی

منزل تھی، نہ تو اس کا کوئی مستقبل تھا۔ نہ وہ کسی مال ومتاع کے مالک تھے۔ وہ ایک ایسے نسلی وخونی افتخار سے سرمست ومدہوش تھے جومحتاج مال ومتاع نہ تھا۔ وہ ایک ایسی بہادر نسل کے فرزند تھے جس کا کوئی رہنما نہ تھا اور جس کی کوئی ریاست نہ تھی، وہ پہاڑوں سے اُترے ہوئے سیل رواں کی مانند خانہ بدوشوں کے جم غفیر سے تعلق رکھتے تھے جس کی متعینہ حدود وسرحدات نہ تھیں۔"

"500 ق م سے لیکر پندرھویں صدی عیسوی کے اختتام تک فارسی (ایرانی) بادشاہوں کے زیرنگیں رہتے ہوئے وہ تمام عرصہ ایک حرکت پذیر آبادی کی طرح ایک جگہ سے دوسری جگہ دور افتادہ علاقوں میں تحفظ اور معاش کی تلاش میں ہجرت ومسافرت کرتے رہے(6) گذشتہ بیس صدیوں کی تاریخ بلوچ قوم کیلئے حزن و ملال ، مایوسی، بدبختی اور

آفتوں کا مرقع ومجموعہ ہے۔ یہ نسل صدیوں
تک کردستان، گیلان، ایلان اور ارمیدیا کے
کوہستانی علاقوں میں مقیم رہی۔ کچھ عرصہ قبل
تک وہ فارس کے وسطی علاقوں میں منتشر
پڑے تھے۔ شمالی صوبوں میں ان کی ہجرت
سے لے کر صوبہ کرمان میں مستقل سکونت
اختیار کرنے کی مدت کے بارے میں وثوق
سے نہیں کہا جاسکتا۔ شاید ان کی ہجرت کا
باعث بدنام ورسوائے زمانہ، سفاک، وحشی
اور بربریت کے غماز ہُن لوگوں کا حملہ
تھا۔''(7)

''خلفائے راشدین کے زمانے
میں ہم کرمان کو بلوچوں کی آماجگاہ پاتے ہیں
کرمان میں ان کی سکونت پذیری کے پس
منظر میں اس نسل اور اس صوبہ کے غم واندوہ کی
ایک طویل داستان پوشیدہ ہے، جب عرب
سپہ سالار عبداللہ بن عبداللہ الصلولی نے ۲۲ھ

ہجری (643-642ء) میں کرمان کے صدر
مقام کو فتح کیا تو کرمانیوں نے کوچ و بلوچ
(کوچ اور بلوچ) (8) سے امداد طلب کی تھی
مگر اس کا کوئی نتیجہ بر آمد نہیں ہوا۔ (9)
مسعودی کے مطابق کوچ و بلوچ اُس زمانے
میں کرمان کے پہاڑوں میں آباد تھے۔
اصطخری نے اپنے تاریخ میں جو 951ء میں
تکمیل کو پہنچی لکھا ہے کہ بلوچ، قفص کے
پہاڑوں میں رہتے ہیں۔ جہاں کوئی بھی
جھانکنے اور داخل ہونے کی جرات نہیں کرسکتا
وہ مال مویشی پالتے ہیں اور خیموں میں رہتے
ہیں۔ اُن کے علاقے سے گذرنے والے
راستے محفوظ نہیں ہیں۔ 615ء ھ میں اپنا
جغرافیہ مکمل کرنے والے یاقوتی کرمان کے
پہاڑوں کو ''کوچ و بلوچ'' اور ''قاران'' کے
کہستانوں میں تقسیم کرتا ہے اور لکھتا ہے کہ
کوچ (قفس) لمبے (10) قد کھاٹ کے تھے

اور جابر وظالم انسان تھے ان کا گذر اوقات

لوٹ مار پر تھا۔ بلوچ لوٹ مار میں حملہ آور

قبائل میں سے سب سے زیادہ سفاک تھے مگر

ان کو عبید الدولہ دیلیمی نے تباہ و برباد کر دیا۔"

(11)

"مقدسی نے کرمان، صحرائے لُوط (12)،

مکران کی جانب سفر اختیار کیا تھا اور تقریباً

ستر دنوں تک اس راستے میں سفر کرتا رہا تھا۔

اس کا کہنا ہے کہ پورے صحرا میں بلوص

(بلوچ) قبائلیوں کے معروف گشت جھتوں

نے دہشت پھیلا رکھی تھی اور کرمان کی سرحد

قفص (13) کی پہاڑیوں میں ان کی قلعہ

بندیاں تھیں۔ وہ بلوچوں کی تعریف یوں کرتا

ہے: وہ ایسے لوگ ہیں جن کے چہرے

وحشتناک ہیں، دلی بدخو ہیں اور نہ ان کا کوئی

اخلاق ہے نہ طور طریقے اچھے ہیں۔ کوئی بھی

شخص ان سے مل کر صحیح سلامت واپس بچ کر

نہیں جاسکتا۔ اور جب ایک دفعہ کوئی پکڑا
جائے تو وہ اسے کسی سانپ کی طرح سنگسار
کرکے ختم کردیتے ہیں۔ کسی انسانی سر کو وہ
کسی بڑے گول پتھر کے ٹکڑے پر رکھ کر اُس
وقت تک اس کو اس کے ساتھ ٹھکرا کر مارتے
رہتے تھے جب تک وہ پاش پاش نہ ہو جاتا۔
اور جب مقدسی نے اس غیر انسانی فعل کی وجہ
دریافت کی تو اس کو جواب میں بتلایا گیا کہ وہ
ایسا اس لئے کرتے ہیں تاکہ بلاضرورت ان
کی تلواریں کند نہ ہو جائیں'' (14)

مشہور و معروف محقق جناب جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری اپنی تصنیف ''بلوچستان، تاریخ کے آئینے میں'' قدیم بادشاہت نامی تالیف کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''لفظ بلوچ، بالوس یا بلوص سے
مشتق ہے جو بابل کا بادشاہ تھا۔ یہ وہی ہستی
ہے جسے کُش یا کوش کا بیٹا نمرود بھی کہا جاتا
ہے.......... ہر قوم ہر قبیلہ اور ہر شہر اپنے دیوتا

یا اپنے اپنے خدا کی پرستش کرتا تھا۔ انہیں
ایک دوسرے سے ممیز کرنے کیلئے مختلف
خطابات سے نوازا جاتا تھا۔ کلدانیوں کا دیوتا
بیلوص تھا اور ان کا بادشاہ جیسا کہ کہا جاچکا
ہے، اپنے آپ کو نمرود بیلوص کہلاتا تھا۔ نتیجتاً
اس کے پیروکاروں نے بھی یہی نام اپنایا تھا۔
شہروں اور دریاؤں کے نام بھی اسی دیوتا کے
نام پر رکھے جاتے تھے۔ اس کے پیروکار
بیلوص کہلاتے تھے جنہیں عرب مورخین نے
بالوس کے نام سے یاد کیا ہے۔ موجودہ زمانے
میں بھی پٹھان، بلوچوں کو بالوس ہی کہتے
ہیں............... بلوچ، کوشوں کی نسل کے
کلدانی قبیلہ کے شاہی خاندان سے تعلق
رکھتے ہیں۔ پہلے کلدانی خاندان کا پہلا
زبردست حکمران نمرود بلوس تھا۔ اس کے بعد
اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران شہنشاہ
بلوس تھا جس نے 2113 ق م میں بابل پر

حکومت کی تھی۔ نمرود کو توریت کی کتاب
''پیدائش'' میں ''زمین پر پہلا زبردست
حکمران'' کہا گیا ہے۔ اِ سکینر توریت میں
مذکور اس نمرود کے متعلق اپنی کتاب میں لکھتا
ہے کہ ''وہ ایسی قومی ریاست کے قیام کے
خیال کا بانی تھا جس کی طاقت فوج کی قوت پر
ہو۔''

سردار خان گشکوری اور جسٹس خدا بخش بجارانی مری کے مذکورہ بالا تحقیقی بیانات پر ایک بلوچ محقق اور کتاب ''تواریخ بلوچ .... بلوچ قوم کا حسب ونسب'' کے مصنف جناب ڈاکٹر میر عالم خان راقب (ڈیرہ اسماعیل خان) نے لکھا:

''بلوچوں کا مورث اعلی بلوص تھا، جس کا دوسرا
نام نمرود تھا، ان کا عہد حکومت 2130 ق م
ہے اس پر اتفاق ہے لیکن واقعات یہ ثابت
کرتے ہیں کہ جناب بلوص سامی النسل تھے،
ان کا دوسرا نام نمرود نہ تھا اور ان کا وجود
5800 قبل مسیح سے بھی قبل تھا۔ کیونکہ تقریباً
4500 ق م سے جناب بلوص کے خاندان

کے ہاتھ سے عراق کی حکومت چلی گئی تھی اور ان کا ملک چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں بٹ گیا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ 4500ق م کے جو کتبے دریافت ہوئے ان میں جناب بلوص کو دیوتا ظاہر کیا گیا ہے اور جگہ جگہ اس کی عبادت گاہیں بنائی گئی ہیں۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ پرانے زمانے کے لوگ ایک نیک اور بہادر انسان کی پرستش شروع کردیتے تھے جو آہستہ آہستہ دیوتا کا نام پا کر مرجع خلائق بن جاتا تھا۔ لہذا جناب بلوچ انسان تھے، نیک اور پرہیز گار ہونے کے ساتھ نہایت ہی بہادر تھے اس لئے لوگوں نے اس کی موت کے بعد اس کی پرستش شروع کردی پس ثابت ہوتا ہے کہ جناب بلوص 4500ق م سے پہلے وجود رکھتے تھے اور یہ غلط ہے کہ 2130ق م میں وہ عراق پر حکمران تھے۔ نمرود جس نے حضرت ابراہیم

پر مظالم ڈھائے تھے اور ہجرت پر مجبور کر دیا
تھا، اس نمرود اور حضرت بلوص کے عہد میں
ہزاروں سال کا فرق پایا جاتا ہے۔ لہذا
جناب بلوص کو محترم مؤرخ کا نمرود قرار دینا
صریح غلطی ہے۔"(15)

مسٹر پونگر کی طرح محقق موسیو خانیکوف نے بلوچوں اور ترکوں میں مشترک بعض عادات کو دیکھتے ہوئے فیصلہ دیا ہے کہ بلوچ تُرکمان نسل سے ہیں(16)۔اس خیال پر بحث کرتے ہوئے ڈاکٹر میر عالم خان راقب نے لکھا ہے کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوچوں نے ہزاروں سال تک ایشیائے کوچک کے جنت النظیر خطہ مُلک لیڈیا پر حکمرانی کی ہے۔اور اپنے عادات واطوار کے انمٹ نقوش ایشیائے کوچک کے باسیوں پر چھوڑے ہیں مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ بلوچ، ترکمان نسل سے قرار پائے ہیں۔ بلوچوں نے لیڈیا میں بحیثیت حکمران ہزاروں سال گذارے مگر جب حکومت ختم ہوگئی تو واپس اپنے وطن عراق لوٹ آئے یا محفوظ پہاڑوں میں چلے گئے(17)۔

ترکمانوں سے بلوچوں کی مشابہت کے نظریے پر لانگ ورتھ ڈیمز نے بھی تنقید کرتے ہوئے لکھا:

"بعض حضرات نے بلوچوں کے کردار اور خصائل نیز
رسم ورواج کو شواہد کے طور پر پیش کیا ہے اور انہیں

ترکمانوں اور عربوں سے ملا دیا ہے۔ اس میں کوئی شُبہ نہیں کہ ترکمانوں سے ان کی بڑی مشابہت ہے لیکن ایران کے اصل خانہ بدوش قبائل سے ان کی مشابہت اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی مدِّ نظر رکھنا چاہیے کہ صحرائی علاقوں میں آباد خانہ بدوش قبائل میں مختلف النسل ہونے کے باوجود ایک جیسے رسم ورواج کی نشو ونما وارتقاء ہوسکتی ہے۔ مثلاً وسطی ایشیا اور سطح مرتفع فارس کے علاقے کے رہنے والے گھوڑوں کے اسی طرح دلدادہ ہوتے ہیں جس طرح اہل عرب ۔ جب بلوچ تاریخ میں پہلی بار متعارف ہوتے ہیں تو اشکانیوں کی طرح گھڑ سوار اور تیر انداز کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ اور ان کے پاؤں میں سرخ رنگ کے بڑے بڑے جوتے ہوتے ہیں۔ ان کے سامان میں پٹی دار کمبل اور قالین کا ذکر ملتا ہے۔ ان تمام خصائص کا تعلق شمالی فارس کے لوگوں سے ہیں۔ نہ کہ عربوں سے ۔ جب یہ غنیم کے قریب پہنچتے ہیں تو شاہنامہ کے نبرد آزماؤں کی طرح اپنے گھوڑوں

سے اتر کر دو بدو لڑتے ہیں اور یہ رواج ان میں آج بھی پایا جاتا ہے۔ عربوں سے ان کی ایک خصلت بالکل جداگانہ ہے اور وہ یہ کہ بلوچ دل کے بڑے کشادہ، خوش مزاج، بذلہ سنج اور آسانی سے رام ہونے والے لوگ ہیں۔ مذہبی امور میں یہ لوگ انتہا پسند نہیں ہوتے بلکہ اس کے برخلاف معقولیت پسند اور روادار ہوتے ہیں۔ نیز وسیع القلبی کے ساتھ مسائل پر بحث و تمحیص کر سکتے ہیں۔ ان کی رزمیہ شاعری، قصص اور روایات میں مافوق الفطرت عنصر کا بالکل فقدان ہے چنانچہ انہیں مغضوب الغضب، تنگ نظر اور مذہبی طور پر انتہا پسند عربوں کے مشابہ قرار دینا بعید از قیاس ہے"(18)

ایک اور محقق کرنل ای۔ موکلر نے اپنے ایک مقالہ "بلوچوں کی اصل" میں غیر رند بلوچوں کے بارے میں دوٹوک بات کرتے ہوئے لکھا ہے کہ حقیقت یہی ہے کہ زیادہ تر بلوچ قبائل مکران کے باشندے ہیں اور یونانیوں نے جس علاقے کو گدروشیا کہا ہے وہیں سے ان کا تعلق ہے۔ وہ رندوں کو علافی عرب بتاتے ہوئے لکھتا ہے کہ ان کے خیال میں وہ حارث علافی کی اولاد میں سے ہیں جس نے حجاج کے خلاف لڑائی لڑی اور

آخر کار 86ھ میں سندھ کی طرف فرار ہوگیا۔ وہ ''حلب'' کو علافیوں کا مرزبوم بتاتا ہے۔(19)۔

بلوچی زبان کے ملک الشعرااور تاریخ نویس میر گل خان نصیر بھی اپنی تصانیف ''تاریخ بلوچستان''، ''بلوچستان...... قدیم وجدید تاریخ کی روشنی میں'' اور ''کوچ وبلوچ''میں ''بلوچ'' موضوع پر اپنی تحقیق پیش کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بلوچ اس سرزمین کے قدیم باشندے ہیں شاہنامہ فردوسی میں فردوسی اُس زمانے میں بھی اس سرزمین پر بلوچوں کے آباد ہونے کا ذکر کرتا ہے جبکہ رستم بن زال دس سال کا بچہ تھا، ایران پر منوچہر کی حکومت تھی۔ اس لحاظ سے رستم کی پیدائش اور بچپن کا زمانہ ایران پر خاندان کے (کیقباد، کیخسرو وکیکاؤس) کی حکومت سے بھی سینکڑوں برس پہلے کا ہے۔''(ا)

ا۔ بلوچستان، قدیم اور جدید تاریخ کی روشنی میں پہلا باب بلوچوں کی سرزمین صفحہ ۱۳۔ واضح ہو کہ شاہنامہ کی تاریخی داستان 3874 سال قدیم واقعات پر روشنی ڈالتا ہے۔ کیکاؤس کا دور حکمرانی 535 سے 558 قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ بلوچ اُس وقت ایک زبردست فوجی قوت تھے جو ناقابل شکست تھے۔

آگے تحریر کرتے ہیں:

''مورخین کے ایک نمایاں طبقے کا خیال ہے کہ بلوچ اور کرد ایک ہی نسل کے لوگ یعنی کلدانی ہیں۔ قدیم زمانوں میں یہ لوگ دجلہ وفرات کی وادی میں آباد تھے۔ نمرود بلوص کے دور اقتدار کو بلوچوں کی عظمت وشہرت کی معراج کا زمانہ تسلیم کیا جاتا ہے۔

نمرود بلوص کے بعد اُس کی بیٹی سمی رامیس تخت نشین ہوئی۔ شیخ محمد کردستانی لکھتا ہے کہ سمّی رامیس نمرود بلوچ کی بیٹی تھی۔ اس ملکہ نے ہندوستان پر لشکر کشی کی اور دریائے سندھ پار گزر گئی لیکن ہندوستان کے بادشاہ نے اپنے ہاتھیوں کی فوج کی مدد سے اُسے شکست دی۔ سمّی رامیس کے بعد اُس کا بیٹا بلوص دوئم تخت پر بیٹھا اور اس کے بعد اُس کی بیٹی آتوسا تخت نشین ہوئی۔ یہاں یہ امر واضح رہے کہ نمرود بلوص کی ماں کا نام بھی سمّی

رامیس تھا جو کوش کی بیوی اور حضرت نوحؑ پیغمبر کی بیوی کی نواسی تھی۔

''بابل اعظم کا زوال'' نامی کتاب کا مصنف لکھتا ہے کہ بلاشبہ بابلیوں کے اپنے بادشاہ نمرود کو اس کی موت کے بعد دیوتا کا درجہ دیا۔ اور اس کی پرستش کرنے لگے۔ اس سے ان میں نمرود کی روح کے لافانی ہونے کا اعتقاد پیدا ہوا۔ بابل کے مندر بلوص میں ایک اور دیوی کا بُت رکھا ہوا تھا جس کی پرستش کیجاتی تھی۔

''بابل اعظم کا زوال'' نامی کتاب کا مصنف مزید لکھتا ہے کہ بیشتر یہودی مصنفین اس بات پر متفق ہیں کہ نمرود کی ماں کا نام سمّی رامیس تھا جو حضرت نوحؑ پیغمبر کی بیوی کی نواسی تھی۔ سمّی رامیس ایک بلند مرتبت خاتون تھی۔ لوگ سمی رامیس کو اس قدر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے کہ موت کے بعد

اس کی بھی پرستش کی جانے لگی اور اس طرح
اُس کو ایک دیوی کا رُتبہ حاصل ہوا۔'' یہی
مصنف مزید لکھتا ہے کہ جس طرح نمرود کو جو
عظیم طوفان کے بعد کا پہلا فانی انسان تھا جسے
اُس کی قوم نے دیوتا مانا اور پھر رفتہ رفتہ اُس کو
دیوتاؤں کے باپ کا درجہ دیا گیا، اسی طرح
اُس کی ماں سمّی رامیس بھی دیوتاؤں کی ماں
بنی لہٰذا کوش، اُس کی بیوی سمّی رامیس اور نمرود
بلوص کی جو تثلیث بنی اس میں زیادہ اور نمایاں
بزرگی اور جلال بیٹے یعنی نمرود کو حاصل ہوا،
بالکل اسی طرح جیسے عیسائیوں کے مذہب
تثلیث میں خُدا، بیٹا اور روح القدس میں ہوتا
ہے۔

ہمارے پاس ایسے شواہد موجود ہیں
جن کی رُو سے ہم یقینی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ
ماں کی پرستش کی بنیاد سمّی رامیس سے پڑ چکی
ہے جس کے متعلق متفقہ طور پر تسلیم کیا جاتا ہے

کہ بابل کے باشندے اور بعض دوسری
مشرقی اقوام بھی ''رُحیا'' یعنی ''عظیم دیوی
ماں'' کے نام سے سمی رامیس کی ہی پرستش کیا
کرتے تھے۔''(۱)

مختلف حوالوں سے اپنی تحقیقی مباحث کو سمیٹتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ بلوچوں کے متعلق راولنسن کی اس رائے کو تسلیم کرتے ہیں کہ نام بلوچ، بلوص سے نکلا ہے۔ بلوص بابل کے بادشاہ اور کلدانی سلطنت کے بانی مبانی تھے جس کا نمرود بن کوش کے نام سے مقدس حکمنامہ میں ذکر گیا گیا ہے۔''

''الغرض نمرود کی موت کے بعد جب کلدانی سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا اور نسل برکوش، بُخت نصر اور دوسرے فاتحین کے حملوں کی تاب نہ لاکر پراگندہ اور منتشر ہوئی اور دجلہ وفرات کی وادی کو چھوڑ کر ان کو کوہستان زگروس اور سطح مرتفع ایران کی بعض آباد وغیر آباد وادیوں، کوہستانوں اور صحراؤں میں پناہ لینا پڑی تو وہاں کے آریائی اور غیر آریائی مقامی باشندے ان کو اپنی زبانوں اور تلفظ میں مختلف نام دیتے رہے۔ کہیں وہ برکوشی، بلکوشی، کوشی یا کوچی کے نام سے مشہور ہوئے اور کہیں ان کو بلکوچ، بکچوس اور بلوص کہا جانے لگا جو بگڑتے بگڑتے بلوچ بنا۔ یہاں تک کہ اب بھی ہمسایہ افغان اور عرب اُن کو بلوص، ایرانی اور ہندی ان کو بلوچ اور سندھی ان کو بردچ کہتے ہیں۔(20)

....

۱۔ کتاب، ایضاً، نواں باب، تاریخ عمومی

بلوچوں کی وادی دجلہ وفرات سے ہجرت کو مورخین تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دور اُسے قیاس کیا جاتا ہے جب بلوچ اپنی ملکہ سمّی رامیس کی قیادت میں دریائے سندھ تک پہنچ گئے۔ ہندوستان کے بادشاہ سے شکست کھانے کے بعد اُن میں سے بیشتر قبائل سندھ، مکران اور کرمان میں پیچھے رہ گئے اور رفتہ رفتہ ان علاقوں میں آباد ہو گئے بالکل اسی طرح جیسے سکندر اعظم کی وفات کے بعد بعض یونانی سپہ سالاروں نے اپنے اپنے دستوں کے ساتھ یونان واپس جانے کی بجائے ان مفتوحہ علاقوں کو اپنا مسکن بنایا۔"(21)

بلوچوں کی ہجرت کا دوسرا دور بُخت نصر اور سائرس اعظم کی فتوحات کے دوران عمل میں آیا جبکہ وہ کوہستان ذاگروس سے کوہ البرز تک ایران کی بعض آباد و غیر آباد وادیوں، کوہستانوں اور صحراؤں میں پھیل گئے۔

تیسرا دور عام طور پر اُسے تسلیم کیا جاتا ہے جب حضرت امام حسینؓ کی شہادت کے بعد خلیفہ یزید بن معاویہ کے حکمرانوں نے بلوچوں پر محض اس لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا کہ وہ حضرت امام حسینؓ اور اہل بیت کے طرفدار تھے۔ اس دور میں بلوچوں نے کرمان اور اس کے گردونواح کے علاقے میں جسے انہوں نے جگلین کا نام دیا ہے، سکونت اختیار کی۔"(۱)

....

۱۔ کتاب ایضاً، نواں باب، تاریخ عمومی صفحات 262-266۔ نیز ملاحظہ کریں حاشیہ نمبر 22۔

خوانین قلات کے آخری تاجدار خانِ بلوچ میر احمد یار خان بلوچ نے دو کتابیں تصنیف کیں۔ ایک انگریزی میں ''انسائیڈ بلوچستان'' مطبوعہ رائل بک کمپنی، کراچی اور دوسری ''مختصر تاریخ بلوچ قوم وخوانین بلوچ'' مطبوعہ ایوان قلات سریاب روڈ کوئٹہ۔ انہوں نے بلوچ نسل کے بارے میں یوں خامہ فرسائی کی ہے:

''بلوچ قوم مشرق وسطی کی عظیم نسلی وحدت ہے۔ اس رزم آرا اور غیور قوم کی تاریخ ہزاروں سال پُرانی ہے۔ بلوچ حلب کی وادیوں میں بسنے والے عربی بادیہ نشین تھے(23) اہل عرب کی طرح یہ قبائل بھی خود کو حضرت ابراھیمؑ اور حضرات اسماعیلؑ کی اولاد خیال کرتے تھے۔ اوران کے تعمیر کردہ معبد کی ہرسال زیارت کرتے تھے۔ مختلف قبائل میں بٹے ہوتے تھے اور ہر قبیلے کا سردار اپنا تھا۔ ان کی آپس میں خونریز جنگیں بھی ہوتی تھیں اور مغلوب قبیلہ اس وادی سے کوچ کر جاتا (24)۔ حلب سے بلوچوں کے اخراج کا عمل کئی صدیوں تک جاری رہا۔

...demy Quetta
Academy Quetta
...RY

Balochi Academy Quetta
ACC NO. 247
LIBRARY

بالعموم ان کا رُخ شمال مشرق کی جانب ہی رہا۔ ظہور اسلام سے قبل بلوچ اور کُرد کا نام نمایاں نظر آتا ہے۔ دونوں بھائی تھے۔ دونوں سردار تھے۔ ایک خانہ جنگی میں کُرد نے عراق کا رُخ کیا اور پھر اس کی اولاد تُرکستان اور اس سے آگے منگولیا تک بڑھتی چلی گئی۔ بلوچ کو بھی خشک سالی اور مسلسل قحط نے وطن چھوڑنے پر مجبور کیا۔ اور وہ اپنے لشکر کو لے کر ایران کی جانب بڑھا اور کوہ البرز کی وادی کو مسکن بنایا (25) ان کی جفا کشی اور تاخت وتاراج نے اُس عہد کے حکمران نوشیروان کو مشتعل کر دیا۔ اور وہ ایک لشکر جرار کے ساتھ ان کی آبادیوں پر ٹوٹ پڑا۔ نتیجے کے طور پر یہ لوگ وہاں سے نکل کر بلوچستان کی حدود میں آ پناہ گزین ہوئے۔ (26) حلب کی باقی ماندہ بلوچوں کو امام حسین اور یزید کے معرکے میں اہل بیت کا بے جگری سے ساتھ دینے کی

پاداش میں اموی سپاہ کے غیض وغضب کا نشانہ بننا پڑا اور حلب سے نکل کر بلوچوں کا یہ آخری طائفہ خلیج فارس، سعودی عربیہ اور لبنان کے عرب علاقوں میں پھیل گیا (27) کوہ البرز کا بلوچ طائفہ اپنے سردار میر ابراہیم کی قیادت میں سیستان، طوران میں داخل ہوا (28) قلات میں جب یہ لوگ پہنچے تو ان کا بزرگ میر قمبر خان تھا (29) لیکن میر ابرہیم کے نام کی نسبت سے یہ لوگ براہیمی کہلائے جو دراوڑ زبان سے اختلاط کے بعد بگڑتے بگڑتے براہوئی یا بروہی بن گئے۔(۱)

....

''مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ''صفحات 7-8،صفحات XIV-XIII۔نیز دیکھیں حاشیہ نمبر 30۔

حواشی:

1۔ مختلف تاریخی اور مذہبی تصنیفات کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بیلوص جسے مختلف ادوار میں بعلوث اور بالوس، بعلیص، بالیس و بالش اور والس بھی لکھا گیا ہے، کوچ جسے توچ، قوج اور کوش بھی لکھا گیا ہے، اور نمرود نام کی دو دو تین تین شخصیتیں گذری ہیں اور مذکورہ تینوں نام ایک ہی سامی خاندان کے سلسلہ نسب وخون سے ہوئے ہیں۔ ایک بیلوص بن الکاؤس ہے جسے مذکورہ سلسلہ نسب کا جدّ امجد مانا جاتا ہے اور جس کا زمانہ شاہی 5800 ق م بتایا گیا ہے۔ دوسرا بیلوص بن کوچ ہے۔ ایک اور بیلوص، بادشاہ اور بادشاہ زادی سیمی رامیس کا بیٹا تھا جو سیمی رامیس کے بعد شہنشاہ بنا تھا جسے بعضوں نے بیلوص دوئم لکھا ہے جس کی نسل ''کوچ بلوچ'' ہیں جس کا ایک بھائی مرد نامی تھا جو کرد بلوچوں کا جدّ امجد گذرا ہے۔ بعینہہ ایک سے زیادہ نمرودوں کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ ایک نمرود حضرت ابراہیمؑ سے پہلے گزرا ہے۔ اغلب خیال ہے جسے شیخ اکرم کردستانی نے نمرود بیلوص لکھا ہے وہ شاید نمرود بن بیلوص ہے۔ پھر اسی بیلوص سلسلے کا ایک اور نمرود بن کوچ بھی گزرا ہے۔ جو نمرود بادشاہ حضرت ابراہیمؑ کا ہمعصر تھا، وہ کالدیا کے جنوب مشرقی سرحدی خطے کے ''ملک بلوچ'' کے ایک گاؤں کے باسی تھے جس کا مرکزی مقام موجودہ گوادر کی دشت کا ہور تھا۔ جہاں اس کا خاندانی اور قومی قلعہ تھا۔ جس کے ایک حصّے میں حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کی سزا دینے کے لئے کئی دنوں تک آگ جلائی گئی تھی۔ موجودہ وقت میں مذکورہ آثار قدیمہ بالترتیب نمرود قلات یعنی نمرود کا قلعہ اور سنگئیں ڈور

(سوختہ ندی) کے ناموں سے مشہور ہیں دیکھئے موضوع ''بلوچستان کے بلوچ'' کا اشاریہ نمبر 2۔

2۔ یعنی نمرود بیلوص۔

3۔ یہ درحقیقت نمرود بن بیلوص بن کوچ ہے۔

4۔ یاد رہے کہ قبل مسیح سے لے کر دسیوں صدی عیسوی تک مکران کے علاقہ دشت میں ''ہور'' کی مرکزیت کے قرب وجوار کے علاقے ''مُلک بلوچ'' کہلاتا رہا ہے۔ جس کا تذکرہ بیشتر عرب وقائع نگاروں اور جغرافیہ نویسوں نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ ''ہور'' کی مرکزیت وہی جگہ ہے جہاں پر ''نمرود کا قلعہ'' اور وہ سوختہ مقام واقع ہیں جہاں پر حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کیلیئے کئی دنوں تک آگ جلائی گئی تھی۔ موجودہ وقت میں یہ تاریخی آثار قدیمہ ''سنگگیں ڈور'' اور سوتکال ءِ کلات کے نام سے مشہور ہیں۔

5۔ ''بلوچ نسل اور بلوچستان کی تاریخ'' بحوالہ کتاب ''چاکر اعظم'' مترجم عبدالغفار ندیم صفحہ 16۔ مصنف کا یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ بلوچ ''نام بیلوص دیوتا اور بیلوص مندر کی نسبت سے مشہور ہوا بلکہ شہنشاہ بیلوص ہی کو دیوتا مانا گیا تھا اور اسی کے بُت بنا کر مندروں میں رکھے گئے تھے۔ اور اسی کی پُوجا کرتے تھے۔ اسی بیلوص کی نسبت سے بلوچ قوم کی شہرت ہوئی ہے۔ یاد رہے کہ 1926ء اور 1928ء میں سر۔ آر۔ ایل۔ اسٹائین نے سنگگیں ڈور (نمرود کلات) میں باقیاتی تفتیش کا کام کیا تھا تو سائٹ کے ایک ریرین حصے

سے مندر کے آثار بھی ملے تھے۔ ممکن ہے کہ یہ مندر بیلوص ہی ہو۔

6۔ مصنف کا پوری نسل کی ہجرت ومسافرت کی کہانی محض ایک مفروضہ ہے۔ قبل مسیح کے جن ادوار میں وہ اس قوم کی حرکت پذیری کی بات کرتے ہیں تاریخی حوالے اس خیال سے متصادم ہیں۔ ابوالقاسم فردوسی نے اپنے منظوم رزمیہ شاہنامہ میں بلوچوں کا تذکرہ کیا ہے جو مکران میں زندگی کرتے تھے اور ایرانی بادشاہ کیکاؤس کی لشکریوں میں اپنے کماندار سیاوش کی سرکردگی میں شامل تھے اور افراسیاب شاہ تُرکستان کی افواج کے خلاف لڑائیوں میں پیش پیش تھے۔ واضح ہو کہ کیکاؤس کی حکمرانی کا زمانہ 558ء سے لے کر 530 ق م تک تھا۔ اور افراسیاب کا زمانہ اقتدار 585ء سے لے کر 550 ق م تک تھا۔ اس زمانے سے لے کر ایک ہزار سال بعد مکران ہی میں بلوچوں کا تذکرہ ساسانی بادشاہ انوشیروان خسرو اول کے زمانہ اقتدار میں ملتا ہے جب انوشیروان کی افواج نے ایک ایرانی دہقان کی فریاد پر بلوچوں پر فوج کشی کی۔ اس طرح مکران ازمنۂ قبل مسیح سے لے کر زمانہ حال تک مکران ہی کی سرزمین پر بلوچ کی من حیث القوم موجودگی ثابت ہے۔ چند ایک گروہوں کی بسلسلہ معاش حرکت پذیری کو پوری قوم کی حرکت پذیری نہیں کہا جا سکتا ہے۔ یہ بات بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ موجودہ زمانے کی نسبت قدیم ایام میں بلوچ ایک بہت بڑی قوم ہوا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ چھٹی صدی عیسوی تک سات سو سال سے کندھار کی مرکزیت میں ان کے نام سے ''بیلوص'' مُلک قائم تھا۔ جس کے حدود:

''شمال مشرق میں ریاست قنوج سے ملتی

تھیں۔ مغرب میں مکران یا کیچ مکران، کردان
(کزدار) کیکان یا کیکانان کا وسیع خطہ اس
میں شامل تھا۔ شمال مغرب میں اس وسیع
مملکت کی سرحدیں سجستان کی حدتک اس وسیع
علاقے کی حدود کو چھوتی ہوئی کوہ سیاہ یا مہتر
سلیمان کے دامن کے ساتھ پھیلی ہوئی تھیں جو
''بیلوص'' کے نام سے موسوم تھا'' (تاریخ
بلوچستان از ملک محمد سعید دہوار صفحہ 250)

جس پر 644ء میں عربوں کا تسلط ہوگیا۔ اور اس بلوچ وطن کا نام ''بیلوص'' سے تبدیل ہوکر الرخج ہو رہا تھا۔ 977ء میں سبکتگین نے اس پر قبضہ کرلیا۔ اس زمانہ تک اس خطے کیلئے الرخج اور بیلوس دونوں نام استعمال ہورہے تھے۔ چونکہ محولہ بالا مصنف کے ذہن میں رند قبائل کیلئے ''بلوچ'' نام مختص ہے اس لئے وہ پوری بلوچ قوم کی مسلسل مسافرت کی بات کرتے ہیں۔ جبکہ تیرھویں صدی عسیوی کی شروعات تک ''رند قبائل'' کا عظیم بلوچ وطن ''مکران'' میں اجتماعی حیثیت سے وجود نہیں تھا۔ اور مکران ہزاروں سالوں سے غیر رند بلوچ قبائل کا وطن تھا۔ ہیروڈوٹس (وفات 425 ق م) نے 485 ق م میں شاہ ایران زرکس کی چھپن اقوام پر مشتمل افواج میں گدرشیا (مکران) کے گندمی رنگ کے بلوچ فوج کا ذکر کیا ہے جو چیتے کی کھالوں میں ملبوس، ڈورسکس کے میدان

میں یورپ کے خلاف لڑنے کیلئے موجود تھے۔ یعنی 485 ق م میں بلوچ من حیث القوم
مکران میں موجود تھا۔ ظاہر ہے وہ رند وغیرہ تو نہیں تھے۔ اور نہ کہ مہاجر اور مسافر تھے۔

7۔ ''چاکر اعظم'' صفحہ 24۔ ہُن کے بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ غالباً تاتاری یا منگول
خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کے جسم بھاری اور گمبیر ہوتے تھے۔ ان کے پیرزین
پر مسلسل سواری کی وجہ سے مُڑے ہوئے ہوتے تھے۔ ناکیں چپٹی تھیں اور آنکھیں
سوروں کی مانند تیز اور چمکتی ہوئی ہوتی تھیں۔ (حاشیہ صفحہ 24)

8۔ بعض ایرانی و عرب مصنفین نے ''کوچ و بلوچ'' کو فارسی ترکیب کے پیش نظر دو قبیلے
''کوچ اور بلوچ'' سمجھا اور لکھا ہے جو کہ ان کی غلط فہمی ہے۔ انہیں یہ غلط فہمی ''وَ'' کو اور
کے معنی پہنانے کے باعث ہوئی ہے۔ جیسے کہ فارسی میں اس کے معنی بنتے ہیں لیکن
حقیقت میں اس کا استعمال فارسی میں نہیں بلوچی زبان میں ہوا ہے۔ بلوچی میں ''وَ'' فارسی
کے (ِ) کے طور پر استعمال ہوتا ہے جو ''کا'' کے معنی دیتا ہے۔ ''کوچ و بلوچ'' کے بلوچی
میں معنی ''بلوچ (قوم) کا کوچ (طائفہ)'' کے بنتے ہیں۔ نہ کہ کوچ اور بلوچ کے جیسے
مصنفین نے اپنے طور پر اس کے معنی اخذ کئے ہیں۔ اگر اسے فارسی میں لکھا جائے تو یہ
''کوچِ بلوچ'' لکھا جائیگا۔ صدیوں قبل کی طرح آج بھی بلوچی میں ''وَ'' کا استعمال اسی
طرح موجود ہے۔ مثلاً فارسی کے ''خرِ زر''، خوابِ خرگوش''، شاہِ قلندر، ''چشمِ ظاہر''، شاہِ
جہان، ''صدقِ دل'' وغیرہ کے الفاظ بلوچی میں ''حر و زر''، واب و کرگوشک'''' شاہ و قلندر''
، ''چشم و ظاہر''، ''شاہ و جہاں'' اور ''ستک و دل'' ادا کئے جاتے ہیں۔ یہ ترکیب قدیم

بلوچی شاعری میں بھی بیسویں مقامات پر دیکھی جاسکتی ہیں۔ ''کوچ و بلوچ'' کی ادائیگی بھی بلوچی ہی میں رہی ہے جس سے مراد ''کوچ بلوچ'' ہیں نہ کہ کوچ اور بلوچ۔ اس کی تصدیق ''تاریخ سیستان'' (بہ تصحیح ملک الشعراء بہار) سے بھی ہوتی ہے جس میں مذکور ہے:

> ''کوچ ایک گروہ تھا جو کرمان و مکران وبلوچستان کے حدود میں سکونت رکھتا تھا اور غالباً یہ بلوچ کے مترادف تھا۔ یہ طائفہ قدیم ایام سے راہزنی اور سرکشی میں شہرت رکھتا تھا اور بڑے بڑے بادشاہان وقت اس سے نبردآزما رہے ہیں۔ یہ طائفہ محمود غزنوی کی حکومت کے بعد رُو بہ زوال ہوا اور بتدریج کوچ کا نام درمیان سے گم ہوا اور فقط بلوچ کا نام باقی رہ گیا۔''

9۔ ''چاکر اعظم'' صفحہ 26۔

10۔ بعض مصنفین نے، جن میں عرب وقائع نگار بھی شامل ہیں، کوچ قبیلہ کو ''قفص'' سے غلط ملط کیا ہے۔ اور انہیں ایک ہی قبیلہ بتایا ہے جو تاریخی طور پر غلط ہے۔ لفظ ''قفص'' دراصل قدیم بلوچ قبیلہ ''کوپچ'' کا معرب معلوم ہوتا ہے جو کوچ قبیلہ سے الگ

رہا ہے اور یہ دونوں قبیلہ ہزاروں سالوں سے تا حال موجود ہیں اگر چہ پہلی والی طاقت اور عددی اکثریت کھو بیٹھے ہیں۔ کچھی اور سندھ کا کوپچانی بلوچ قبیلہ اِسی ''کوپچ'' کی وسیع تر شکل ہے۔ جب سکندر مقدونی بلوچستان کے ساحل سے گذرا تھا تو موجودہ گوادر کے پیشکان میں یہ قبیلہ آباد تھا اس کا نام بھی قبیلے ہی کے نام پر تھا۔ جسکی اریئن اور دوسرے سکندر نامہ نویسوں کی تصنیفات میں نشاندہی کی گئی ہے۔ یوروپی محقق ہولڈچ اور میجر ای موکلر نے بھی اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔ (ملاخطہ کریں بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹرز: مکران گزیٹر، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1977ء صفحہ 681)

اریئسن کا لکھا ہوا نام بھی ''کوفص'' ہے جسے انگریزی میں KOPHAS لکھا گیا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ قدیم نام کوفص ہی ہو جسے بعد کے بلوچوں نے ''کوپچ'' تلفظ کیا ہوا ہو۔ بہرحال عرب وقائع نگاروں نے اس کی زیادہ جستجو نہیں کی ہے اور اِسے غلط طور پر ''کوچ'' سے گڈمڈ کردیا ہے۔

11۔ عبیدالدولہ کا زمانہ 338ھ تا 372ھ (969ء تا 983ء) ہے۔

12۔ صحرائے لُوط، جو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی آبادکاری کا تاریخی نشان ہے ایک وسیع وعریض دشت کی صورت میں پھیلا ہوا ہے جس کا ایک حصہ بلوچستان کے ضلع خاران میں پھیلا ہوا ہے۔ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ مقدسی اس صحرا کے سفر کے دوران اس حصے تک آیا تھا یا نہیں۔

13۔ ''ایک مشہور ومعروف عالم فرلانگ (FORLANG) کا کہنا ہے کہ کوش

(کوچ) کے لڑکے (نمرود کے آباواجداد) صوص اور بلوص کے القاب سے شام اور فونیشیا آئے تھے اور وہاں انہوں نے کئی شہر بسائے۔ شاید انہی کا صوص اور بلوص کو دسویں صدی کے مورخین نے قفس وبلوص اور فردوسی نے اپنے شاہنامے میں ان کو کوچ و بلوچ کا نام دیا ہے" (چاکر اعظم، حاشیہ صفحہ 31)

"بلوچ" نام کے بارے میں فرلانگ کا کہنا صحیح نہیں ہے۔ "بلوچ" نام نمرود کے زمانے ہی سے "بلوچ" رہا ہے۔ اسے عربوں اور دیگر سامیوں نے "بلوص" کہا ہے کیوں کہ عربی میں چ نہیں ہے اور اُس کی جگہ پر وہ "ص" اور "ش" استعمال کرتے ہیں نیز نام صوص (سُوس) کو کوچ سمجھنا بھی غلط ہے۔ سوس گر د بلوچ قبیلہ رہا ہے اور روایتاً اس کا جدّ امجد سُوس بن کرد بن مرد بلوچ رہا ہے جو ملان کرد کا بھائی رہا ہے۔ ان کے نام کے تمام قبائل کا ابتدائی وطن موجودہ مشرقی مکران (علاقہ کیچ و گوادر) رہا۔ ہے۔ قبیلہ سُوس، کیچ میں آباد رہا ہے۔ تُربت (تُر بہ) شہر کے مشرق میں "شوش ءِ ڈنّ" (سوس کا میدان) اس قبیلہ کا قدیم ترین جائے رہائش رہا ہے۔ بعد میں یہ قبیلہ بہت ہی نامدار ہوا اور پھلا اور پھیلا حتیٰ کہ کئی مغربی عرب خطوں میں اس کے نام کے گاؤں بسے اور ایک زمانے میں انہوں نے علاقہ سیستان کو بھی اپنا نام دیا۔ جسے یورپیوں نے غلط فہمی میں ساکاؤں سے جوڑا۔ جبکہ ساکا سے ساکاستان اور ساکستان تو بن سکتا ہے لیکن سیستان یا سوستان کی صورت میں نہیں بن سکتا۔ سُوس کا لفظ تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف لہجوں میں استعمال کیا گیا ہے جو مصنفین کی عربی اور فارسی تواریخوں میں نظر آتا ہیں۔ ان میں "سوس"

بیس، شیث، شیش، شوش، شیث وغیرہ شامل ہیں۔ نیز فرلانگ جسے ''صوص اور بلوص'' لکھتا ہے وہ عربی میں ''صوص وبلوص'' ہے جیسے کہ ''کوچ وبلوچ''۔ دونوں کا استعمال عربی وفارسی میں نہیں ہوا ہے بلکہ بلوچی میں ہوا ہے۔ یعنی صوص بلوچ'' اورکوچ بلوچ'' نہ کہ صوص اور بلوص'' اورکوچ اور بلوچ''۔

نیز فرلانگ کی تحقیق نے ہمارے اس موقف کو صحیح ثابت کیا ہے کہ بلوچ زمانہ قدیم سے اسی بلوچستان میں موجود رہا ہے اور یہیں سے اُس کے بعض گروہ یا قبیلے سوس اور بلوص کے نام سے شام اور فونیشیا گئے تھے۔ علاوہ ازیں گوادری دشت کے سُنٹ سر کے مقام پر ''نمرود بیلوص'' کے قلعہ کی موجودگی اور اُس سوختہ قطعے کی موجودگی جہاں پر حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کیلئے گئی دنوں تک آگ جلائی گئی تھی، ہزاروں سالوں سے اس خطے کو بلوچ وطن ثابت کرتے ہیں۔

14۔ مقدسی کا مذکورہ بیان ازخود ظاہر کر رہا ہے کہ یہ اُن کی اپنی داستان طرازی ہے۔ مقدسی کے علاوہ دیگر کسی سیاح، جغرافیہ نویس اور وقائع نگار نے اس طرح کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔ خونی دشمنیوں میں ممکن ہے کہ ایسا کوئی اِکا دُکا واقعہ گزرا ہو لیکن عام لوٹ مار یا ڈاکہ زنیوں میں ایسا ہونا ناممکن ہے۔ اگر مقدسی کے زمانے کے بلوچ اِس حد تک غارتگر ہوتے تو مقدّسی خود کیوں کر اُن کے ہاتھ سے بچ نکلا۔ جبکہ ایسے دور دراز سفر میں نکلنے کیلئے اُس کی بھی جھولیاں خالی نہیں ہوں گی۔ اس کے باوجود وہ صحیح سلامت سفر پورا کر کے اپنے منزل پر پہنچا۔ جو خود اُس کے مذکور بیان کی تردید ہے۔

15۔ملاحظہ کیجئے اشاریہ نمبر 1۔

16۔ملاحظہ کیجئے موضوع ''بلوچستان کے بلوچ'' کے حواشی میں حاشیہ نمبر 3 اور موضوع ''سندھ کے بلوچ'' کے حواشی میں حاشیہ نمبر 11۔

17۔ ''تواریخ بلوچ.......... بلوچ قوم کا حسب ونسب'' صفحات نمبر 11-12۔ یہ حقیقت نہیں ہے کہ بلوچوں کا نسلی اور ابتدائی وطن عراق تھا۔کسی خطّے پر اپنے بازوؤں کی طاقت کے بل بوتے پر غالب آ کر حکومت کرنا یہ ثابت نہیں کرسکتا کہ حکمران اسی سرزمین کے باسی رہے ہیں۔پورے ہندوستان پر ترکوں نے صدیوں تک حکمرانی کی لیکن وہ ہندو یعنی ہندوالے نہیں تھے۔ایران وغیرہ پر رومیوں،عربوں اور باہر والوں نے حکمرانی کی جبکہ ان کا تعلق اُس خاک سے نہیں تھا۔یورپ والوں نے آدھی دنیا پر حکمرانی کی جو متعلقہ ممالک سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔بلوچ بادشاہوں نے عراق پر حکمرانی ضرور کی تھی اور صدیوں تک کی تھی لیکن بلوچ قوم بحیثیت قوم وہاں موجود نہیں تھی بلکہ ان کا اصلی اور ابتدائی وطن موجودہ مکران ہی تھا۔صدیوں سے ان کے قبائلی اور قومی آثار مکران ہی کی سرزمین سے ملتے رہے ہیں عراق سے نہیں۔نمرود کی شاہی اور نام کی مہریں اگرچہ عراق سے برآمد ہوئی ہیں لیکن اُس کے نام کا قلعہ اور مندر (مندر بلوص) کے آثار گوادری دشت کے مقام ہور (سُنٹ سر) میں وجود رکھتا ہے۔جو عربی نقشوں اور تحریروں میں بیان کردہ قدیم ''ملک بلوچ'' کا مرکزی مقام اور کالدیا کا مشرقی خطّہ ہوتا تھا۔لہذا مصنّف کے کہنے کے برعکس بلوچ حکمران اپنا اقتدار کھونے کے بعد عراق نہیں بلکہ مکران ہی چلے

آئے تھے جہاں سے وہ اپنی طاقت کے عروج کے ایام میں پورے کالدیا پر حکمرانی قائم کر چکے تھے۔ اور بابل کی پہلی شہنشاہیت قائم کر گئے تھے۔

جو اہل قلم بلوچوں کو اپنے موجودہ وطن میں باہر سے آنے والے اور عراق کو ان کا اصلی وطن قرار دیتے ہیں وہ صریحاً غلطی پر ہیں اور ان کا مذکورہ نظریہ یقیناً کسی تحقیق و عرق ریزی کا نتیجہ نہیں ہے۔ وہ قیاس پر بات کرتے ہیں اور مفروضے گڑھتے ہیں۔ تحقیقی آثار بتاتے ہیں کہ بلوچ کے سامی اجداد سے کوئی گروہ اپنے وطن عراق سے نقل مکانی کر کے موجودہ بلوچستان کے مکران میں آباد ہوا تھا اور اس زمانہ میں ابھی تک ''بلوچ'' کی تشکیل نہیں ہو چکی تھی۔ اُس آبادکاری کے صدیوں بعد بلوچ قوم منظر عام پر آ گئی تھی اور تب سے مکران ہی کی سرزمین پر آباد چلی آ رہی ہے۔

18۔ دی ایتھنوگرافی اینڈ ہسٹاریکل سکیچ آف بلوچ ریس از ایم۔ لانگ ورتھ ڈیمز 1904ء، صفحات نمبر 22-21۔ نیز دیکھئے موضوع ''بلوچستان کے بلوچ'' کا حاشیہ نمبر 3۔

19۔ ''اوریجن آف بلوچیز'' مطبوعہ جنرل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال 1895ء بحوالہ ایم۔ لانگ ورتھ ڈیمز لندن 1904۔ جہاں تک رندوں کا علاقائی عرب ہونے کا تعلق ہے یہ بھی ایک مفروضہ اور قیاس ہے۔ اس قیاس کرنے میں زیادہ تر کردار رندوں کی شاعری کا وہ حصہ ہے جس میں وہ اپنے کو کسی ''میر حمزہ'' کی اولاد بتاتے ہیں۔ جسے وہ خود نہیں جانتے کہ وہ کونسا حمزہ تھا۔ مذکورہ اشعار جو کہ ظاہر ہے کہ ایک شاعر کا کہا ہوا ہے، کا

ترجمہ ''میر حمزہ'' کی جگہ پر ''امیر حمزہ'' کیا گیا ہے جو کہ نبی صلعم کے عم کی طرف اشارہ دیتا ہے۔ اِسے بنیاد بنا کر رندوں کو عرب لکھا گیا۔ اور اسی شاعری میں مذکورہ ''حلب'' کو شام کا حلب سمجھ کر انہیں علافی لکھا گیا کیوں کہ بیشتر علافیوں کا تعلق حلب ہی سے رہا ہے۔ لیکن شاعری میں مذکورہ ''حلب'' شام کا حلب نہیں ہے بلکہ ایرانی سرحد کے قریب ترکی موضع ''حلب'' ہے۔ جہاں کچھ عرصہ قیام کرنے کے بعد رند جھتے وقفے وقفوں سے مکران میں داخل ہوتے گئے۔ یہ مغربی مکران ہے جو اب ایران کے زیر انتظام ہے۔ مذکورہ رند قبائل تُرک قبیلے تھے اور ترکی کے ایک بادشاہ اعلمش رومی کی نسل سے تھے۔

اُن کی شاعری سے یہ بات اخذ کی جا سکتی ہے کہ یزید کی خلافت کے زمانے میں واقعہ کربلا کے دوران وہ تُرکی سے نکال دیئے گئے تھے جو بدامنی کی لپیٹ میں تھا۔ اور ایران خطے میں امن تھا اور ترکی سے قریب تر تھا۔ مذکورہ قبائل ساتویں صدی کے اختتام (680ء۔690ء) کے دوران ایرانی سرحد کے قریبی علاقے حلب میں ورود کر گئے تھے۔ جہاں سے وہ آہستہ آہستہ مغربی مکران میں پھیلتے اور آباد ہوتے گئے۔ اور پانچ سو سالوں کے دوران بلوچوں میں مدغم ہوئے۔

نویں اور دسویں صدی عیسوی کے دوران مکران کا پورا علاقہ ہباری حکمرانوں کے ماتحت سندھ کا حصّہ تھا جن کا دارالحکومت منصورہ تھا۔ اور مکران میں ان کی طرف سے رئیس شخصیتیں حکمران تھیں۔ جو نہایت ہی عادل اور مصنف المزاج ہوتے تھے۔ 910ء میں سندھ کی وسیع سلطنت پر ہباری خاندان کا ابومنذر عمر بن عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز

حکمران تھا۔ جن کی طرف سے مکران کا والی رئیس قبیلہ کی تاریخی نامور شخصیت میر حمزہ رئیس تھا۔۔ جس کے باپ کا نام میر زَبادرئیس (خالص بلوچی نام جو ایک خوشبودار بوٹی کا نام ہے) (۱) تھا۔ اِس دوران مشہور عربی تصنیف ''مروج الذھب'' کے مصنف ابوالحسن علی بن حسین المسعودی (سال وفات 951ء نے منصورہ کے دربار کا دورہ کیا تھا جس نے لکھا ہے۔

''میں 300ھ (912ء) کے کچھ بعد ملتان کے علاقہ میں آیا۔ اس وقت ملتان میں ابوالدِ الہاث منبہ بن اسد قرشی کی حکومت تھی۔ اسی زمانہ میں، میں نے منصورہ کا دورہ کیا، وہاں ابومنذر عمر بن عبداللہ بن عمر بن عبدالعزیز ہبار بن اسود حکمران تھا۔ منصورہ کے وزیر زیاد، اس کے دولڑکوں محمد اور علی، نیز حمزہ نامی معزز اور بااقتدار رئیس کو بھی دیکھا۔'' (۲)

چونکہ اُس دور میں میر حمزہ مکران کا حاکم اور ایک قدآور تاریخی شخصیت تھا۔ اس کی شہرت بعد میں صدیوں تک اذہان میں محفوظ تھی۔ اسی لئے رند شاعر نے اس نامور شخصیت کو اپنا جدّ امجد بیان کیا۔ مترجمین نے عقیدت کی بنا پر اس حمزہ رئیس کو حضرت محمد صلعم کا عم حضرت امیر احمزہ پر محمول کیا جو رند قبائل کے کسی شجرہ نسب میں مذکور نہیں ہے۔ مزید ملاخطہ کریں موضوع ''بلوچستان کے بلوچ'' کا حاشیہ نمبر A-6 اور 47، اور موضوع ''بلوچ سندھ گزیٹر میں'' کا حاشیہ نمبر 1۔

۱۔ سرباز اور نسکند (ایرانی بلوچستان) کے بزرگزادہ اور دیگر کئی رئیسوں نے یہی نام بتایا۔

۲۔ بحوالہ ''برصغیر اور عرب مؤرخین'' از خورشید احمد فاروق، صفحہ 158-159۔

20۔ میر گل خان نصیر کے کہنے کے برعکس ''بلوچ'' بگڑا ہوا نام نہیں ہے۔ بلکہ اصل اور قدیمی نام ''بلوچ'' ہی ہے۔ جس نام کو اُس کے بولنے اور رواج دینے والے صدیوں سے استعمال کر کے آ رہے ہوں۔ وہ کبھی بھی بگڑا ہوا نام نہیں ہوتا۔ نام کا تلفظ اگر تھوڑا بہت بگڑتا ہے تو عام طور پر غیروں کے ہاتھوں بگڑتا ہے۔ نام کے وارثوں کے ہاتھ کبھی بھی نہیں بگڑتا۔ ''بلوچ'' پہلا اور ابتدائی نام ہے جسے عربوں اور اقوام نے اپنی اپنی تحریروں میں اپنے لہجوں اور املا کی مناسبت سے استعمال کیا ہے۔ ہیروڈوٹس نے یونان کی ریکارڈ سے گدروشیا (مکران) کے جن گندمی رنگ والے بلوچوں کا تذکرہ حاصل کیا تھا اُس میں بھی لفظ ''بلوچ'' استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح شاہنامہ فردوسی میں بھی لفظ ''بلوچ'' ہی استعمال ہوا ہے۔ لہذا اسے بگڑا ہوا نام سمجھنا صحیح نہیں ہے۔

21۔ بلوچ قوم کی من حیث القوم، دجلہ وفرات کی سرزمین پر موجودگی کا ذکر کسی تاریخ میں نہیں ہے۔ اگرچہ بلوچ بادشاہ کالدیا پر برسر اقتدار رہے ہیں۔ پہلے بلوچ شہنشاہ کے زمانے سے بلوچ قوم مکران کی سرزمین پر بھی آباد تھی۔ جو کالدیا کی وسیع سلطنت کا مشرقی حصہ تھا۔ بلوچ حکمران اپنے اِسی وسیع مملکت پر حکمران اور بے انتہا قوت وحشمت کے مالک رہے ہیں۔ اور یہیں سے چل کر بابل وغیرہ کی بادشاہی اپنے ہاتھ میں لی ہے۔ پورے کالدیا سلطنت میں صرف انہین کی دھاک بیٹھی ہوئی تھی۔ تاریخی مطالعہ سے یہی قیاس کیا جاسکتا ہے کہ بلوص کی قومی تشکیل سے کافی پہلے ان کے سامی اجداد نے مکران میں بودوباش اختیار کی تھی۔ کیوں کہ بلوص کے جدی قبیلہ کوش / کوچ کے ابتدائی قلعوں

کے خرابے مکران ہی کی سرزمین پر پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کا اوّلین مرکزی شہر اور دارالحکومت ''کیچ'' آج بھی انہی کا نام لئے ہوئے ہے۔ اس کے علاوہ بلوچ کا قدیم ترین وطن ''ملک بلوچ'' کا تذکرہ جو عرب جغرافیہ نویسوں نے کیا ہے وہ بھی مکران ہی کی سرزمین پر وجود رکھتا تھا۔ لہذا امیر گل خان نصیر کا بلوچ قومی ہجرت اور اس کے ادوار کا ذکر ان کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ اسی طرح تاریخی کتابیں یہ ثبوت پیش نہیں کر سکتیں کہ ہندوستان کے سفر میں سمّی رامیس کے ساتھ بلوچ طائفے یا قبائل بھی تھے۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی مضبوط فوجی دستہ بلوچوں کا اس کے لشکریوں میں ہوتا ہو لیکن ایسا بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا ہے۔

22۔ مذکورہ بیان جسے مصنف تیسری اور آخری ہجرت کے واقعہ کے طور پر بیان کر رہا ہے دراصل رند قبائل کی شاعری سے اخذ شدہ ہے۔ یہ وہی تاریخی نظم ہے جس میں رند شاعر کہتا ہے کہ ''ہم'' میر حمزہ کی اولاد ہیں ادر چوالیس قبیلوں پر مشتمل ہیں۔ حلب سے اٹھ کر آرہے ہیں اور کربلا اور بمپور کے درمیان سیستان میں آباد ہوئے اور سردار ہمارا جلال خان ہے۔

میر گل خان نصیر نے مذکورہ بیان کی روشنی میں رندوں کی سیستانی بلوچستان میں ورود کو بلوچی ہجرت کا تیسرا دور بیان کیا ہے جو رندوں کی نسلی تاریخ سے ان کی ناواقفیت کی دلیل ہے۔ رند قبائل نسلاً ترکی کے اناطولیہ کے تُرک تھے۔ جو بقول ان کی شاعری کے یزید سے اختلافات ولڑائی کے نتیجے میں اپنے مرز بوم سے ہجرت کر کے ایرانی سرحد کے قریب واقع ''حلب'' علاقے میں آبسے تھے اور پھر کافی عرصہ بعد اسی حلب سے ایرانی

مکران میں وارد ہوتے گئے جو خالص بلوچی علاقہ تھا۔ اس علاقے میں وہ تقریباً پانچ سوسال رہے اور بلوچ میں مدغم ہوئے۔ اسی عرصہ میں ان کی تُرکی لہجے نے سامی لہجے کو مغلوب کیا جسے آج مکران کے دانشور اور لکھاری بلوچی املا کے لئے منتخب کر رہے ہیں۔

رند قبائل اپنے شجرہ نسب میں اپنا جدامجد اغلمش رومی کو دکھاتے اور بتاتے ہیں۔ جو ایک نامی گرامی تُرک بادشاہ ہو گذرا ہے۔ رومی وہ اس لئے کہلاتا ہے کہ وہ اناطولیہ کے ''روم'' نامی موضع یا شہر کا باسی تھا۔ جہاں پر اُس کے نام کا قلعہ ''آعلمش دِژ'' شکستہ حالت میں تیمور لنگ کے اناطولیہ پر قبضہ کے وقت موجود تھا۔ رندوں کے تُرکی نام آج بلوچی نام کہے جاتے ہیں اگرچہ کئی ناموں کے معنی آج بھی نہ رندوں کو معلوم ہیں اور نہ دیگر بلوچوں کو۔

مذکورہ بالا بحث ثابت کرتا ہے کہ میر گل خان نصیر کا مبینہ تیسرے دور کا ہجرت بلوچ قومی ہجرت نہیں تھی۔ بلوچ صدیوں سے مکران کی سرزمین پر وجود رکھتے تھے اسی لئے رند قبائل ان میں گھل مل کر بلوچ بنے تھے۔

23۔ بلوچ عرب بادیہ نشین نہیں تھے۔ بلکہ عربوں کی ہم نسل سامی نسل سے تھے اور تاریخ کے پہلے شاہی نسل تھے۔ ان کی قومی تشکیل بحیثیت ''بلوچ قوم'' بھی عرب سرزمین پر نہیں ہوئی ہے بلکہ مکران کی سرزمین پر ہوئی ہے اور اسی سرزمین سے اُٹھ کر انہوں نے کالدیا پر حکمرانی کی ہے۔ انہی کی بدولت مکران کی وسیع وعریض سرزمین کالدیا سلطنت کا حصہ بنا ہے۔ خان صاحب نے بلوچوں اور عربوں میں چند قومی خصوصیات اور رسوم میں مماثلت

کواور وادی حلب میں موجود ایک قدیم گاؤں ''البلوص'' کو جواز بنا کر اپنی رائے قائم کی ہے۔لیکن یہ جواز بلوچ قوم کے عربی ہونے کے نظریہ کو ثابت نہیں کر سکتے۔اس سلسلے میں ملاحظہ کیجئے موضوع ''بلوچستان کے بلوچ'' کا حاشیہ نمبر 4اور حاشیہ نمبر 45۔

24۔خان صاحب اپنے مذکورہ دعوے کے حق میں کوئی ثبوت، تاریخی روایت اور کوئی تحریری حوالہ پیش نہیں کر سکتے ہیں۔محض خیال آرائی تاریخ نہیں بن سکتی۔

25۔بلوچ قبائل زمانہ قدیم سے خانہ جنگیوں میں مبتلا ہوتے آرہے ہیں۔لیکن تاریخ کی کتابیں ایسی کسی بڑی خانہ جنگی کا تذکرہ نہیں کرتیں جس کے نتیجے میں پوری قوم دو حصّوں میں بٹ کر دربہ دری کی حالت میں دو مختلف سمتوں میں ہجرت کر جائے۔ البرز (مازندران) کے آس پاس بلوچ چند قبائل پر مشتمل خانہ بدوش تھے جو اپنے ریوڑوں کے ساتھ مال چرائی کرتے تھے اور کئی زمانوں سے موجود تھے۔بلوچ صرف یہی نہیں تھے بلکہ البرز کی پہاڑیوں سے لے کر مکران کے دشت وساحل تک پھیلے ہوئے تھے اور صدیوں سے سکونت رکھتے تھے۔کسی اجتماعی ہجرت کے نتیجے میں آنے کی بات خان صاحب کی خام خیالی ہے۔انہوں نے یہ سب کچھ میر گل خان نصیر سے خوشہ چینی کی ہے۔ تاریخی کتابیں البرز کے گردونواح میں زیادہ تر کوچ بلوچوں کا تذکرہ کرتی ہیں جن سے ایرانی حکومتیں نبرد آزما رہتی رہی ہیں۔ گر دقبائلی گروہ بھی خان صاحب کے کہنے کے برخلاف حلب سے نہیں بلکہ اپنی سرزمین مکران ہی سے مختلف ادوار میں شمالی اطراف اور ترکی وعراق کی جانب جاتے رہے اور اپنی تو آبادیاں قائم کرتے رہے۔اس چیز کا ثبوت

کرد قبائل کے وہ تاریخی نام ہیں جو قدیم مواضعات کی صورت میں بلوچ سرزمین پر موجود ہیں۔ مثال کے طور پر چلتن کرد (کوہ چلتن کوئٹہ، چلتنانی کئور خاران)، سلیمان کرد (کوہ سلیمان)، رَہش کرد (رہشان / رخشان خاران، شم رخشان سراوان، الرخشان گھاٹی سراوان)، کاسا کرد، (کاسا پہاڑ، کاساندی چاغی، کاساندی رخشان) تُربہ کرد (تربت کیچ، تربت حیدری مغربی مکران)، سُوس / سیس گرد (سونش ءِ ڈنّ تربت کیچ، سیستان) ملان گرد (کوہ ملان گوادر ضلع، موضع مَلان ضلع اواران)، زامور کرد (زامران ضلع کیچ، موضع گرد بلیدہ ضلع کیچ)، گوران گرد (گوران قلات، گوراں علاقہ مری، گوران چاغی، گوران پنجگور، گوران مغربی مکران)، زیباری گرد (متعلق بہ زیبار سراوان)، کیچی گرد (متعلق بہ کیچ مکران)، آبسال گرد (آبسر موضع تُربت کیچ) قلعہ کرد (سب تحصیل چاغی) توکلی کرد (توکلی مستونگ، مغربی مکران)، ہنہ کرد (ہنہ گاؤں کوئٹہ)، یزیدی گرد (زیدی، خضدار)، مرد گرد (مردان ڈھورو تحصیل مولہ خضدار (۱))، دوگن گرد (دوگناں چاغی، دوگناں رخشان)، بوری کرد (تحصیل بوری لورلائی)، منوجان کرد (منوجان روڈ کوئٹہ)، زنگی کرد (قلعہ زنگیاں سوراپ پیشن مغربی مکران، زنگی لکّ ہور ماڑہ ضلع گوادر، زنگی لورہ کوئٹہ) باغگ کرد (باغک علاقہ چمن، باغک نوشکی)، رگردی کرد (گردی جنگل، گردی جنگل چاغی، گردی مرغہ چمن، سیگی رگردی کوئٹہ، رگردی تلاؤ کوئٹہ)، بیستان / بوستان گرد (بوستان چمن سائیڈ) وغیرہ۔

۱۔ مُرد بن بیلوص بن کوچ کو گرد قبائل کا جدِّ امجد بیان کیا گیا ہے۔

26۔خان صاحب نے میر گل خان نصیر کے فرضی خیالات و بیانات کو دُھرایا ہے۔انہوں نے خود تاریخی نگارشات اور عرب جغرافیہ نویسوں کی کتابوں کا مطالعہ نہیں کیا ہے اس لئے وہ بلوچوں کی بلوچستان میں پناہ لینے کی بے بنیاد کہانی سناتے ہیں۔نوشیروان کی حکمرانی سے صدیوں قبل بلوچ البرز اور کرمان کے کوہستانوں سے لے کر بحیرہ بلوچ کے ساحلوں تک بودوباش رکھتے تھے۔نوشیروان کے حملے زیادہ تر کوچ بلوچوں کے علاقوں میں ہوئے جس کا مرکزی مقام وادی کیچ تھا۔کیچ،قبائل کوچ کے نام پر ہے جو بلوچی زبان کا مغربی لہجہ ہے۔اسی مرکز کے گردونواح میں بلوچ صدیوں سے موجود تھے۔نوشیروان کے حملوں نے انہیں پہاڑی درّوں سے وقتی طور پر پسپا کرایا تھا جو پھر بہت جلد واپس آ کر اپنے مواضعات پر قابض ہو گئے تھے جس کا ثبوت تاریخ کی بیسویں تحریریں ہیں۔دور دراز سے ہجرت کر کے بلوچستان میں پناہ لینے کی بات خان صاحب اور دیگر قلم کاروں کا مفروضہ ہے۔

27۔خان صاحب کا یہ کہنا بھی کسی تاریخی تحقیق و جستجو کا نتیجہ نہیں ہے کہ بلوچ طائفے یا قبیلے تاریخ کے کسی بھی دور میں سعودی عرب اور لبنان کی طرف گئے ہیں۔دیگر مفروضوں کی طرح یہ بھی ان کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔جو قابل توجہ نہیں رہا ہے۔

28۔کوہستان البرز (علاقہ مازندران) سے کسی بھی زمانے میں کوئی بلوچ طائفہ نزدیکی بلوچ علاقوں کو چھوڑ کر طوران وغیرہ کے دور دراز علاقوں میں نہیں آیا۔تاریخ میں اِس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔خان صاحب نے مفروضہ سردار کا نام اپنے شجرہ نسب سے اخذ کیا

ہے۔ملاحظہ کیجئے حاشیہ نمبر 26۔

29۔ خان صاحب کے کہنے کے برعکس قلات میں ایران زمین سے کوئی گروہ وغیرہ ہجرت کر کے آیا نہیں ہے۔ جس قمبر خان کو وہ سیستان وغیرہ سے آیا ہوا لکھتے ہیں وہ خطّہ ہائے سرحد(کرمان کے مشرقی بلوچ علاقے)اور پنجگور کا حاکم تھا۔قبیلہ کا رئیس اور خان صاحب کے اجداد میں سے تھا۔ جس کے تذکرے سے نہ صرف بلوچی شاعری بھری پڑی ہے بلکہ انسائیکلوپیڈیاز میں بھی اس کا تذکرہ موجود ہے۔ قلات، پنجگور اور ایرانی بلوچستان میں اُس کے روایتی تذکرے زبان زدِعام ہیں۔ خوانین قلات کی ذاتی اور سرکاری لائبریریوں کی کتابوں اور مسّودات میں قمبر کے تذکرے موجود ہیں۔ خوانین کے ایک درباری مؤرخ قاضی نور محمد گنجابوی نے میر نصیر خان نوری کی جنگی فتوحات ومہمات پر منظوم کتابچہ تحریر کیا ہے جس کا نام ہے ''جنگ نامہ تحفتہ النصیر''۔اس میں وہ میر کبر کو جو فاتح قلات اور خانِ اوّل تھا، ہوت بلوچ لکھتے ہیں۔ واضح ہو کہ ''ہوت'' قبیلہ رئیس کا سردار گھرانہ رہا ہے۔ملاحظہ فرمائیں:

''چو چاکر جُدا شُد ز بخت سعید
درآمد بہ قلاتِ سیوا رسید
خوش درآں خاکِ پاک قلات
کہ انہار آں بُد چوآبِ حیات
زباغ و بُساتین و اشجار آں

چہ گویم کہ ناید صفت در بیان

ز رُفقا و اقربائیش یکے

کہ بوداس از ہمہ پہلواں ترلبے

بہ نامِ نیکو میر کمبر بنام

زاولاد ہوت آں یل پر کرام

مسلّم شدش حکمرانی قلات

ہے رفت برراہ دین باثبات

وغیرہ وغیرہ..........

کتنی بڑی ٹریجڈی ہے کہ بلوچوں کا خان اپنے اجداد کے ناموں، ان کے تاریخی کرداراور اپنی نسلی تاریخ سے بے خبر ہے۔ کہیں وہ اپنے کوسیتان سے آنے والے بے نام ونشان برزکوہی فرض کرتے ہیں۔ کہیں وہ اپنے قبیلہ احمد زئی کومیروانی قبیلہ کی شاخ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ اومان سے آیا ہوا عرب ہے جوکولواہ میں آباد ہوا (۱) اسی کتاب کے صفحہ نمبر 56 پر وہ میروانی کے جدّ میرو کو میر سعد کا بیٹا لکھتا ہے اور اُسے سیتان سے براستہ چاغی اور خاران آیا ہوا لکھا جس نے سوراب اور سیاہ کُمب میں قیام کیا۔ مندرجہ مفروضوں پر تبصرہ کرتے ہوئے سردار خان گشکوری نے اس بیان کو جھوٹ کہا اور وضاحت کی:

....

ا۔ ان سائیڈ بلوچستان صفحہ 262۔

''معلوم تاریخ سے پہلے احمد زئیوں کے جدّ
امجد رئیس کہلاتے تھے''(ا)۔

گشکوری صاحب کا کہنا بجا ہے۔ قبیلہ احمد زئی کا جدّ امجد براہو جد گال جنگ کا ایک ہیرو میر احمد ایلتازئی تھا۔ طائفہ ایلتازئی، بڑے قبیلہ رئیس کے طائفہ کمبرزئی کی ذیلی شاخ ہے۔ جو پنجگور کے تاریخی نڈر حاکم اور جنگجو میر کمبر کی نسل ہے۔ جس نے وقت کے حکمرانِ قلات کی مدد کرنے کی اپیل پر اپنے جنگجو لشکر کے ساتھ قلات پہنچ کر اس کے دشمنوں اور باغیوں کا قلع قمع کیا اور پھر اس بزدل حکمران کو اقتدار سے دستبردار کرا کر قلات وزہری پر اپنا اقتدارِ اعلیٰ قائم کیا۔ اس واقعہ کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں لکھا ہے کہ ''جب افغان ڈاکوؤں نے قلات کے ہندو حکمرانوں کو تنگ کرنا شروع کیا (ب) اور مذکورہ حاکم ان کے آئے دن کے حملوں سے تنگ آگئے تو انہوں نے میر کمبر اور اُس کے خانہ بدوش گڈریوں کو مدد کیلئے پکارا۔ کمبر نے راجہ کی مدد کی اور آخر کار راجہ کو ملک بدر کر دیا اور حکومت پر قبضہ کر لیا'' (ج) ''جس کے بعد ''قلات سیوا'' کا نام ''قلات بلوچ'' میں بدل گیا'' (د)۔

....

ا۔ بلوچ ریس اینڈ بلوچستان، صفحہ 77۔

ب۔ ہنری پونگر نے افغان ڈاکوؤں کے ساتھ ساتھ مزاری رند باغیوں کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ ملاحظہ کریں ان کی کتاب ''سفرنامہ سندھ و بلوچستان'' اور زیرِ مطالعہ موضوع ''خوانین قلات بلوچ'' اور متعلقہ حواشی۔

ج۔ جلد سوئم، نہم ایڈیشن۔

د۔ نیلسن انسائیکلوپیڈیا، جلد سوئم۔

خان صاحب کا نسب نامہ فاتح قلات وحاکم پنجگور وسرحد میر کمبر رئیس (خان اوّل) تک اِس طرح ہے:

''خان میر احمد یار خان احمد زئی ولد محمد اعظم
خان احمد زئی ولد خداداخان احمد زئی ولد
محراب خان احمد زئی ولد میر محمود خان احمد زئی
ولد میر نصیر خان احمد زئی ولد میر عبداللہ خان
احمد زئی ولد میر محراب خان احمد زئی ولد میر احمد
خان ایلتازئی (ا) ولد میر ایلتاز خان ایلتازئی
ولد میر کیچی خان ایلتازئی ولد میر ایلتاز خان
کمبرزئی (ب) ولد میر احمد خان کمبرزئی ولد
میر قیصر خان کمبرزئی ولد میر سوڈو خان کمبرزئی
ولد میر احمد خان کمبرزئی ولد میر کمبر خان رئیس
(فاتح قلات وبانی خوانین قلات)۔(ج)

ا۔خانی قلات کے دوسرے دور کا پہلا خانِ بلوچ اور نئے طائفہ احمد زئی کا جدّ امجد۔

ب۔طائفہ ایلتازئی کا جدّ امجد۔

ج۔میر کمبر کے والد کا نام میر ملوک رئیس تھا۔وہ رئیسوں کے طائفہ بورسوار سے تھے۔انہوں نے قلات سیوا کے حکمران کی گزارش اور دعوت پر حکمران سرحد و پنجگور کی حیثیت سے حاکم قلات کی مدد کی اور باغیوں کا قلع قمع کرایا اور آخرکار حاکم قلات کی نااہلیت کے پیش نظر اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا۔محررہ نسب نامہ انگریزی حکومت کے مرتب کردہ شجرہ سے اخذ کردہ ہے۔

31۔ خان صاحب کے تمام بیانات مفروضات پر مبنی ہیں۔ یہ وہی خیالات ہیں جو مرحوم گل خان نصیر کی پیش کردہ ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ نہ کوئی لشکر کسی برزکوہ سے قلات وسوراب کی طرف آیا ہے نہ بُرزکوئی کوئی نام یا طائفہ رہا ہے اور نہ باہر سے کوئی ابراہیم بلوچستان میں وارد ہوا ہے اور نہ کہ لفظ یا اصطلاح ''بروہی'' کا ''براہیمی'' وغیرہ سے کوئی تاریخی تعلق ونسبت رہا ہے۔ ابراہیم نام مصنف نے اپنے ہی شجرہ نسب سے اخذ کر کے فرضی مہاجرت کی کہانی میں فٹ کر دیا ہے۔ نیز اصطلاح ''بروہی'' کبھی بھی بلوچستان میں مروج نہیں رہی ہے۔ یہ اصطلاح ''براہوئی'' کے لئے سندھ میں مروج ہوا ہے۔ اور ''براہوئی'' ایک جدید نام ہے جو اُن اتحادی طائفوں کے لئے مستعمل ہوا جنہوں نے سوراب کے میروانی سردار گھرانہ ''براہو'' کو علاقے پر قابض جدگال اور جاٹ آبادیوں کے خلاف مسلح لشکر مہیا کیے اور ''براہو'' طائفے کے اتحادی بن کر جنگ لڑی۔ جو جنگجو شخصیتیں ''براہو'' کے اتحادی بنے ان کے نام سے نئے طائفے تشکیل ہوئے۔ یہی طائفے براہو کی نسبت سے ''براہوئی'' کہلائے۔ جنہیں سندھ میں بروہی تلفظ کیا گیا ''براہو'' جدگال جنگ کا فیصلہ 66-1665ء کے دوران ہوا اور نئے طائفے تشکیل پا گئے۔ چونکہ احمد زئی قبیلہ کا جد امجد میر احمد ایلتازئی بھی براہو میروانی کا جنگی اتحادی تھا اور اختتام جنگ پر وہ علاقے جن پر سابق خوانین یعنی میر احمد کے اجداد کا دعویٰ چلا آ رہا تھا، اُسی کے حصے میں دیئے گئے جہاں پر 1666ء میں وہ برسر اقتدار آئے۔ براہو کے اتحادی ہونے کی نسبت سے وہ بھی براہوئی کہلائے اور براہوئی خان متعارف ہوئے۔ 66-1665ء سے قبل روئے زمین پر کہیں بھی لفظ ''براہوئی'' اور بروھی کا وجود نہیں رہا ہے۔ خان صاحب کی مبینہ کہانی ان کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔

بلوچستان کے بلوچ

''فرنٹیئرز آف بلوچستان 1876ء'' معروف یوروپی محقق جی۔پی۔ٹیٹ کی ایک اہم تصنیف ہے۔اس کتاب میں مصنف نے بلوچستان اور بلوچ قوم کے بارے میں اپنی تحقیق پیش کرنے کے علاوہ دیگر مصنفین اور محققین کے اخذ کردہ نتائج بھی پیش کیے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:۔

''بلوچستان میں اکثریت بلوچوں کی ہے جو تعداد میں بھی بہت زیادہ ہیں۔ بلوچستان کا نام ایرانی بادشاہ نادرشاہ نے دیا تھا (1) سینٹ جان کا کہنا ہے کہ اس کی شمالی حد ہلمند کی وادی، جنوبی حد سمندر، مغربی حد کرمان کی سرحد اور مشرق میں سندھ تک احاطہ کئے ہوئے ہیں۔اگرچہ بلوچوں کا اقتدار اعلیٰ نہیں ہے لیکن وہ اس خطے کے طول وعرض میں پھیلے

ہوئے ہیں۔''''بلوچ'' نام کا ماخذ تاریکی میں ہے۔ اور اس کی مختلف وضاحتیں کی گئی ہیں۔ پروفیسر رالنسن اس کا ماخذ بیلوس بتاتا ہے جو انجیل میں بیان کردہ بادشاہ بابل، نمرود بن کوش تھا۔ کوش کے نام پر قلات کا مشرقی علاقہ ''کچھ'' ہے (2)۔ پوٹنگر نے ان کے طور طریقے، ادارے اور مذہب کے پیش نظر انہیں ترکمن نسل سے کہا ہے (3)۔ وہ خود اپنے کو ایران سے آئے ہوئے اوّلین مسلمان حملہ آوروں سے بتاتے ہیں اور عربی نسل کہلوانے کے شوقین ہیں۔ (4) وہ اس خیال کو حقارت سے ٹکراتے ہیں کہ وہ افغانوں کا ہم اصل ہیں۔ (5) بلوچی اور فارسی کی قربت سے ان کا ایرانی الاصل ہونا ممکن ہے۔ بہرحال نام ''بلوچ'' ابھی تک ایک متنازعہ مسئلہ ہے۔'' (6) ''بروس لکھتا ہے کہ بلوچ اپنے کو حلب کے رہنے والے اور

امیر حمزہ ابن عبدالمطلب کی اولاد روایت
کرتے ہیں (6.A) جنہوں نے آپس کی
خانہ جنگیوں کی بنا پر عرب علاقے کو خیر باد کہا
اور ایران کے کرمان سے ہوکر مکران وارد
ہوئے۔ وہ مکران میں پانچ سو سال کے طویل
عرصے میں مقیم رہے۔ ان کا امیر جلال خان
تھا جس کے چار بیٹے تھے بنام رند، ہوت
(7)، لاشاری (8)، کورائی (9) اور مسمات
جتوئی نامی بیٹی تھی (10)۔ رند سے میر چاکر
خان اور لاشاری سے میر رامن (11) نامدار
ہوا اور انہی ناموں پر تقسیم ہوئے اور یہی
دو شخصتیں ان کے سردار ہوئے۔ ہوت، کورائی
اور جتوئی سے علیحدہ علیحدہ قبیلے بنے۔ کچھی میں
آباد ہونے کے بعد ان میں لڑائیاں ہوئیں
جن کے نتیجے میں لاشاری شکست کھا کر سندھ
میں آباد ہوگئے اور چاکر اور اس کے رندوں
کو ہمایوں نے اپنی جلاوطنی کے ایام میں

مدد دینے کے عوض پنجاب کے باری دوآب
میں جاگیریں دیں۔ اور قبیلہ قلات، سندھ
اورڈیرہ جات میں منتشر ہوگیا۔'' (ایضاً)

''پوٹنگر کے مطابق براہوئی پہاڑنشین تاتاری ہیں۔ جوقدیم زمانے میں جنوبی ایشیاء میں بس گئے تھے اور قبائل کی شکل میں خانہ بدوش رہے اور صد ہا سالوں تک اپنے سرداروں کے ماتحت تھے اور آخر کار قلات اور بلوچستان میں اکھٹے ہوئے۔(12)۔ایضاً

''میسن نام ''براہوئی'' کو باروہی کی بگڑی شکل بتا تا ہے(13) اور انہیں مغرب سے آنے والے بتاتا ہے۔ جبکہ براہوئی اپنے کو یہاں کے اصلی باسی ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں (14) یہ عجیب ہے کہ ان کی براہوئی زبان، بلوچی سے مختلف اور دراوڑی ہے(15) اور بلوچی زبان انڈوجرمن گروپ سے متعلق ہے(16)۔اس فرق کی وجہ سے بعض مصنفین نے براہوئی کو بلوچ سے قدیم تر بتایا ہے(17) میسن کے مطابق رند کچ گنداوہ، سراوان کے پہاڑوں اور قلاتی مکران کے بعض علاقوں میں موجود ہیں۔ان کی زبان جٹکی ہے(18) وہ معزز کہے جاتے ہیں اور لوٹ مار کی طرف مائل ہیں(19)۔'' ایضاً

''بلوچستان میں بولی جانے والی بلوچی موجودہ فارسی زبان سے ناقابل انکار مماثلت کی حامل ہے۔مکرانی بلوچی فارسی کی روزمرہ شکل ہے جسکی فارسی شکل مشرق کی جانب کمزور ہوتی جاتی ہے اور اس کی صوتیت کرخت ہوتی جاتی ہے۔

مسترای۔ پیئرسن کے مطابق مکرانی بلوچی ایک قسم کی فارسی ہے۔ ایک اور مصنف بروس کا کہنا ہے کہ یہ اس قدر بگڑی ہوئی فارسی سے ملاوٹ ہے کہ اسے ایک علیحدہ زبان مشکل ہی سے کہا جاسکتا ہے۔ (20) فارسی اور بلوچی میں فرق کی وجہ بلوچوں کی حروف کی تغیر وتبدل کی عادت لگتی ہے جس سے الفاظ اپنی اصلیت کھودیتے ہیں۔ اسے جھلاوان کے بیزنجو، مینگل، رند کے علاوہ براہوئی خان قلات (21) اوران کے سردار بھی بولتے ہیں جو براہوئی زبان کو فحش سمجھتے ہیں'' ''بلوچ اپنی شادیاں دھوم دھام سے کرتے ہیں۔ پہلے سانگ یا منگنی کی جاتی ہے جسے وہ مقدس سمجھتے ہیں۔ نکاح سے پہلے موسیقی اور رقص کی محفلیں منعقد کرتے ہیں۔ شادی کے دن دولہا کو زرق برق لباس پہنا کر گھوڑے پر سوار کر کے اس کے دوستوں کے ہمراہ کسی بزرگ کی زیارت کرنے لایا جاتا ہے جسے وہ باعث خیر سمجھتے ہیں۔ پھر ایک مولوی نکاح پڑھاتا ہے اور کافی کھانا پکایا اور کھلایا جاتا ہے۔ شادی کے سارے اخراجات دولہا کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔'' ''کسی کے مرنے پر ماتم کرنے والوں کو بلایا جاتا ہے۔ اور تین دن تین راتوں تک آئے ہوئے عزیز واقارب کی مہمان نوازی کیجاتی ہے۔ جو غمزدہ خاندان کے شریک غم ہوتے ہیں۔ اور مردے کی ایصال ثواب کیلئے خیرات کی جاتی ہے۔''

مہمان داری بلوچ کردار کی ایک قابل قدر خصوصیت ہے۔ وہ کسی بھی تھکے ماندہ مسافر کو فوراً اپنی دامن محبت میں لے لیتے ہیں۔ وہ اُس کی خدمت وخاطر ومدارت اوراس کی جان ومال کی حفاظت کو اپنا مقدس فرض جانتے ہیں۔ تمن کے مہمان خانے میں

اُسکی متاثر کن آوٗ بھگت ہوتی ہے۔ تمن کا سردار اُس کا والہانہ استقبال کرتا ہے اور اُس سے بغلگیری اور اُس کی دست بوسی کر کے اپنی خوشی اور محبت کا اظہار کرتا ہے۔ ایک دوسرے کا تفصیلی حال احوال پوچھتے ہیں۔ جو کہ خان، ان کے سرداروں اور دیگر ملکی، قومی اور تاریخی معاملات سے متعلق ہوتے ہیں حال دیتے اور لیتے وقت موجود تیسرے شخص کی اجازت لینا ضروری سمجھتے ہیں۔'' ایضاً

بلوچوں میں کشت وخون کے سلسلے میں ایک اور پختہ رسم خون بہا (22) کا ہے یہ کشت وخون دیرینہ ہوتے ہیں اور ان کا سلسلہ کبھی نہیں رُکتا۔ مقتولین کا پورا حساب رکھا جاتا ہے۔ معمولی باتوں سے ان کی ابتداء ہوتی ہے اور جب تک سادات یا مستورات درمیان میں نہ پڑیں ان کا تدارک نہیں ہوتا۔ میسن لکھتا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا سردار ہو جو اپنے کسی عزیز کے قتل میں ملوث نہ ہو۔'' ایضاً

''بلوچ اہل سنت ہیں اور شیعوں سے سخت نفرت کرتے ہیں (23) میسن کہتا ہے کہ براہوئی بلوچوں کے ہاں پیر، فقیر، ملاّ اور سیّد نہیں ہیں اور ان کے ہاں افغانوں کی نسبت دینی تعصب کم ہے۔ (24) کیونکہ ان کی آبادیوں میں شاید ہی کوئی مسجد ہو (25) صوبہ (قلاتی بلوچستان) میں کئی فرقے ہیں اور قدامت پسند مسلمان ان سے سخت متنفر ہیں (26) ایک فرقہ ذکری ہے جو نماز کی جگہ ذکر کرتے ہیں اور اٹک میں ظہور کرنے والے مہدی کو اپنا پیغمبر مانتے ہیں (27) جو مکران میں غائب ہوا۔ اور کسی آنے والے وقت میں پھر ظہور کرے گا۔ وہ حضور (صلعم) کو مہدی سے افضل مانتے ہیں۔ یہ مکران

میں بہت ہیں اور کیچ کلانچ اور کولواہ میں ہیں۔ کک کے مطابق یہ داعی کہلاتے ہیں اور کہتا ہے کہ ان کی مسجد کیچ کے نزدیک ''کوہ مراد'' پر واقع ہے (28) ایک اور فرقہ رفائی کے ماننے والے کورواہ، میداور رئیس قبیلہ کے لوگ ہیں جو ساحلی علاقے کے ہیں۔ اُن کے مظاہر نفس کُشی کے ہیں اور عقائد میں تعصب اور جنونیت رکھتے ہیں۔ ان کی عبادت گاہیں گوادر میں ہیں۔ مکران میں آغا خانی اور کھوجہ بھی ہیں۔ راس کہتا ہے کہ یہ اپنے عقیدے میں حضور صلعم کو وشنو کا دسویں اوتار کہتے ہیں اور اس طرح اسلام کو ہندو مت سے ملانے کی سعی کرتے ہیں۔(29)۔''

''بلوچستان میں عورت ومرد غلام ہر امیر گھرانے میں ہیں۔ جو مسقط سے لائے گئے شیدی یا حبشی اور جنگی قیدیوں کی اولاد ہوتے ہیں۔ قلات میں بلوچ (30) اور افغان غلام بھی ہیں۔ میسن کے مطابق خانہ زادوں سے اچھا سلوک کیا جاتا ہے اور وہ خوشحال ہیں خفیہ اور خاص امور میں ان پر اعتماد کیا جاتا ہے۔ پوٹنگر کا کہنا ہے کہ چھاپہ کے دوران گرفتار لوگوں کو آنکھوں پر پٹیاں باندھ کر اونٹ کے ساتھ باندھتے ہوئے لے آتے ہیں۔ تاکہ واپس نہ جاسکیں، ان قیدی عورتوں اور مردوں کے بال اور داڑھیاں تراش کر چھونے کے سفوف مل کر ان کے دوبارہ اگنے کے عمل کو روک دیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کے دل سے واپسی کا خیال ہی ختم ہو جائے۔ اور پھر جلد ہی وہ وفادار نوکر بن جاتے ہیں۔ اس کے مالک کو اس کی زندگی اور موت پر مکمل اختیار ہوتا ہے اور غلام کو اپیل کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

چپاؤ میں بلوچ وحشی اور غارتگر بن جاتے ہیں اور رات کی تاریکی میں لوٹ کھسوٹ کے علاوہ اپنے شکار کے ساتھ ایسا ظالمانہ سلوک کرتے ہیں کہ کسی نے سُنے نہ دیکھے ہوں گے'' پالتو جانوروں میں بلوچ کا اہم ترین ساتھی اونٹ ہے۔ سانڈنی بار برداری میں بے مثل اور بھوک پیاس کی شدت برداشت کرنے میں متحمل مزاج ہے۔ یہ گرم ترین موسم کو بھی برداشت کرتا ہے۔ اسے چھاپہ مار ''چپاؤ'' میں کام میں لاتے ہیں مکران اور لس کی سانڈنیاں قدرے نازک اور سڈول جسم رکھتی ہیں۔ لیکن جو گھوڑے بلوچ پالتے ہیں وہ مضبوط جسم کے مالک اور قد کاٹھ میں بڑے ہوتے ہیں۔ لیکن ہوتے بہت کینہ خو ہیں۔ یہ زیادہ تر قلات کے جنوبی علاقوں اور کچ گنداوہ میں پرورش کئے جاتے ہیں۔ مکران میں جو گھوڑے ہوتے ہیں ان کے قد چھوٹے اور دُم ندارد ہوتے ہیں۔ مکران کے مغربی اضلاع میں خچروں کی ایک نسل بھی ہوتی ہے۔ یہ سخت جان مگر قد میں پست ہوتا ہے۔ بھیڑ اور بکریوں کی کئی اقسام کے بڑے بڑے ریوڑ ملتے ہیں۔ چرواہے قابل قدر کتے اور شکاری کتے بھی رکھتے ہیں۔ اصیل شکاری کُتے پنجگور اور خاران کے ہیں۔ بلوچ ان جانوروں کی پرورش اور نسل کشی میں کئی احتیاطیں برتتے ہیں جس طرح برطانیہ والے کتوں کے معاملے میں۔''

''قلاتی بلوچستان کی حکومت ایک موروثی حکومت ہے۔ خان کوئی مطلق العنان حکمران نہیں رہا ہے بلکہ سراوان اور جھلاوان کے دو سرداروں کی مشاورت میں حکومت کرتا رہا ہے۔ سرکاری معاملات میں سردار سراوان جو دربار میں خان کے دائیں

ہاتھ بیٹھتا تھا، کی رائے کو فوقیت دی جاتی تھی۔ ایک تیسرا موروثی مشیر دارالحکومت کے دہوار قبیلے سے لیا جاتا ہے۔

ہنگامی حالات میں جنگ کا اعلان اور معاہدات کرنے کے اختیارات خان کے پاس ہوتے تھے۔ اراضیات کی حد بندی اور تنازعات کا تصفیہ بھی وہی کرتا تھا۔ وہ سرداروں کو بمعہ مہیا کی جانیوالی جنگی نفری کے حاضر ہونے کا حکم دینے کا مجاز تھا۔ فوج کی تعداد کے بڑھنے یا کم ہونے کا دارومدار خان کے رویّے پر انحصار کرتا تھا۔ جیسے کہ نصیر خان اوّل تیس ہزار نفری جمع کر سکتا تھا جبکہ اُن کا جانشین مشکل ہی سے بارہ ہزار کی تعداد لا سکتا تھا۔ نصیر خان کے وقت ایک رجسٹر میں اُسکی بلوچ فوج کی تعداد ڈھائی لاکھ درج پائی گئی۔"

"کچھی کے جھکرانی اور ڈومبکی رندوں نے ڈاکوؤں کی حیثیت (31) سے خان قلات اور برطانیہ کے سرحدی حکام کے ناک میں دم کر رکھا۔ جھکرانی (32) عظیم قبیلہ رند سے ہے جو کبھی لاہڑی کے گردونواح میں آباد تھا۔ وہ ڈومبکیوں سے جدا قبیلہ ہے۔ ماضی میں وہ ایک مشہور ڈاکو سردار بجّار خان کی کمان میں پندرہ سو مسلح گھڑسوار اور پانچ سو مسلح پیادہ جوانوں کے ساتھ غارتگری اور قانون شکنی میں بدنام تھے (33) جھکرانی کہاں سے آئے تھے یہ معلوم نہیں لیکن ڈومبکی ایران سے یہاں وارد ہوئے تھے۔ ان کا نام ایرانی دریا ڈومبک کی نسبت سے ہے (34) ڈومبکیوں نے 1828ء سے قبل کھیری قبیلے (بنیادی طور پر افغان قبیلہ) (35) کو فلیجی، چھتر وغیرہ کی اراضیات سے بیدخل

کر کے ان پر قبضہ کرلیا۔ کھیری، بلوچوں کی دست اندازیوں سے بھاگ کر سندھ چلے آئے۔

جھکرانی اور ڈومبکیوں کے آئے روز کے چھاپوں سے تنگ آ کر مسٹر چارلس نیپئر گورنر سندھ نے 1845ء میں انہیں زیر کیا اور دریا خان اور بجار خان کے تحت کافی جھکرانی اور ڈومبکیوں کو سندھ کے جیکب آباد کے جانی ڈیرہ میں منتقل کیا گیا۔"

"سرحد کے بلوچ قبائل مزاری، دریشک، گورچانی، تمی لنڈ، لغاری، بگٹی، مری، کھتران، کھوسہ، بزدار اور قیصرانی ہیں پنجاب کی سرحدی علاقوں اور کچھی میں لوٹ مار کرنے والے قبیلے زیادہ تر مری، مزاری، گورچانی اور بگٹی ہیں۔

مزاری قبیلہ کے چار حصوں میں 57 طائفے ہیں اور سندھ اور بہاولپور کے قرب وجوار میں ان کے لوگ آپس کی لڑائیوں میں ہیں۔ سردار گھرانہ "بلوچانی" ہے جس کی رہائش روجھان میں ہے۔ مزاری مرتبے میں بگٹی، بلیدی، دریشک، گورچانی اور جھکرانی وغیرہ کے ہمسر ہیں۔ (36) ایلفسٹن کے مطابق وہ شاہراہوں میں لوٹ مار کرنے، ہمسایوں میں قتل وغارتگری کرنے اور سندھ میں لوٹ مچانے میں نامدار ہیں (37) ان کی جنگی نفری 4000 ہے۔ دوسرا قبیلہ گورچانی ہے جسے اکثر گورچانی، گورشانی کہتے اور بولتے ہیں۔ ان کا جدّ امجد گورش نامی شخص تھا (38) ان کی بڑی شاخیں گیارہ اور اکیاسی طائفے ہیں۔ ان کے پاس 2580 جنگجو ہیں۔ ان کا سردار بشکانی طائفہ کے جلوبانی پاڑے سے ہے (39) انہیں نیم بلوچ کہا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق وہ

جزوی طور پر نیرن کوٹ (موجودہ حیدرآباد) کے ہندو راجہ کی نسل سے ہیں (40) جنہوں نے 711ء کے نزدیک سندھ پر عرب حملوں کے دوران اسلام لایا۔ کچھ عرصے بعد ان کے تین ہزار خاندان مکران ہجرت کر گئے۔ وہاں انہوں نے بلوچوں کو خوشحال پایا جو میر شیہک کے ماتحت تھے۔ یہ بھی ان کے حصے بنے۔ پھر بطرف شمال گئے اور مغل شاہنشاہ ہمایوں کی فوج کا حصّہ بنے اور موجودہ علاقہ سے افغانوں کو باہر نکال کر قابض ہوئے۔ 1760ء میں نصیر خان والی قلات کی فوج میں شامل تھے جنہوں نے مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو فتح دلائی۔ اسی لئے ان کی سابقہ مراعات بحال رکھی گئیں۔ بعد میں سکھوں کے دور میں بھی ان کی مراعات برقرار رکھی گئیں۔ برطانوی پنجاب میں ڈیرہ غازی خان کے سرحدی علاقوں میں بدترین ڈاکو اور غارتگر ہونے کی بناء پر انہیں میدانوں میں آباد کیا گیا۔ (41)

بگٹی قبیلہ کا مرکز قصبہ ڈیرہ ہے۔ ان کی چھ بڑی شاخیں اور 44 پاڑے ہیں اور 2210 جنگجو رکھتے ہیں۔ یہ اپنے کو رند بلوچ بتاتے ہیں۔ ہمیشہ مریوں سے لڑتے رہتے ہیں اور ہمسایوں کو لوٹتے تھے۔ خان نے ان کے خلاف فوج کشی کی لیکن انہوں نے فوج کو پسپا کیا۔ 1839ء میں میجر بلیمور کی کمان میں فوجیوں نے ان کے سردار کو گرفتار کر کے ڈیرہ پر قبضہ کیا۔ اور انہیں کافی نقصان پہنچایا۔ 1845ء میں چارلس نیپئر نے ان کے اور مریون کے خلاف مہم کی۔ 1846ء میں انہوں نے برطانیہ کے زیر انتظام سندھ پر بر پور حملہ کیا اور پندرہ ہزار جانور اٹھا لے گئے۔ ایک حملہ میں لیفٹنٹ میر یویدر نے

فرسٹ سندھ ہارس کے ایک دستہ کے ساتھ ان کے چھ اور سات سو کے درمیان آدمیوں کو گھیرے میں لیا اور لڑائی میں تقریباً ان کی آدھی تعداد ماری گئی یا گرفتار ہوئی۔ ان کی طاقت کمزور ہوئی اور بگٹی سرداروں نے سر تسلیم خم کرلیا۔ اکثر کو لاڑکانہ کے قرب وجوار میں اراضیات پر آباد کیا گیا۔

پہاڑی قبائل میں مری جتنی کثرت اور طاقت کسی کے پاس نہیں۔ ان کا خاص ڈیرہ کاہان رہا ہے۔ باقی علاقے انہوں نے بزور طاقت اپنا لئے ہیں۔ ان کا علاقہ پہاڑی اور ویران ہے۔ اس قبیلہ کی تین بڑی شاخیں اور بائیس چھوٹی شاخیں۔ ان کے چار ہزار جنگجو ہیں جو آپس میں برسر پیکار رہتے ہیں۔ بروس کے مطابق سات ہزار افراد کا ان کا مزارانی طائفہ چند سال قبل ان سے الگ ہو کر بولان کے آس پاس آباد ہوا۔ وہ تمندار مری کے برائے نام وفادار ہیں اور عملاً آزاد ہیں۔ البتہ سرزار کو پنجک (42) دیتے ہیں وہ خان قلات کی رعیت ہیں مگر مالیہ نہیں دیتے۔ نصیر خان نے اپنے وقت میں ان پر دبدبہ قائم کر رکھا تھا۔ بروس کے مطابق مری اپنے ہمسایہ قبیلہ بگٹی کی طرح اعلیٰ حضرت خان قلات کے برائے نام رعایا ہیں بالکل اسی طرح جیسے کہ سرحدی آزاد قبیلے برطانیہ کی حکومت کے ہیں۔ ان کو قابو میں رکھنے کیلئے وقتاً فوقتاً ان پر سختیاں کی گئی ہیں۔

1839ء میں برطانوی حکومت نے ان کے علاقے میں فوج بھیجی۔ کاہان پر قبضہ ہوا۔ 1840ء میں مریوں نے کیپٹن لیوس براؤن کی کمان میں آنے والے دستہ کو پانچ ماہ تک مزاحمت کر کے روکے رکھا اور آخر کار سردار دودا خان سے اپنی اور اپنے

ساتھیوں کی محفوظ پسپائی کی ضمانت لے کر قلعہ ان کے حوالے کر دیا۔ 46-1845ء میں جب چارلس نیپئر نے بگٹیوں کے خلاف مہم بھیجی تو مریوں نے اپنے جانی دشمن بگٹیوں کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیا۔ اس کے بعد 59-1858ء میں بے لگام ہونے پر خان میر خداداد خان کو ان کے خلاف کاروائی کرنی پڑی، 1892ء میں دوسری مہم بھیجی گئی جو ناکام ہوگئی۔ 72-1871ء میں خان کے خلاف کھلی بغاوت میں بھی مریوں نے شمولیت کی۔ ان کی بولان درہ میں کاروانوں کو لوٹنے کے نتیجے میں کمشنر سندھ سر ولیم ویدر نے مری قبیلے کی ناکہ بندی کرنے اوران کے کہستانوں میں فوج بھیجنے کی تجویز دی جسے حکومت ہند نے نامنظور کیا اور کہا کہ دوستانہ فیصلہ کی کوشش کی جائے۔"

"مکران کے بلوچوں کے بارے میں راس کی رائے ہے کہ وہ شکل، زبان اور کردار کے لحاظ سے اپنے براہوئی بلوچوں سے بہت مختلف ہیں۔ بہت سے قبیلے اپنے کو بلوچ کہنے کے باوجود عرب نسل سے بتاتے ہیں (43) ان کے اطوار و عادات بھی اسی روایت پر دال ہیں۔ یہ ہوسکتا ہے کیونکہ کئی عرب خاندان جو سندھ میں آباد تھے یہاں چلے آئے تھے۔ مکرانی قبیلوں کی جسمانی ساخت بھی ایکدوسرے سے مختلف ہے۔ عرب نسل کے مرد اور عورتیں خوش وضع اور سڈول ہوتے ہیں جبکہ ماہی گیر (جو کم ذاتوں کے نمونے ہیں) عام طور پر بدحال اور بدشکل ہیں (44) مہمان نوازی کو تمام لوگ فرض کی طرح نبھاتے ہیں۔ راس انہیں بہادر نہیں لیکن مستقل مزاج بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر چہ وہ مہم جو نہیں ہیں لیکن اپنی جان بچانے کے اتنے قائل بھی نہیں ہیں۔ ان میں خون خرابہ بہت کم

ہوتا ہے۔ جسمانی طور پر کمزور ہونے کے باوجود مشقتی ہیں۔ مکرانی چند خشک کھجوروں پر گزارہ کرتے ہوئے روزانہ پچاس میل سے زیادہ سفر کرلیتا ہے۔ وہ انہیں سردار خاندان، طاقتور قبیلے، معزز قبیلے اور نیچی ذات قبیلوں میں تقسیم کرتا ہے۔ اُس کے مطابق پہلے طبقے میں سکھ نسل کے گچکی اور عرب نسل کے دعویدار بلیدئی شامل ہیں۔ گچکیوں کے رشتے بلیدئیوں اور بیزنجوؤں سے ہیں (45) بلیدئی نام بلیدہ علاقہ کی نسبت سے ہے۔

دوسرے طبقے میں ایرانی نسل ہونے کے دعویدار نوشیروانی ہیں جن کا صدر مقام خاران ہے، بیزنجو اور میروانی جن کی سیاست کو براہوئی مانتے ہیں (46)، مکران کے کثیر التعداد ہوت، اپنے کو عربی النسل کہلانے والے کچھی کے رندوں کی شاخ رند (47) شامل ہیں۔

تیسرے طبقے میں کیچ کا معزز قبیلہ ملائی (48)، کولواہ اور دشت کے کودائی (49) سندھ سے آنے والے جدگال (50) پہلے پہل سندھ میں آباد ہونے اور پھر مکران آنے والے عرب نسل کے شہزادہ، ایرانی سرحد حلب سے آنے والے اور اپنے کو رند کہنے والے کلمتی (51)، براہوئی نسل (52) کے کٹواری (53)، سنگر اور ساجدی، گوادر کے مہدی زئی جو اس کی ایک پہاڑی کے نام پر مشہور ہیں، سندھ سے آئے ہوئے لگوری (یا نوحانی) (54)، سندھ سے آئے ہوئے واڑیلا (55)، کچھی کے رندوں کا طائفہ پھُشو اور بھنڈ، براہوئی اصلیت کے بُردی (56)، دُور دُور تک بکھرے ہوئے کثیر التعداد رئیس، شیہی (57)، کوسگی (58) رشخانی لٹی، بوری (59) شامل ہیں۔

چوتھے طبقے میں جیونی سے گوادر آنے والے کورواہ، جوشہہ زادہ قبیلہ کے غلام یا ملازم تھے، ماہی گیرو ملاح مید، جن کے اور کورواہ کے عجیب قسم کی مذہبی رسمیں ہیں اور جو توہم پرست اور بدکردار ہیں، ادنیٰ اور گھٹیا پیشہ والے لنڈی، لئی، بہاری (60) درزادہ اور لوڑی۔

مکرانی مرد ایک لمبی قمیص، شلوار، سُرخ چھوٹی ٹوپی، سفر میں پگڑی پھیش کے بنے چپل پہنتے ہیں۔ جبکہ عورتوں کی پوشاک ایک لمبا اور کھلا چغہ جو زمین تک پہنچتا ہے اور ایک چادر ہے۔ ناک اور کانوں میں ہلکے زیور پہنتی ہیں۔ استطاعت ہو تو اور زیور بھی پہنتی ہیں۔ عام طور پر پردہ نہیں کرتیں۔ دیگر بلوچ رہائش گاہوں کی طرح مکانات چٹائیوں سے بنائی گئی جھونپڑیاں ہیں۔ مستقل مکانات کم ہیں، صرف ساحلی علاقوں میں یا قلعوں کے اندر اور باہر دکھائی دیتے ہیں۔ ملنے جلنے کے آداب دیگر بلوچوں سے طویل رسمی اور تحمل آزما ہیں۔

مکرانی بلوچ حنفی العقیدہ سُنی اور عبادات کے پابند ہیں۔ وہ مسلمان جو قدامت پسند نہیں ہیں ذکری، رفاعی اور کھوجہ ہیں، گوادر اور چابہار کے عربوں کا ایک ''خارجی'' فرقہ ہے۔ مقامی لوگ انہیں ''بیاضیہ'' کہتے ہیں۔ بقول راس یہ فرقہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے لڑنے والے لوگوں کی قدیم نشانی ہے۔ جنہیں ختم کرنے کے بعد تین یا بعض لوگوں کے مطابق سات اشخاص بچ کر عمان بھاگ ئے۔ یہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے منکر ہیں۔ شیعہ اور سنی مذاہب والے اس فرقے کے خلاف ہیں اور

انہیں خارجی کا نام دیتے ہیں۔ (61) یہ شیعوں کی طرح بے تعصب ہیں، شراب پیتے ہیں اور اہل یورپ سے میل ملاپ رکھتے ہیں۔'' ایضاً

''مکرانی بلوچی کے بارے میں پیئرسن لکھتے ہیں کہ اس کی حدود مشرق کی طرف کوہ ملان، مغرب میں چابہار کے پچاس میل مغرب تک ہے۔ اندرون میں یہ کیچ، گلانچ اور کولواہ اور آس پاس کے علاقوں کی زبان ہے (62)۔ اُس کے مطابق یہ فارسی گروہ سے متعلق ہے جس میں کئی ہندی الفاظ مل گئے ہیں جو شاید جدگالوں کا اثر ہے (62-A)۔ جدگال سندھی قبیلہ کے لوگ ہیں (63) جو مکران میں آ بسے اور ایران کے باہو اور دشتیاری میں پھیلے ہوئے ہیں۔ راس کے مطابق یہ فارسی کی روزمرہ کی بولی ہے اور فارسی نے عربی سے جو الفاظ اور تراکیب اخذ کی ہیں ان کی جھلک مکرانی بلوچی میں ظہور کر گئی ہیں (64) اس کے مطابق یہ زبان ایران سے تا سرحد لس آہستہ آہستہ اور غیر محسوس طور پر بدلتی جاتی ہے اور ایک کرخت اور مشکل بلوچی پر ختم ہوتی ہے۔ وہ اسے قدیم فارسی سے اخذ کردہ بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ جو قدیم تراکیب اور الفاظ ایران میں متروک ہو چکے ہیں وہ اس زبان میں موجود ہیں۔''

''سفرنامہ سندھ و بلوچستان''، ہنری پوٹنگر کی 1810ء کی سفری روئیداد ہے۔ انہوں نے یہ سفر بلوچستان کے سونمیانی سے شروع کیا اور تمام تر بلوچ خطے سے گذرتے ہوئے مغربی بلوچستان کے بمپور اور صوبہ کرمان کے بم تک پہنچا۔ اس سفری روداد میں انہوں نے ایک متجسس قلمکار کی حیثیت سے بہت کچھ دیکھا، پرکھا اور بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:۔

> ''بلوچستان یا بلوچوں کا وطن روئے زمین کے اس حصے کو گھیرے ہوئے ہیں جو ۵۰،۲۴ تا ۳۰،۴۰ عرض بلد شمالی اور ۵۵،۵۸ تا ۳۰، ۴۷ طول بلد مشرقی کے درمیان واقع ہے۔ اس کے علاوہ اس کے ایک دو صوبے مشرق و مغرب کی طرف اتنی دور تک پھیلے ہوئے ہیں کہ ان کے صحیح حدود طول بلد متعین نہیں کئے جا سکتے جب تک ان کو علیٰحدہ علیحدہ بیان نہ کیا جائے۔
>
> بلوچستان (وسیع ترین معنوں میں) کے حدود اربعہ یہ ہیں:
> جنوب میں بحر ہند یا اریتھیرین سمندر، شمال میں سیستان اور ملک افاغنہ، مغرب

میں صوبجات لارستان و کرمان اور مشرق میں بُرخے از سندھ اور علاقہ شکار پور جو امیر کابل کے قبضہ میں ہے۔ اس کے پانچ حصے ہیں۔ ایک حصہ جھالاوان و سراوان، قلات علاقہ، دوسرا حصہ صوبجات مکران ولس، تیسرا حصہ صوبہ کچ گنداوہ اور علاقۂ ہڑند و داجل،

چوتھا حصہ کوہستان یا صحرا کے مغرب کا علاقہ، پانچواں حصہ صحرا، بلوچ جسے کوہستان پکارتے ہیں۔ مرحوم کیپٹن گرانٹ کے مطابق اس کا مغربی ترین علاقہ بشکرد کہلاتا ہے جو گرد بلوچوں کا مسکن ہے۔ اس کی بعض فلک بوس چوٹیاں سو میل سے زیادہ دُور بمپور سے نظر آتی ہیں۔''

''بلوچی فوج کے رجسٹر میں ڈھائی لاکھ سپاہیوں کا اندراج ہے جو اُس وقت تیار کیا گیا جب احمد شاہ نے دھمکی دی کہ اگر نصیر خان خراج نہ دے گا تو وہ حملہ کرے گا۔ یہ تعداد اُس کے فرمان کے جواب میں بھیجی گئی تھی۔ جب اجتماعی فوج لام پر جاتی تھی تو اس کے تین حصے ہوتے تھے۔ ایک سراوانی لشکر جس کا جھنڈا سبز دوشاخہ ہے، دوسرا جھالاوان اور لس کا لشکران کا جھنڈا زرد ہے، تیسرا کچ گنداوہ، قلات اور نوشکی کا لشکر جو خان یا اس کے نائب کے کمان میں ہوتا ہے اس کا بیرق سُرخ ہے۔ نقارہ نوازی کا امتیاز صرف خان کے لشکر کو حاصل ہے۔''

''جنگ یا معاہدات کرنے کا اختیار صرف خان کو تھا کیوں کہ یہ پورے بلوچستان کے مسائل تھے اور سرداروں کو طوعاً و کرہاً اس کی مدد کرنا پڑتی تھی۔ خان کو یہ بھی اختیار تھا کہ وہ تمام زمینی ملکیت کی حدود مقرر کرے۔ اختلاف کی صورت میں صرف خان ہی بحثیت آقائے زمین اس کا فیصلہ کرنے کا مجاز تھا۔ فیصلہ کیلئے وہ سخت ترین تفتیش کرتا تھا۔ خان کی سیادت مطلق کا ایک اور ثبوت یہ تھا کہ وہ ہر سردار کو اپنے مقرر کردہ لشکر کے ساتھ اصالتاً پیش ہونے کا حکم دے سکتا تھا۔

قتل کے مقدمات کا فیصلہ خان خود کرتا ہے اور کوئی اور سردار اس کا مجاز نہیں تھا کسی لڑکی کو بہلا پھسلا لینے کی صورت میں اگر اس کے باپ کو لڑکی کے حاملہ ہونے سے پہلے خبر ہو جاتی ہے تو وہ فریقین کی موت کا تقاضا کرتا ہے تو خان کو والدین اختیار کی حمایت میں یہی سزا دینا پڑتی ہے۔

ابتدائے حکومت کسی کمبرانی حاکم (65) نے عدلیہ کے قوانین بنائے تھے جن پر نصیر خان کے زمانہ اقتدار میں نظر ثانی کی گئی۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مقدمات قتل میں قاتل کو مقتول کے وارثوں کی منشا سے قید و جرمانہ کی سزا دیجاتی تھی یا خون کا بدلہ لینے کیلئے قاتل کو ان کے ہاتھ میں دیا جاتا تھا (66) مقتول کے غیر ملکی ہونے کی صورت میں خان کی پیشگی منظوری کے بغیر قاتل کو لٹکا دیا جاتا تھا۔ خان کو صرف اس کی بروقت اطلاع دی جاتی تھی'' (67)

''بلوچ، بلوچستان کی آبادی کا جزو اعظم ہے۔ اگر صاف گوئی سے کام لیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ پورے بلوچستان کی آبادی ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن کا ماخذ مبہم ہے اور جن کی تاریخ دیگر وحشیانہ قبائل کی مانند رومانوی داستانوں اور حیرات انگیز قصوں سے مملو ہے۔ بلوچ دو بڑے طبقوں یا حصوں پر مشتمل ہیں جن کے نام معمولی ترین واقعات سے ماخوذ ہیں۔ یہ حصے بلوچ اور براہوئی کہلاتے ہیں (68) ان کے بے حساب قبائل جن کی وجہ تسمیہ معلوم کرنا سراسر ناممکن ہے، عام طور پر ان کے مخدوم سرداروں یا آبائی علاقوں یا روایات نسلی پر مبنی ہیں۔ مجموعی آبادی بلوچ کہلاتی ہے خواہ وہ

ایک طبقہ سے ہو یا دوسرے سے۔ اس پیچیدہ موضوع پر مجھے جتنی زیادہ سے زیادہ مصدقہ معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق بلوچ پہلے پہل تین عظیم قبائل موسومہ بہ ناہروئی، رند اور مگسی سے برآمد ہوئے (69) اوّل الذکر یا ناہروئی زیادہ تر بلوچستان کے اس حصہ میں آباد ہیں جو صحرا کے مغرب میں ہے ان کے خیل یا معاشرے قلات کے شمال مغرب میں گاؤں نوشکی اور ملک سیستان میں بھی ہیں۔ دیگر دونوں قبائل رند اور مگسی نشیبی علاقہ کچ گنداوہ میں آباد ہیں۔ جہاں وہ مختلف ادوار میں صوبہ مکران سے آ کر آباد ہوئے۔"

"بلوچی یا بلوچکی میں موجودہ فارسی کے روزمرہ کا رنگ پایا جاتا ہے اور کم وبیش اس کی آدھی لغت اسی زبان سے ماخوذ ہے (70) جو ایک مسخ شدہ اور نا قابل وضاحت تلفظ کا بہروپ لئے ہوئے ہے۔ لیکن صوتی مماثلت اتنی ہے کہ ان لوگوں کے درمیان سفر کرتے ہوئے میں نے محض اپنی فارسی دانی کی وجہ سے بلوچی میں بولا جانے والا تقریباً ہر فقرہ سمجھ لیا۔"

> "ناہروئی طویل القامت، خوبرو اور مستعد لوگ ہیں۔ وہ موت سے نہیں ڈرتے اور جنگ میں بہت پامردی سے لڑتے ہیں۔ وہ بلوچوں کا بے حد وحشیانہ اور قزاقانہ حصہ ہیں۔ وہ انفرادی چوریوں کو انتہائی معیوب اور شرمناک سمجھتے ہیں لیکن کسی علاقے کو تاخت وتاراج کرنا مستحسن گردانتے ہیں۔ یہ غیر قانونی

حملے جن میں ظلم وستم روا رکھا جاتا ہے یہاں چپاؤ
کہلاتے ہیں۔

"چپاؤ میں جانے والے اپنی زادراہ جو کھجور، پنیر، روٹی اور پانی پر مشتمل ہوتا ہے، ساتھ لیکر اونٹوں پر چپاؤ کے مقام کیلئے روانہ ہوتے ہیں۔ متعین کردہ مقام سے قدرے پرے کسی جنگل یا ویران مقام پر ٹھہرتے ہیں اور سواریوں کو تازہ دم کرتے ہیں اور رات کے وقت سوتے مکینوں پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ اور تباہ کاری اور آتش زنی بھی کرتے ہیں اور ہر چیز قبضے میں لیتے ہیں۔ اور بغیر رُکے لوٹ کا مال لاد کر نئے راستوں سے اسّی نوے میل روزانہ کی رفتار سے واپس ہوتے ہیں۔ وہ نئے راستوں سے آشنا اور اونٹوں کو قابو میں رکھنا جانتے ہیں۔"

"رند اور مگسی عادات واطوار اور طرز زندگی میں ناہرویوں کی نسبت لوٹ مار کے کم عادی ہیں۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ یہ خان قلات کے خوف کا نتیجہ ہے یا انہیں قتل وغارت سے پیدائشی نفرت ہے۔ میرے خیال میں خان کا خوف زیادہ موثر رہا ہے۔ کیوں کہ مزاری، دریشک اور دیگر رند قبائل جو پہاڑیوں میں رہتے ہیں اور خان کے شکنجہ اقتدار سے باہر ہیں، مسافروں کے قتل وغارت کے زیادہ مرتکب ہوتے ہیں۔"

"بلوچ مذہباً سُنّی مسلمان ہیں اور شعیوں سے سخت متنفر اور ان کے کٹر دشمن ہیں اور بلوچستان میں شیعہ بن کر رہنا عیسائی بن کر رہنے سے زیادہ خطرناک ہے (71)۔ بلوچ کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے اور مجھے اس کی روایت ہر جگہ نظر آئی۔ ان کے ہاں

چوری بدترین فعل سمجھا جاتا ہے۔ وہ جب کسی کو اس کی درخواست پر پناہ دیدیں تو پھر اُس کی حفاظت میں اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں۔"

"بلوچ سپاہی سرتاپا مسلح ہو تو وہ بہت بارُعب اور ہیبت انگیز ہوتا ہے۔ اُس کے پاس توڑے دار بندوق، تلوار، نیزہ، خنجر اور ڈھال ہوتے ہیں اور ان کے علاوہ بہت سی بارود کی ڈبیاں، نرسنگھے اور تھیلیاں ہوتی ہیں۔ تھیلیوں میں گولے، گولیاں، چقماق، آتشگیر ڈبے اور دیگر جنگی آلات ہوتے ہیں۔ جو لام پر اُسے اچھا خاصا زیر بار کھتے ہیں لیکن وہ اِس کی پرواہ نہیں کرتا۔ وہ سب کے سب پکے نشانہ باز ہوتے ہیں۔"

"بلوچوں کی تفریحات ایسی ہیں جیسی ایک وحشی اور غیر متمدن قوم سے متوقع ہوسکتی ہیں وہ ہر قسم کے میدانی کھیلوں کے بیحد شوقین ہیں۔ اور ان کا کافی وقت نشانہ بازی، بندوق سے شکار اور کتے سے شکار میں گذرتا ہے۔ ایک اچھا شکاری کُتا دو تین اونٹوں بلکہ ان سے بھی زیادہ قیمتی سمجھا جاتا ہے۔"

"قبائل اور اس کے خیلوں کا تو کہنا ہی کیا ہے اکثر کی وجہ تسمیہ ہے لیکن بقایا مہمل ہیں (72) قمبرانی قمبر سے منسوب ہیں جو بانی حکومت تھا اور خان بلوچستان، محمود خان کا مورث اعلیٰ ہے (73) محمودانی، موجودہ خان قلات محمود خان سے ماخوذ ہیں۔ (74) قمبرانی دوسرے قبائل کی لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں لیکن اپنی بیٹیاں دوسرے قبائل میں نہیں بیاہتے (75)۔"

"ناہرویوں میں طائفہ اُربابی، میرے مشاہدہ میں آنے والے بلوچوں میں

حسین ترین ہیں اور اُن کے چہروں سے ایک خاص عظمت نمایاں ہے جو دوسروں کو نصیب نہیں۔ وہ بلا استثنا طویل القامت اور خوش وضع لوگ ہیں اور بیحد چاک وچو بند ہیں۔ ان کا قزاقانہ کردار (جس پر وہ بہت فخر کرتے ہیں) ان کے کارناموں سے ظاہر ہے۔ پُبرہ، ہفتوراور مگس وغیرہ اوران کے درمیانی علاقوں کے اصل مالک ملیکہ بلوچ تھے جواُربابیوں کے ساتھ کشمکش میں ملیامیٹ ہوگئے۔"

"بلوچوں کی شادی غمی رسومات سوائے چند معمولی جُزیات کے تمام مسلمانوں کی رسومات سے ملتی جلتی ہیں اور قرآن حکیم کی مقرر کردہ ہیں۔ شادی کے سلسلے میں لڑکے اورلڑکی نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں ہوتا تاہم یہ اتنا مقدس سمجھا جاتا ہے کہ اسے کسی قسم کے حالات میں بھی فسخ نہیں کیا جاتا۔ لڑکے کی طرف سے تحائف اونٹوں، بھیڑوں اور بکریوں اور دیگر مویشیوں پر مشتمل ہوتے ہیں۔

شادی شدہ عورت کا اپنے شوہر کے گھر یا دوشیزہ کا باپ کے گھر سے فرار بلوچ غیرت اور فرض کے منافی ہے کوئی بھی صورت ہو عورت اور اس کے آشنا کی موت ہی ان کے یہاں واحد مسلمہ کفارہ ہے۔"

"اہل بمپور رخشانی بلوچ ہیں جو ناہروئیوں میں بڑا قبیلہ ہے گو دولت کے لحاظ سے اور تعداد میں نمبر اوّل نہیں ہے۔ یہ لوگ اپنے ہمسایوں اُربابیوں کی نسبت زیادہ مضبوط اور سیاہ فام ہیں۔ ان کے باہمی تعلق دوستانہ ہیں اور دونوں قبیلوں کے سردار دوطرفہ شادیوں سے مربوط ہیں۔ بمپور کے محراب خان کی سولہ بیویاں ہیں۔ اس کے کئی

چھوٹے بھائی ہیں لیکن وہ قلعہ میں نہیں آ سکتے نہ ہی دیگر رعایا سے خوشحال ہیں۔ بمپور کی زبان فارسی اور بلوچی کا ملغوبہ ہے۔''

''بسمان، بلوچستان کی آخری آباد جگہ تھی۔ بلوچ اس کے کچھ مغرب کی طرف بھی ہیں لیکن وہ یہاں کے باشندے نہیں ہیں اور چند سال پہلے آباد ہوئے ہیں۔ بسمان میں کوئی ڈیڑھ سو گھر ہیں جن میں سے کچھ دو منزلہ اور چند سہ منزلہ ہیں۔ یہ سیمنٹ یا گارے کے بغیر پتھروں سے بنائے گئے ہیں لیکن وہ ایکدوسرے سے اِس طرح پیوستہ ہیں کہ بارش سے بچ جاتے ہیں۔ ان کے اندر مٹی کی لپائی ہے اور ان سب کے گرد مٹی اور پتھروں کی فصیل ہے۔ سردار مراد خان گرد بلوچ ہے جو شمالی پہاڑوں کا قبیلہ ہے اس نے دو سال قبل محراب خان بمپوری کی بیٹی سے شادی کی اور سرداری جہیز میں پائی۔ یہ پہلی جگہ ہے جہاں فارسی بول چال کی زبان ہے۔''

''ریگان ایک صاف ستھرا کچا قلعہ بلکہ ایک قلعہ بند شہر ہے۔ دیواریں اونچی اور صحیح سالم ہیں اور ان کے وسط میں اور کونوں پر بُرج ہیں۔ صرف ایک دروازہ ہے جو مرکزی بُرج کے نیچے ہے اور یہاں مستقلاً ایک حفاظتی دستہ ہے جو اجنبیوں کو اندر نہیں جانے دیتا اور یہ نظام پورے صوبے میں رائج ہے۔ دروازے کے سرکاری تنخواہ دار تفنگچی محافظوں کے علاوہ سنتری اندھیرا ہوتے ہی بُرجوں میں چلے جاتے ہیں اور ساری رات پہرہ دیتے ہیں اور نعرہ لگا لگا کر ایک دوسرے کو حوصلہ دیتے اور چوروں کو ڈراتے رہتے ہیں۔ یہ شبینہ فرائض لوگ خود برضا و رغبت انجام دیتے ہیں تا کہ وہ بلوچانِ سرحد و بمپور

وغیرہ کے حملوں سے خبردار رہیں جو سال میں ایک دو دفعہ ایرانی علاقوں پر ضرور دھاوا بولتے ہیں۔ سردار ریگان عباس علی خان نسلاً بلوچ ہے اور اس کی رعایا بھی۔ وہ نیزہ بازی کے کھیل کے بہت شوقین ہیں گھوڑے ان کے قابو میں تھے جو اِس کھیل کیلئے ناگزیر ہے۔''

''قصبہ نعیم آباد، ریگان سے کافی بڑا اور گنجان آباد اور ترقی پذیر ہے قلعہ کا بیرون اپنی صفائی اور ہمواری کی وجہ سے حسن انتظام کا مظہر ہے۔ میں اس کا اندرونی حصّہ نہیں دیکھ سکا۔ یہ قلعہ بندی کی بجائے کسی گھر کی دیواریں معلوم ہوتی ہیں۔ یہ ریگان قلعہ کے نقشے پر ہی بنا ہوا ہے۔ یہاں کا کدخدا کریم خان کُرد بلوچ تھا جو سرحد کے بڑے سردار اُلفت خان کا بھائی تھا لیکن اُس سے اور دیگر سرداران علاقہ سے لڑکر اور محروم وراثت ہو کر زمن شیر بھاگ آیا تھا جہاں حکومت کرمان سے اُسے نعیم آباد کا کم آباد علاقہ اور قلعہ آباد کر کے دیا۔ عطیے کا یہ طریقہ پچھلے پانچ چھ سال میں اکثر استعمال کیا گیا ہے۔ کریم خان نے اپنے ہموطنوں کو اپنے نئے علاقہ میں آباد ہو۔نے پر آمادہ کرلیا۔ ہے۔''

''ایک بلوچ کی مہمان نوازی ضرب المثل ہے اور مجھے اس کی روایت ملک کے ہر حصہ میں نظر آئی۔ ان کے ہاں چوری بدترین فعل سمجھا جاتا ہے اگر ایک دفعہ وہ کسی کی درخواست یا ضرورت پر اُسے پناہ دے دیں تو وہ اسے نبھانے میں اپنی جان پر کھیل جاتے ہیں۔ وہ برضا و رغبت اور پُھرتی سے اپنے سرداروں کا حکم مانتے ہیں کیوں کہ وہ حکم کی معقولیت پر یقین رکھتے ہیں اور اپنے قبائلی وقار کو قائم رکھنا چاہتے ہیں۔''

''بلوچ مجموعی طور پر شبانی ہیں اور عموماً گدانوں میں رہتے ہیں۔ ان گدانوں کا مجموعہ تُمن کہلاتا ہے۔ بعض بلوچ خصوصاً ناہروئی خیموں کی بجائے قلعوں اور کچے مکانوں میں رہتے ہیں۔ ان کے ہاں مہمانداری کا طریقہ سادہ لیکن متاثر کن ہوتا ہے۔ مہمان سے تمن کا سردار حال احوال پوچھتا ہے۔''

''وہ عموماً ایک یا دو شادیاں کرتے ہیں اور ان کے سردار چار چار بیویوں کے مالک ہوتے ہیں۔ وہ اپنی مستورات کا احترام کرتے ہیں لیکن مسلمانوں کی اکثریت کی مانند غیر محرموں سے اُن کی روپوشی پر اتنا مصر نہیں ہوتے گویا ہر وقت ان کا باہر پھرنا پسند نہیں کرتے۔ جب جوان اور بوڑھی عورتیں باہر نکلتی ہیں تو وہ اپنے چہروں کو ایسے ڈھانپ لیتی ہیں کہ نظر نہ آئیں۔''

حواشی:

1۔ جی۔ پی۔ ٹیٹ اور بعض دیگر یوروپی مصنفین کا مذکورہ بیان جو کسی تحقیق و جستجو کا نتیجہ نہیں ہے، سراسر غلط اور ایک مفروضہ ہے۔ ''بلوچستان'' نام نادر شاہ کے زمانے سے صدیوں قبل وجود رکھتا رہا ہے۔ البتہ مختلف ادوار میں اس کے حدود بدلتے رہے ہیں۔ اور تاریخی تصنیفات میں تذکرے موجود ہیں۔ اسی لئے تو انگریزوں کے چیف نیٹو اسسٹنٹ اور ''تاریخ بلوچستان'' نامی کتاب کے مصنف رائے بہادر ہتورام نے لکھا ہے:

''جس زمانے میں بلوچ سیوستان میں آئے
اور قلات و بنجارہ (نیچارہ) کا نام قلاتِ بلوچ
میں بدل گیا تو سیوستان کا نام بھی بلوچستان
ہو گیا تھا۔''

ہتورام کا بلوچوں سے مراد رند قبائل ہیں جو پندرھویں اور سولہویں صدی کے درمیانی عرصے میں قلات اور سیوی و کچھی میں دخول کر گئے تھے اس طرح ہتورام ''بلوچستان'' نام کو پندرھویں صدی کے دوسرے نصف کا نام بتاتے ہیں جو نادر شاہ افشار کے زمانے (1736ء) سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل کا زمانہ ہے۔ اُسی عرصہ میں سردار چاکر خان رند نے قلات اور گردونواح پر اپنی بالادستی قائم کی اور جدگال سردار سے قلعہ نیچارہ چھین کر اپنے ایک جرنیل میر مندہ خان رند کو حاکم بنایا۔ چند عرصہ بعد پنجگور کے رئیس حاکم اور جنگجو شخصیت میر کمبر رئیس نے زہری اور قلات پر لشکر کشی کی اور زہری اور سیوا قلات پر اپنی بالادستی قائم کی۔ انہوں نے نیچارہ قلعہ سے بھی میر مندہ رند کو خوشی سے دستبردار کرایا۔ اسی بالادستی کے دوران دونوں قلعے قلات بلوچ کہلانے لگے۔ اس واقعہ کا تذکرہ ابوالفضل نے بھی آئین اکبری میں کیا ہے۔ جو 1590ء کی تصنیف ہے۔ اس میں ''بلوچستان'' نام موجود ہے جو نادر شاہ سے ڈیڑھ صدی قبل کی کتاب ہے۔ علاوہ ازیں اِسی زمانے سے صدیوں قبل کے زمانے میں ''بلوچستان'' نام کا تذکرہ ملتا ہے جو ملک بلوچستان کی قدامت کا ثبوت ہے۔

معروف عرب سیاح اور جغرافیہ نویس ابوالقاسم ابن خردادبہ نے اپنی کتاب ''المسالک والممالک'' (250 ھجری) کے صفحہ نمبر 17 پر توران کے مرکز قندابیل (موجودہ گنداوہ) کے حدود کا تذکرہ کرتے ہوئے ''بلوچستان'' نام کا بیان بھی کیا ہے:

> ''اس کے مغرب میں کرمان اور سجستان کا دشت واقع تھا۔ مشرق میں فارس کا دریا تھا جس کے شمال میں سندھ کا ہندوستانی علاقہ جنوب میں مکران اور بلوچستان کا وسطی دشت واقع تھا۔''
>
> (بلوچستان میں عربوں کی فتوحات اور ان کی حکومتیں صفحہ 12)

معروف محقق اور مورخ جسٹس میر خدا بخش بجارانی مری نے اپنی مشہور تصنیف ''بلوچستان، تاریخ کے آئینے میں'' کے صفحہ 152 پر عرب جغرافیہ نویس ابوالقاسم ابن حوقل کی تصنیف ''صورت الارض'' کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ انہوں نے کرمان کے مشہور شہروں کا نام لکھنے کے بعد کرمان کے کوہستان کے بارے میں یوں تذکرہ کیا ہے۔ واضح ہو کہ اِس تذکرے میں بھی نام ''بلوچستان'' دیکھا جا سکتا ہے:

> ''سمندر کے قریب جنوبی سرحد پر قفص کی پہاڑیاں ہیں، شمال کی طرف جیرفت کی سرحد کے نزدیک رودباد اور کوہستان ابوغنم ہے۔

خواص کے مشرق میں ایک میدان ہے جو
قفص اور صوبہ مکران تک پھیلا ہوا ہے،
جنوب میں بلوچستان اور کرمان کی سرحد
ہے۔''

اسی طرح ایک اور عرب سیّاح اور مؤرخ اور جغرافیہ نویس ابوعبداللہ محمد بن محمد بن عبداللہ بن ادریس جو شریف ادریسی کے نام سے مشہور ہے، نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف ''نزہتہ المشتاق'' میں کوچ بلوچوں کے کوہستان کے حدود بتائے ہوئے ''ملک بلوچ'' کا نام لیا ہے:۔

''اُن کی پہاڑیاں فارس کی خلیج تک پھیلی ہیں۔
شمال کی سمت بخرمان (کرمان) تک، جنوب
کی طرف اور مشرق کی سمت سمندر تک اور
مکران کے دشت تک، مغرب کی طرف سمندر
تک اور مُلک بلوچ، ماتبان اور ہُرمز تک۔''

واضح ہو کہ شریف ادریسی کا سال وفات 560 ھجری ہے یہ زمانہ نادرشاہ کے حکمرانی کے زمانے سے تقریباً چھ سو سال قبل کا زمانہ ہے۔ درحقیقت سینکڑوں سال قبل مسیح سے بلوچ وطن موجود ہوتا تھا۔ اور اپنے بدلتے ہوئے حدود کے ساتھ کبھی یہ ''بلوچ'' کے نام سے شہرت پاتا تھا کبھی ''ملک بلوچ'' کہلاتا تھا اور کبھی ''بلوچستان'' اس کا نام ہوتا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ ''بلوچ'' کے ساتھ فارسی زبان کا ''ستان'' اِس نام کا تب حصہ بنا ہوگا جب بلوچ ملک پر سلطنت ایران کی بالا دستی رہی ہوگی کیوں کہ ''ستان'' کے لاحقہ سے قبل ہمیں تمام تاریخی تصنیفات میں یہ نام ''مُلک بلوچ'' کے نام سے ملتا ہے۔

مذکورہ بالا ''ملک بلوچ'' اور ''بلوچستان'' کے علاوہ سن عیسوی کی آٹھویں صدی سے دو چار صدی پہلے قلات سے مکران اور قندہار تا سندھ کے درمیانی خطوں میں ''بلوص'' اور بیلوص کے نام سے ایک وسیع وعریض بلوچ وطن کا تذکرہ ملتا ہے۔ جس کا دارالحکومت کبھی قندھار ہوتا تھا اور کبھی ''بُست'' ہوتا تھا۔ بلوچستان کا ایک نامور محقق ملک محمد سعید دہوار اپنی تصنیف ''تاریخ بلوچستان'' کے صفحہ 250 پر لکھتے ہیں:

> ''ظہور اسلام کے وقت سندھ میں ایک وسیع سلطنت قائم تھی جو شمال میں کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی، اس میں پنجاب کا ایک بڑا حصہ شامل تھا۔ شمال مشرق میں اس کی سرحدیں ریاست قنوج سے ملتی تھیں۔ مغرب میں مکران یا کیچ مکران، گردان (کزدار)، کیکان یا کیکانان کا وسیع خطہ اس میں شامل تھا۔ شمال مغرب میں اس وسیع مملکت کی سرحدیں بجستان کی حد تک اس وسیع علاقے

کی حدود کو چھوتی ہوئی کوہ سیاہ یا مہتر سلیمان
کے دامن کے ساتھ ساتھ پھیلی ہوئی تھیں جو
''بیلوص'' کے نام سے موسوم تھا۔''

مذکورہ مصنف اسی سلسلے کو بڑھاتے ہوئے ''عرب دور حکومت'' کی ذیل میں لکھتے ہیں کہ عربوں نے سیستان پر ۲۳ ہجری (644ء) میں حملہ کیا اور اُسے زیر اقتدار لائے۔ اس مفتوحہ علاقے کی حدود ہندوستان کی سرحد تک وسیع تھیں اور اس کے ساتھ:

''قندھار ولایت کے ایرانی صوبے پر بھی اُن
کا تسلط ہو گیا جو اُس زمانے میں رخج یا الرخج
کے نام سے موسوم تھا اور جس کو بیلوص کا نام
بھی دیا جاتا تھا۔''

یعنی 644ء تک پہلے والا بلوچ ملک اپنے سابقہ حدود کے ساتھ بچا نہیں تھا اور سکڑ کر چھوٹا اور محدود ہو گیا تھا۔ اور اُس کا نام بھی بیلوص سے بدل کر الرخج ہو رہا تھا۔ 977ء تک جب سبکتگین نے اس قدیم ملک کو اپنے تصرف میں لایا تو ''بیلوص'' ایک چھوٹے سے شہر کی صورت میں موجود تھا۔ معروف محقق ریورٹی اپنی تصنیف ''نوٹس آن افغانستان اینڈ بلوچستان'' میں لکھتے ہیں کہ 977ء میں سبکتگین نے بُست پر قبضہ کیا جس میں بیلوص یا الرخاج کے سارے علاقے شامل تھے۔ ان پر تسلّط قائم کرنے کے بعد اُس نے خضدار پر حملہ کر دیا۔''

درج بالا مطالعے سے ثابت ہوتا ہے کہ قدیم ملک بلوچ یا بلوچستان ایک نہایت ہی وسیع مملکت ہوتی تھی اور جو ایک نہایت ہی عددی اکثریت رکھنے والی بلوچ قوم کا خطہ ہوتا تھا۔ جس کے سینکڑوں طائفے اِس عظیم ملک میں پھیلے ہوئے ہوتے تھے۔ سماجی، معاشی اور عسکری حالات کی وجہ سے یہ بلوچ وطن اپنے حقیقی فرزندوں سے خالی ہوتا گیا اور اس کے حدود تقسیم ہوتے اور سکڑتے رہے لیکن بلوچ نام کے ساتھ کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی شکل میں اپنا وجود منواتا رہا۔

سبکتگین کے بیلوص پر تسلط سے قبل 659ء اور اس کے کئی سالوں بعد تک اِس وسیع سلطنت کا ایک جنوبی حصہ یا ٹکڑا ''بلوص'' کے نام سے کوئٹہ پشین و مستونگ اور سیوی کے علاقوں پر مشتمل وجود رکھتا تھا۔ جسے عرب تحریرات میں ''مناطقہ البلوص'' لکھا گیا ہے۔ 38ھ میں قندابیل (گنداوہ خطہ پر عرب تسلط کے حالات کے تذکروں میں اس ملک کا ذکر ملتا ہے۔ جو ملک توران جس کا مرکز خضدار ہوتا تھا، سے بیس فرسخ کے فاصلے پر تھا یعنی بیس فرسخ سے اس کی سرحد شروع ہوتی تھی۔ عربی لغت المنجد میں ایک فرسخ کو تین میل اور بارہ میل کے درمیان بتایا گیا ہے۔ اگر ہم درمیانی فاصلہ آٹھ میل ایک فرسخ شمار کریں تو توران کی آخری شمالی سرحد سے مناطقہ البلوص ایک سو ساٹھ میل پر واقع ہوگا۔ اور یہ خطہ مستونگ سے قندھار اور سبّی کا درمیانی خطہ ہوگا۔ واضح ہو کہ شاہنامہ فردوسی میں بھی کوئٹہ اور مستونگ بشمول بولان کی پہاڑیوں کے آس پاس بلوچوں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اور ایک تورانی پہلوان کک کی کمان میں ایک نہایت ہی طاقتور اور سر تا پا مسلح بلوچ

فوج کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اور واقعتاً عربی تحریرات میں بیان کیا گیا ''مناطقہ البلوص'' یہی خطہ رہا ہے جو ایک محدود ملک کی حیثیت سے وجود رکھتا تھا۔ اس کا ثبوت وہ تاریخی بلوچی نام ہے جو اِس بیچ میں واقع مواضعات، پہاڑ، میدان ودشت، ندی نالوں پر چسپاں ہیں جو درحقیقت قدیم بلوچ قبیلوں اور ان کے طائفوں کے نام ہیں جو اس قدیم بلوچ وطن ''بلوص'' یا ''بیلوص'' کے فرزند وباسی تھے۔ جن میں چند ایک ابھی تک کشمیر وافغانستان اور ہندوستان میں موجود ہیں۔ چند تاریخی بلوچ قبیلوں کے نام درج ذیل ہیں جن کے اب صرف مواضعات یادگاریں رہ گئی ہیں:

''گنج، زند، بشام، چلتن کرد، شال، گُرد، کندہار، بلخ،
کاسا، زیبار، گوران کرد، سلیمان کرد، ڈگاری،
آماچ، مہرانی، باغک، سیاہ، پیشی، زوار، وغیرہ۔''

مندرجہ بالا حوالوں اور ان سے اخذ کردہ نتائج سے ثابت ہوا ہے کہ ''بلوچ ملک'' ہزاروں سالوں سے اپنے بڑھتے گھٹتے حدود کے ساتھ تاحال مسلسل موجود رہا ہے اور کسی بھی دور میں اِس کا عدم وجود ثابت نہیں ہے گو کہ اقتدارِ اعلیٰ اِس کے پاس مسلسل نہیں رہ سکا ہے۔

2۔ مصنف کا کہنا غلط ہے۔ وہ ''کوچ'' اور ''کچھ'' میں تمیز نہیں کر سکا ہے اور نہ ''کچھ'' کے معنی سمجھ سکا ہے۔ ''کچھ'' سنسکرت کا لفظ ہے جو دشت اور وسیع میدان کیلئے مستعمل ہے۔ جبکہ ''کوچ'' کو مؤرخین نے شاہ بابل نمرود کا باپ بتایا ہے۔ کوش اور کوچ ایک ہی لفظ کے

دو لہجے ہیں۔ عربی اور سامی زبانوں میں ''چ'' کی جگہ ''ش'' بولا جاتا ہے۔ اسی لئے عرب لوگ ''بلوچ'' کو ''بلوشی'' بولتے ہیں۔ یمنی عرب ''ش'' کی جگہ ''ص'' استعمال کرتے ہوئے اس نام کو ''بلوصی'' بولتے ہیں۔ بلوچی زبان میں بھی کئی مقامات پر ''چ'' کی جگہ ''ش'' ادا کیا جاتا ہے۔ اسی ''کوچ'' نام کو بھی دونوں صورتوں میں کہا جاتا ہے۔ مکران کے ضلع کیچ میں بھی کوچ یا کوش قبیلہ کا قبل از اسلام کا قلعہ موجود ہے جو ''کوش قلات'' کہلاتا ہے۔ اور نام ''کیچ'' بھی اصل میں ''کوچ'' ہے جو مغربی مکران (ایرانی زیر انتظام) کے بلوچی کا لہجہ ہے۔ ضلع کیچ میں دونوں لہجے ابھی تک موجود ہیں۔ تربت اور گردونواح میں ''ی'' کو ''وْ'' میں ادا کیا جاتا ہے جبکہ مند اور اس کے مغربی علاقوں میں ''وْ'' کو ''ی'' میں ادا کیا جاتا ہے۔ جیسے بوت اور بیت، دھوت اور دھیت، سور اور سیر، نور اور نیر، حور اور حیر، دُور اور دیر، سوت اور سیت، سوس اور سیس یا ثیث وغیرہ۔ بلوچ نسل شہنشاہ بیلوص بن الکاؤس (2800ق م) سے چلی ہے۔ اور خاندان میں ایک سے زیادہ بیلوص نامی شخصیتیں ملتی ہیں اور نمرود بھی ایک سے زیادہ ہو گزرے ہیں اور اسی طرح کوچ نامی شخصیتیں بھی ایک سے زیادہ ملتی ہیں جنہیں ''بلوچ نسل'' موضوع کے حاشیہ نمبر ایک میں بیان کیا گیا ہے۔

بیلوص خاندان ہی سے وہ نمرود بھی پیدا ہوا جس نے خدائی کا دعویٰ کیا اور حضرت ابراہیمؑ کی نبوت کی مخالفت کی اس نمرود کا زاد بوم مکران کے ضلع گوادر کا علاقہ دشت تھا۔ اسی دشت کے مقام سُنٹ سر میں اس کا قلعہ تھا۔ جس کے زمین بوس آثار

''سنگگیں ڈور'' کے نام سے آج بھی موجود ہیں۔ اسی قلعہ کے ایک حصّے میں وہ قطعہ سوختہ بھی موجود ہے جہاں پر حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں پھینکنے کیلئے کئی دنوں تک آگ جلائی گئی تھی۔ اس سوختہ قطعہ زمین کو اللہ تعالیٰ نے سیلابوں کے ذریعہ کئی مرتبہ پوشیدہ کیا اور کئی بار ظاہر کیا۔ سنگگیں ڈور کے معنی ہیں ''جلی ہوئی ندی'' آثار قدیمہ کے ماہرین نے نمرود قلعہ کے اس آثار قدیمہ کو بلوچستان کی تاریخ کا سب سے بڑا شہر پناہ بتایا ہے۔ (دیکھیے بلوچستان ماقبل تاریخ، مطبوعہ بلوچی اکیڈمی)۔ نمرود قلعہ کا یہ مقام ہرمز کا قریبی مقام ہے اور اپنے زمانے میں سلطنت کالدیا میں واقع تھا۔ یہ اُس ملک کا جنوب مغربی حصہ ہے جو پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کے عرب جغرافیہ نویسوں کی نگارشات میں ''ملک بلوچ'' کہلاتا تھا (نزہتہ المشتاق) یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ بلوچی ملک، بلوچوں کے تاریخی جدامجد شہنشاہ بلوچ کے نام پر تھا یا نمرود بلوچ کی وجہ سے ''ملک بلوچ'' کہلاتا تھا یا اُس کی قوم ''بلوچ'' کے نام پر مشہور تھا۔

3۔ ہنری پوٹنگر کو درحقیقت یہ غلط فہمی بلوچوں میں موجود ''رئیس'' قبیلہ کی وجہ سے ہوئی ہے جو مکران کا قدیم اور اکثریتی قبیلہ ہے۔ اس قبیلہ کے طائفہ ہوت نے مکران کے اکثر علاقائی حاکموں اور سرداروں کو جنم دیا ہے۔ تواریخ میں اس قبیلہ کو متحدہ مکران کا ''بیج دار'' کہا گیا ہے یعنی ''بنیادی قبیلہ''۔ یہی وہ قبیلہ ہے جو بحیرہ کیسپئن سے کسی نامعلوم زمانے میں ہجرت کر کے مکران میں آباد ہوا تھا جو اوغز ترک نسل ہے اور ترکمن تُرک کا برادر قبیلہ ہے۔ بحیرہ کیسپئن کا قدیم اور اصل نام بھی اوغوز ہے۔ مکران میں ''اوغز'' کو ''غُز''

کہا جاتا تھا۔ جو رئیس قوم کا ایک طائفہ شمار ہوتا تھا۔ اس کا ایک گروہ پندرھویں صدی عیسوی میں رند اتحادیہ کے ساتھ بطرف قلات چلا آیا لیکن بعد میں اس کا نام سننے میں نہیں آیا۔ شاید یہ طائفہ دیگر مقامی یا رند قبائل میں مدغم ہو گیا ہوگا۔

بُحیرہ کیسپئن کے خطے کا بلوچ نسل سے کوئی بنیادی یا تاریخی تعلق نہیں رہا ہے۔ جی۔ پی۔ ٹیٹ نے اپنی تصنیف ''سیستان'' میں بھی سیستان کے رئیس قبیلے کو ''غز'' ماخذ سے کہا ہے۔

4۔ مصنف کی یہ رائے کسی حد تک درست ہے کہ بعض بلوچ مصنفین نے بلوچ قوم کی عرب نسل ثابت کرنے کے لئے زور قلم صرف کیا ہے۔ اور بلوچوں میں موجود بعض قبیلائی طائفوں کے اسماء اور چہرے مہرے عربوں سے ملتے اطوار اور رند قبائل کی یہ شعری روایت کہ ''ہم عظیم قریشوں کی نسل اور میر حمزہ کی اولاد ہیں'' سے انہوں نے بغیر تحقیق کے اخذ کیا کہ وہ عربی النسل ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دیگر کئی اقوام کی طرح بلوچ بھی ایک مختلف النسل قوم ہے۔ جس میں عرب، تُرک، جاٹ، گُجر، فارسی اور ہندی طائفے شامل ہیں۔ بلوچ قوم میں متعدد عرب الاصل پھلیوں کے علاوہ من حیث القبائل بُردھی، بوسعیدی، شیزادہ، سید، قحطانی، بلیدیوں میں قبیلہ برّ، کہیری سید وغیرہ عربی النسل ہیں۔ اسلام سے قبل اور بعد از اسلام بھی متعدد عرب طائفے مختلف حالات و وجوہات کے تحت بلوچستان میں بس گئے جو آہستہ آہستہ مقامی قبائل میں مدغم ہوتے گئے۔ چونکہ یہ چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں اپنے اپنے قبیلوں سے بچھڑ چکے تھے لیکن شناخت یا نام

اپنے قبیلہ ہی کی رکھتے تھے۔ اس لئے جہاں جہاں بھی آباد ہوئے، اپنے قبیلہ کے نام سے آباد ہوئے۔ ان قدیم عرب قبائلی طائفوں میں مرّہ، بولان، پردی، غزہ، بلیدہ، قارہ، قرمطہ (بلوچی تلفظ ''کلمت'') اور دیگر شامل ہیں۔ جن کی روایات، عادات واطوار اور عربی نام والفاظ بلوچی کلچر اور بلوچی زبان کے اٹوٹ حصّے بنے۔ جنہیں بنیاد بنا کر بلوچوں کو عربی نسل ثابت کرنیکی قلمی کوششیں کی گئیں۔ انہی قلمی کاوشوں نے بعض بلوچوں ں میں اپنے کو عربی النسل ہونے کی غلط فہمی پیدا کی۔

5۔ بلوچوں کا افغانوں سے کسی قسم کا نسلی تعلق نہیں رہا ہے۔ اکثر افغان تاریخ نویس اپنے کو بنی اسرائیل کی نسل بتاتے ہیں۔ اور ان میں جو یہودی تہذیبی صفات ہیں یہ اُس موقف کی تائید کرتے ہیں۔ بلوچ کسی قوم کو اُس کی اصل ونسل کی بنیاد پر حقیر نہیں سمجھتے بلکہ وہ اپنی اعلیٰ تہذیبی قدروں کے آئینے میں اپنے ہمسایے کو دیکھتے اور پرکھتے ہیں۔ اگر کسی ہمسایہ قوم میں اُسے کوئی پست تہذیبی عادتیں نظر آجائیں تو وہ اُس قوم سے ہم آہنگی اور قربت پیدا کرنے میں دلچسپی نہیں لیتے۔ کیونکہ بلوچ کا اعلیٰ صفاتی ذہن کسی تہذیبی پستی کو نہیں قبولتا۔ ایسی بہت سی روایتی رسمیں اور عادتیں افغان ہمسایوں میں موجود رہے ہیں جن کو بلوچ حقارت کی نظر دیکھتے رہے ہیں۔ ڈسٹرکٹ گزیٹر ژوب پٹھانوں میں ''عورت کا درجہ'' اور حق جائداد'' اور ''زنا کاری'' کے عنوانات کے تحت لکھتا ہے:

''گھروں میں عورتوں کی حیثیت بہت پست
ہے۔ جب وہ شادی کی عمر کو پہنچتی ہیں تو گویا

اُسے سب سے زیادہ بولی دینے والے کے
ہاتھ فروخت کیا جاتا ہے۔"

"بلوچستان کے قبائل "ضلعی گزیٹر سے انتخاب، ترجمہ پروفیسر انور رومان، مطبوعہ النساء ٹریڈرز کوئٹہ، 1990ء، باب دوئم ضلع ژوب صفحات ۱۰۷، ۱۰۸)۔ زنا کاری کی سزا کے بارے میں لکھتا ہے:

"نظری طور پر زنا کاری کی سزا موت ہے
لیکن عملاً مجروح شوہر لڑکیوں، روپیہ، زمین
وغیرہ کا معاوضہ لے کر اپنے ضمیر کو مطمئن
کرلیتا ہے۔" (ایضاً صفحہ ۱۰۸)۔

"اکثر قبائل میں مطلقہ کو اپنے آشنا سے شادی کی اجازت ہے۔ بشرطیکہ وہ مجروح شوہر کو معاوضہ ادا کرے.......... معدودے چند حالات میں عورتوں کا تبادلہ بھی ہوتا ہے اور آشنا اپنی بیوی مجروح شوہر کے حوالے کر دیتا ہے"۔ (ایضاً صفحہ ۱۰۸)

"یہی گزیٹر کے مصنفین پٹھانوں میں اکثریتی اور نامور قبیلہ کاکڑوں کے بارے میں یہ رپورٹ دیتا ہے:

"اُن کی غلیظ عادات پر ایک اور کہاوت طنز
ہے جو انہیں غلاظت آلود بتاتی ہے۔ ان کا
معیار اخلاق قدرے ناپسندیدہ ہے۔ اور ان

میں رسم مجلس رائج ہے۔جس کے تحت نوجوان
بالغ لڑکیاں معزز مہمانوں کی خاطر تواضع
کیلئے مہیا کی جاتی ہیں اور اگر میزبان کے
خاندان میں کوئی لڑکی نہ ہوتو وہ کسی دوست یا
رشتہ دار کے خاندان سے مستعار لیتا ہے۔''
(بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر ''ضلع ژوب''
مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997
صفحہ 1101)۔

اسی طرح یہی رسم لورلائی کے سنزرخیل ،زخپیل ، دومٹر، پیچی وغیرہ قبائل کے بارے میں بھی انہی الفاظ سے بیان کی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے گوشہ ادب کا طبع کردہ بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر حصہ اول صفحہ 589۔ اور دیگر اضلاع کے افغان قبائل میں مروج اس رسم کے بارے میں ملاحظہ کریں ''بلوچستان گزیٹر ز حصہ اوّل اور حصہ دوئم، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء بالترتیب صفحات 522، 535، 589 اور 108، 835، 1101۔ صرف کوئٹہ پشین ڈسٹرکٹ گزیٹر میں کرانی کے سیدوں اور ژوب گزیٹر میں شیرانی اور خوستی قبائل کو اس قبیح رسم سے مستثنیٰ کہا گیا ہے۔ نیز مذکورہ رسم اور دیگر ناپسندیدہ اور غیرت سے متصادم رسوم وعادات وکرادر کیلئے کتاب ''بلوچستان کے قبائل'' مطبوعہ ''مطبوعات النساء ٹریڈرز کوئٹہ، 1990ء، مترجم پروفیسر انور رومان، کے

صفحات نمبر 120,109,108,106,104,103,56,31,30,29,26 (حصہ اول) اور 134,47,31,29,28,24 (حصہ دوئم دیکھے جا سکتے ہیں۔

دیگر منفی اور ناپسندیدہ عادات جیسے دھوکہ دہی، برے دوست، مہمان نوازی کا نہ ہونا، زر پرستی اور خود غرضی، عورتوں کو قیمتی اثاثہ سمجھنا اور بیچنا، کچہریوں میں اپنی لڑکیوں کے حسن کی تعریفیں کرنا، منگنی کیلئے لڑکی والوں کے گھر پر فائرنگ کرنا، بکرے کی سری گھر میں پھینکنا، لڑکی پر ہاتھ ڈالنا، اس کا دوپٹہ کھینچنا، اس کی زلفیں کاٹنا وغیرہ۔

نکاح سے قبل داماد کو شوہرانہ مراعات دینا، رسم شرمانہ، سیاہ کاری پر لین دین کرنا، مجروح شوہر کا اپنے مطلقہ سے معاوضہ لے کر آشنا سے شادی کرانا، سیاہ کاری میں مجروح شوہر کا پیسہ پر راضی ہونا، مرحوم بھائی کی بیوہ سے خود شادی نہ کرنے کی صورت میں اُس کو بیچ دینا، ان کی رسومات ہیں جن کا تذکرہ یورپی مصنّفین نے مختلف ضلعی گزیٹرز میں کیا ہے۔ بلوچ ایسے قبیح معاملات میں انتہائی حساس ہوتا ہے۔ ایسی ایک عادت یا رسم رکھنے والے شخص کو نہ بلوچ کا ذہن قبول کرتا ہے اور نہ اُسے اپنے قریب ہونے دیتا ہے۔ چونکہ افغان اپنی سرزمین پر آباد ہیں اس لئے بلوچ ان کے رسوم میں مداخلت نہیں کرتے لیکن ان رسوم وعادات کی بنا پر اپنے کو ان سے دور رکھتے ہیں۔ اکاڈکا ہمسائگی میں بلوچوں نے انفرادی رشتے ناطے بھی کئے ہیں لیکن اپنی لڑکیاں نہیں دی ہیں۔ نوشکی کے بڑیچ افغانوں اور بلوچوں میں رشتہ کرنے کے دوران داماد کو شوہرانہ مراعات کے بارے میں چاغی گزیٹر لکھتا ہے:

''مخلوط شادیوں میں بڑیچ دلہن کا باپ بلوچ
دولہا کو تو یہ حق دیتا ہے لیکن اگر دلہن بلوچ
قبیلہ سے ہو تو بڑیچ دولہا شادیوں سے پہلے
اپنی دلہن تک نہیں پہنچ سکتا۔''
(ڈسٹرکٹ گزیٹرز آف بلوچستان ، والیوم
اوّل: چاغی ڈسٹرکٹ صفحہ 90)

یہ اور ایسے دیگر مربوط رسوم میں بلوچ اپنی ''ننگ داری'' کو داغدار کرنے نہیں دیتا۔اس بنا پر اس کی قومی غیرت کا تقاضا ہے کہ قبیح رسم و رواج اپنانے والوں سے لاتعلق رہے۔

بلوچ اور پٹھان کی عادات واطوار اور رسوم وغیرہ کے سلسلے میں چند مزید حوالے ملاحظہ کیجئے جو غیر ملکی محققین اور تجزیہ نگاروں کے ہیں۔ایک یوروپی محقق ڈینزل ابسٹس ، پنجاب کی مردم شماری رپورٹ میں نسلوں اور قبائل کے موضوع کے تحت لکھتا ہے:

''بلوچ اپنے ہمسایہ پٹھانوں سے کئی پہلوؤں
سے قطعاً مختلف اور بالکل متضاد
ہیں......... بلوچ اپنے قول واقرار کا پاس
رکھتا ہے مگر پٹھان اپنے مفادات کو اس پر ترجیح
دیتا ہے بلوچوں میں مذہبی جنون ، پٹھان کے

مقابلے میں کم ہے، ان کی سرشت وطبعیت
میں شیطانی صفات کم ہیں۔اس کی اپنے شمالی
ہمسایہ (پٹھان) کے مقابلے میں جسمانی
ساخت کم زوراور دبلا پتلا ہے۔مگر تہذیبی اور
سختی میں بلا کی ہے وہ عادات واطوار میں
راستباز اور صاف گو ہے، کمینگی اور غلامانہ
ذہنیت کا حامل نہیں۔ وہ معتدل مزاج اور
اولوالعزم ہوتا ہے، باہمتی اور مردانگی کو سب
سے بڑی خوبی سمجھتا ہے۔" صفحات ۴۱ تا
۴۳)۔

ایک اور انگریز محقق کرنل ٹی۔ایچ۔ہولڈچ اپنی کتاب "دی انڈین بارڈر لینڈ" کے صفحات ۱۸۴ا۔۱۸۵ پر دونوں قوموں کے کردار کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:۔

"بلوچ اپنے قبائلی سردار کی ،جس کی
پٹھان کے مقابلے میں ان کے قبائلی
جرگوں کی نسبت سے زیادہ اختیارات
ہیں،زیادہ قدرومنزلت کرتا ہے............
پٹھان اگرچہ حد سے زیادہ ملاّ کے

اثر و نفوذ میں ہے، مگر ہمیشہ حتی کہ مذہبی
لڑائیوں میں بھی اس کی نظریں سودا بازی
میں لگی ہوئی ہوتی ہیں۔ دونوں جنگجو اور
بے مثل غارت گر ہیں مگر ان کے جنگی
قوائد اور طریقہ ہائے کار بالکل مختلف
ہیں۔ بلوچ کھلم کھلا اور بالمقابل لڑتا
ہے۔ جو ہر لحاظ سے ایشیاء کے فاتحین کی
اولاد کہلانے کی مستحق ہے۔ پٹھان اپنے
مقصد کے مطابق کوئی بھی چال سکتا ہے
اور حیلہ ومکر سے کام لے سکتا ہے۔ وہ
اپنے دشمن کے عزیزوں کو قتل کرنے کے
فوراً بعد، بلکہ اس سے زودتر، اپنے عزیز
واقارب کو قتل کرسکتا ہے۔ اور وہ ان کو
پیچھے سے نشانہ باندھ کر مارے
گا............ ان کا اپنا ایک ضابطہ اخلاق
ہے جو نہایت عیارانہ ہے۔"

بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر سیریز (جلد سوئم) ضلع سبی دونوں قوموں کے بارے میں لکھتا ہے:

''بلوچ، صاف دل اور استباز ہیں اور حقیقت
پسندی اور عزت ووقار کی خصوصیات کے لحاظ
سے اپنے ہمسایہ افغانوں سے برتر ہیں، اپنے
سردار کی اطاعت شعار، فرمانبردار اور وفادار
ہوتے ہیں گوکہ دوسروں کے ساتھ ان کے
رویے میں غرور وتکبر، آزادروی اور خودسری کا
عنصر شامل ہوتا ہے۔ وفاکشی ، راستگوئی،
مہمان نوازی اور خواتین کے ساتھ ان کا حسن
سلوک ان کی اعلیٰ خوبیاں ہیں۔'' (صفحات
۴۰تا۵۱)

مذکورہ قومی عادات وخصائل وہ بنیادیں ہیں جو بلوچوں اور پٹھانوں میں فاصلے پیدا کرنے کے جواز بن چکے ہیں۔ اور بلوچ ہمیشہ اپنے اِس ضرب المثل پر عمل پیرا ہوتے ہیں کہ:

''گوں ماہ ءَ نندئے ماہ بئے
گوں دیگ ءَ نندئے سیاہ بئے

یعنی چاند کی ہمنشینی تمہیں روشنی بخشتی ہے اور دیگوں کی ہمنشینی تمہیں کالا کردیتی ہے۔

6۔ ''بلوچ'' کوئی متنازعہ مسئلہ نہیں ہے۔ بلکہ اسے متنازعہ مسئلہ بنایا گیا ہے اور یوروپی محققین اکثر و بیشتر لفظی اور مفروضوں پر بحث کر کر کے اصل موضوع کو یا تو الجھا دیتے ہیں یا اُسے کسی اور ڈگر پر لیجاتے ہیں۔ ایک اور مشترکہ بیماری ان میں یہ ہے کہ ہر موضوع کو وہ قدامت کی عینک سے دیکھتے ہیں۔ اور بغیر قبل مسیح کے کوئی بات ہی نہیں کرتے۔ کسی قوم پر کی گئی ان کی تحقیق کا لب لباب یہی ہوتا ہے کہ ''یہ ایک متنازعہ مسئلہ ہے'' یا اس کی اصل تاریکی میں ہے''

تقریباً پانچ ہزار سال سے بلوچستان کے مغربی خطے ''مکران'' میں بلوچ قوم کی موجودگی کے ثبوت موجود ہیں۔ ڈھائی ہزار سال سے کوئٹہ و مستونگ کے دشت میں اُس کی موجودگی کے تذکرے بھی تاریخوں میں ہیں۔ صدیوں پہلے اسی خطے میں ''بیلوص'' اور ''بلیوص'' کے نام سے ان کا ایک ملک ہوتا تھا جس کا دارلحکومت موجودہ قندہار کبھی بُست ہوتا تھا۔ واضح ہو کہ نام ''قندھار'' ایک بلوچ قبیلہ کا نام رہا ہے۔ جو مکران کے پنجگور کی وادی گچک میں بھی بودوباش رکھتا تھا۔ اسی طرح ملک ''سیستان'' بھی ''سیس'' کرد بلوچوں کے نام پر ہے۔ اس نام کے مختلف تلفظ کیئے گئے ہیں۔ کہیں ''سوس'' کہیں ''شیث'' اور کہیں اسے ''شیش'' اور ''شوش'' بھی لکھتے اور کہتے رہے ہیں۔ تاریخ نویسوں نے اسے ساکاؤں سے منسوب کر کے ساکستان لکھا اور کہا کہ یہ بگڑ کر سیستان ہو گیا ہے۔ جو ایک غلط اور ناممکن موقف ہے۔ نام اس حد تک نہیں بگڑتے۔ یہ بھی انہی یوروپی ہیرا پھیری کرنے والے مصنفین کی کارستانیاں ہیں۔ نیز دیکھئے حاشیہ نمبر 1۔

6.A: مذکورہ روایت ہزاروں سالوں سے سلطنت مکران میں موجود کسی نسلی بلوچ قبیلہ کی نہیں ہے بلکہ تیرھویں صدی میں تُرکی سرحد کے قریب علاقہ ''حلب'' سے مغربی مکران میں ورود کرنے والے تُرک نژاد رند اجداد قبائل کی ہے۔ جو وہاں اپنی طویل رہائش کے دوران بلوچوں میں مدغم ہوئے۔ اُن کی شاعری میں جس حلب کا ذکر کیا گیا ہے وہ شام کا حلب نہیں ہے بلکہ ایرانی سرحد کے قریب ایک دوسرا حلب موضع ہے۔ جہاں پر وہ ترکی سے آتے ہوئے قیام پذیر ہوئے تھے اور کئی نسلوں کے بعد مکران اور سیستان کے بلوچ علاقوں میں پھیلتے گئے۔ بروس نے جس حمزہ کو حمزہ بن عبد المطلب لکھا ہے، رندوں کی شاعری میں اُسے صرف ''میر حمزہ'' بیان کیا گیا ہے اور اُس کے باپ کے نام کا بیان نہیں کیا گیا ہے۔ لکھنے والوں اور تشریح کرنے والوں نے اپنی طرف سے ''میر حمزہ'' کو ''امیر حمزہ'' لکھا ہے اور عبد المطلب کا اضافہ کیا ہے۔ نیز بُروس کے کہنے کے برعکس وہ کرمان سے مکران میں نہیں بلکہ سیستان اور مغربی مکران میں وارد ہوئے تھے۔ مشرقی مکران میں صدیوں بعد گروہ در گروہ آنے لگے تھے۔

7۔ ہوت قبیلہ، تاریخی طور پر مکران کے قدیم اکثریتی قبیلہ رئیس کا سردار گھرانہ رہا ہے۔ جس کا مرکزی مقام کیچ ضلع کا موضع تمپ ہے۔ ہوت قبیلہ کا ماننا ہے کہ جلال خان کا ایک بیٹا ہوت نامی ضرور تھا لیکن وہ ہوت قبیلہ کا جدّ امجد نہیں تھا۔ بلکہ یہ ایک قدیم قبیلہ ہے۔ اور کیچ کا ہوت حاکم اسی قبیلہ سے تھا۔ اور اُس کا نام میر عالی ہوت تھا جو عالی رئیس بھی کہلاتا تھا۔ جو لسبیلہ اور سندھ میں جام عاری کہلاتا تھا، اسی طرح جام ہوت، جاموٹ

(جام ہوت کا سندھی لہجہ) کہلاتا تھا۔ایک محقق مولانا عبداللہ دیرمانی نے بھی لکھا ہے کہ ہوت قبیلہ مکران میں قدیم زمانوں سے موجود تھا۔''

(بلوچ قوم اور اُس کی تاریخ از مولانا نور احمد خان فریدی صفحہ 90-189)۔

کیچ میں کئی ہوت طائفے ہیں جو رئیس بھی کہلاتے ہیں اور ہوت بھی۔اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ہوت طائفہ یا قبیلہ اپنی اصل میں رئیس قبیلہ ہے۔خوانین قلات کا جدّ اعلیٰ اور ''بانی قلات بلوچ'' میر کمبر جو ''کمبر رئیس'' کے نام سے مشہور ہے جسکی حاکمیت میں پنجگور اور موجودہ ایرانی حدود میں واقع ''سرحد'' کا علاقہ بھی تھا، ہوت بھی کہلاتا تھا۔خوانین کے ایک سوانح نگار قاضی نور محمد گنج آبوی نے اپنی منظوم تصنیف ''جنگ نامہ تحفۃ النصیر'' کے باب ''در حسب ونسب بلوچاں'' میں احمد زئی خوانین کو میر کمبر کی نسل سے بتاتے ہوئے انہیں اور میر کمبر کو ''ہوت'' لکھا ہے جبکہ اپنے شجرہائے نسب میں وہ ''رئیس'' لکھے گئے ہیں۔معروف بلوچ محقق میر سردار خان گشکوری اپنی تصنیف ''ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان'' کے صفحہ 76 پر لکھتے ہیں کہ معلوم تاریخ سے پہلے احمد زئیوں کے جد امجد رئیس کہلاتے تھے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ہوت قبیلہ کا یہ دعویٰ کہ ہوت دراصل رئیس قبیلہ کا مرکزی اور سردار گھرانہ رہا ہے ایک صحیح موقف ہے۔اور جلال خان کا بیٹا ''ہوت'' کوئی دوسرا ہوت ہے۔اس بارے میں ڈسٹرکٹ گزیٹئر کچھی لکھتا ہے کہ مکران کے ہوت متفقہ طور پر علاقہ کے قدیم باشندے سمجھے جاتے ہیں اور وہ خود بھی رندوں اور علاقے کے دیگر بلوچ قبائل سے ایک علیحدہ نسل کے دعویدار ہیں۔''

8۔ لاشاری، قبیلہ کا نام ہے جلال خان کے بیٹے کا نام نہیں تھا۔ بیٹے کا نام ''لاشار'' تھا جس کے نام سے رندوں کا لاشار قبیلہ وجود میں آیا تھا اور جو ایرانی زیر انتظام بلوچستان کا قبیلہ تھا۔ جس مقام پر یہ قبیلہ آباد تھا اُس مقام کا نام ان کے نام پر ''لاشار'' پڑا جو اب بھی اسی نام سے موجود ہے۔ یہ لاشار صدیوں سے آباد ہے جس میں بعد میں لاشار لوگوں کے علاوہ دیگر بلوچ قبائل بھی آ کر بس گئے۔ تقریباً پندرھویں صدی کے آخری نصف میں لاشار سے کئی گروہ مشرقی بلوچستان کو ہجرت کر آئے۔ یہی گروہ جو ایک قبیلہ نہیں تھے۔ اپنے سابقہ مسکن ''لاشار'' کی نسبت سے لاشاری کہلائے۔ یہ لاشاری، موضع لاشار سے کچھی تک کس راستے سے آئے تھے، اس کا پتہ نہیں چلتا کیوں کہ براستہ مند، کیچ، پنجگور، کولواہ، مشکئے، خضدار، قلات جو رندوں کی مسافرت کا راستہ تھا، لاشاریوں کے مسافرت کا کوئی نشان پا نہیں اور نہ کہ اس طویل راستے میں کہیں کوئی لاشاری آبادی یا لاشاری گھر ہے۔ جبکہ رند قبیلہ کے گاؤں کے گاؤں ہیں۔ کولواہ میں تو میر شیہک رند کا موضع آشال میں قبیلائی قلعہ تھا۔ جہاں پر چاکر اعظم پیدا ہوئے تھے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ قلات اور کچھی کی طرف رند مہاجرت میں لاشاری قبیلہ ساتھ نہیں تھا۔ اور نہ کہ تا حال ہے۔

9۔ لاشاری کی طرح ''کورائی'' بھی جلال خان کے بیٹے کا نام نہیں ہے بلکہ یہ قبیلہ کا نام ہے۔ بیٹے کا نام ''کرا'' یا ''کورا'' تھا۔ یہ پورے وثوق سے نہیں کہا جاسکتا کہ قبیلہ ''کورائی'' کا جدّ امجد جلال خان کا بیٹا ''کورا'' یا ''کرا'' تھا یا کسی اسی نام کے موضع کی

نسبت سے یہ نام ان پر لگ چکا ہے۔ ایرانی بلوچستان میں کورائی قبیلہ کے گھرانے موجود ہیں۔

10۔ انگریزی گزیٹرز نے اس قبیلائی نام پر بجا طور پر شک کا اظہار کیا ہے۔ بلوچوں کے سینکڑوں قبائل میں ایک قبیلہ بھی ایسا نہیں ہے جو کسی عورت کے نام پر تشکیل دی گئی ہو۔ کالدیہ کے شہنشاہ بلوچ کی بادشاہ بیٹی سمی رامس جو آدھی دنیا کی بادشاہ تھی جس نے ہندوستان پر حملے کیے۔ اُس عظیم بہادر عورت کے نام پر کسی قبیلہ کی تشکیل نہیں ہوئی اور سردار اعظم میر چاکر خان رند کی عظیم جنگجو بہن بانڑی کے نام پر کوئی قبیلا نہیں بنا جو مردوں کے شانہ بشانہ میدان جنگ میں لڑتی رہی تھی تو پھر اس گمنام ''جتو'' کے نام سے کس خوشی میں قبیلہ کی تشکیل ہوئی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ ''جتو'' نام کا کوئی موضع ہوگا جہاں کے لوگ نقل مکانی کے بعد جتو کی نسبت سے جتوئی کہلائے ہوں گے اور یہ ممکن ہے کہ مفروضہ موضع اس جتو کے نام پر ہو۔ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

11۔ لاشاری سے میر رامن نہیں سردار میر گہرام نامدار ہوئے۔ جو سردار میر چاکر اعظم کے ہم عصر اور ان کے قبائلی حریف تھے۔ میر رامن سردار گہرام لاشاری کا بیٹا تھا۔ رند اور لاشاری قبائل کے درمیان لڑی جانیوالی طویل لڑائی کی آگ بھڑکانے والا بظاہر یہی میر رامن لاشاری تھا۔

12۔ پوٹنگر کی کم علمی ہے۔ تاتاری نسلیں وسطی ایشیائی ملکوں یعنی ترکمانستان، تاجکستان، قزاقستان، آذربائیجان وغیرہ اور روسی خطے میں اور کچھ افغانستان کے شمالی علاقوں میں

پھیل گئی ہیں۔ بلوچستان میں افغانستان سے آنے والے ہزارے تاتاریوں کے باقیات ہیں۔ اور چند مغل گھرانے ہیں۔ براہوئی کوئی نسل نہیں ہے بلکہ یہ بلوچ قبیلہ میروانی کے سردار گھرانہ ''براہو'' کی مرکزیت کے گرد جمع ہونے والے جنگجو گروہوں کا ایک وقتی جنگی اتحاد یہ تھا۔ جنہوں نے جدگالوں (سندھی بولنے والے بلوچ نسلی طائفے) سے جنگ لڑی۔ ''براہو'' کے جنگی اتحادی جو مختلف بلوچ قبیلوں کے لشکر تھے، براہو کی نسبت سے براہوئی مشہور ہوئے۔ نیز یہ قبائلی تشکیل 1665ء اور 1666ء کے درمیان ہوئی۔

براہوئی قبائل کی تاریخ کا براہوئی زبان سے، جس کا اصل نام ''کُردی'' اور ''کردگالی'' ہے، کسی قسم کا تاریخی رشتہ نہیں ہے۔ یہ نام ظاہر کرتا ہے کہ کُرد بلوچوں نے یہ زبان اپنے علاقوں کے سابقہ باسیوں سے اپنایا تھا۔ کُردی اور کردگالی نام سے قبل اس زبان کا نام تورَنک (TORAK) روایت کیا جاتا ہے۔

13۔ ''باروہی'' کا مفروضہ خیال رائے ہتورام نے اپنی تصنیف ''گل بہار'' اور ''تاریخ بلوچستان'' میں بھی پیش کیا۔

> ''روہی پہاڑ کو کہتے ہیں اور فارسی کا ''با'' یعنی ساتھ ہونا کے ہیں۔ اس طرح لفظ ''باروہی'' بمعنی ''پہاڑ والا'' یا ''پہاڑوں میں رہنے والا'' کے ہیں۔ چونکہ یہ لوگ قدیم وقت سے

پہاڑوں اوران کے دامن میں رہتے ہیں اس
لئے باروہی اور کثرت استعمال سے بروہی
کہلائے۔''

دنیا میں کہیں ایسانہیں ہوا ہے کہ ایک نام کا ایک حصّہ ایک زبان میں ہواور دوسرا حصہ کسی دوسری زبان میں۔ ہتورام کا ''باروہی'' با (فارسی) اور ''روہی'' (جدگالی) سے ملکر بنایا گیا ہے۔ اس کے لفظی معنی ''پتھر کے ساتھ'' بنتے ہیں جس سے مرادوہ ''پہاڑوں والا'' لیتے ہیں۔ قبیلوں کے نام ایسے بھونڈے طریقوں سے نہیں بنتے۔ اور نہ کہ نام زیادہ بگڑتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ زبرزیر کی حد تک بگڑ سکتے ہیں۔ باروہی کے مذکورہ مفروضہ کو معروف بلوچ مورخ سردار خان گشکوری نے بھی اپنایا اور لکھا کہ آج بھی سندھ کے لوگ بروہی کے معنی ''قلات کے پہاڑوں کے لوگ'' لیتے ہیں۔ (بلوچ قوم کی تاریخ'' اُردو ترجمہ انور رومان، حصّہ دوئم صفحہ 587)

شاید موصوف کو علم نہیں کہ کسی زمانے میں تمام سراوان بشمول کوئٹہ وغیرہ کیلئے ''کوہستان'' کا نام استعمال ہوتا تھا۔ اس نسبت سے پھرانہیں ''کوہستانی'' ہونا چاہیے تھا نہ کہ ''باروہی''۔ نیز لفظ ''بروہی'' بلوچستان میں مستعمل نہیں ہے۔ بلوچستان میں ''براہوئی'' بولا جاتا ہے۔ جسے سندھیوں کے لہجے میں ''بروہی'' ادا کیا جاتا ہے۔ سندھ میں لفظ ''براہوئی'' مستعمل نہیں ہے۔

14۔ براہوئیوں کا عقیدہ حقیقت پر مبنی ہے۔ ویسے بھی یہ عام فہم بات ہے کہ ہر شخص اور

ہر قبیلہ اپنے بارے میں غیر کے مقابلہ میں زیادہ اور بہتر جانتا ہے۔ نہ براہوئیوں کی تاریخ گم ہے اور نہ ان کے قبائل کی اصلیت اور نسب پردوں میں ہے۔ حتیٰ کہ ان کے گھر گھر کا شجرہ نسب تک موجود ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ یوروپی مصنفین براہوئی قبائل کو ''براہوئی'' زبان کی روشنی میں دیکھتے ہیں جو کہ تاریخی تحقیق کا مسلمہ اصول نہیں ہے۔ ''براہوئی'' تاریخ یا براہوئی اصلیت ایک الگ موضوع ہے اور براہوئی زبان ایک الگ موضوع۔ جو قبیلے آج براہوئی کہلاتے ہیں وہی قبیلے یا ان کے جدّ امجد 66-1665ء سے قبل براہوئی نہیں کہلاتے تھے اور اپنے اصل قبیلوں سے پہچانے جاتے تھے۔ اور وہ تمام بلوچ قبیلے ہوتے تھے۔ اور جس زبان کو انہوں نے اپنایا ہے 66-1665ء سے قبل اس کا نام ''گردی'' اور ''کردگالی'' ہوتا تھا۔ جہلاوان میں اس کا نام کردی ہوتا تھا بلکہ اب بھی بعض پہاڑ نشین لوگ اسے کردی ہی کہتے ہیں لیکن اب جانتے ہیں کہ اس کا نام براہوئی میں تقریباً بدل چکا ہے۔ اسی طرح سراوان میں اسے ''کردگالی'' بولتے رہتے ہیں۔ اب سراوان میں ''کردگالی'' مستعمل نہیں ہے۔ جہلاوان میں اسے ''گردی'' اس لئے بولتے رہے ہیں کہ یہ اپنے قدیم وارثوں سے گُرد بلوچوں کو منتقل ہوا۔ تب یہ گُردی کہلایا۔ جو بلوچی زبان آجکل مشرقی بلوچی کہلاتا ہے جسے سراوان کے رند، لانگو، بنگلزی، بولان کے کُچک، کلوہی، پھگ، بنگلانی وغیرہ اور دیگر مشرقی قبائل بولتے رہے ہیں کسی وقت گردبلوچوں کی زبان تھی اور کردوں کی زبان ہونے کے ناطے لوگ اسے ''کردگال'' یعنی کردوں کی زبان کہتے تھے۔ جو غیر کرد اس زبان کو اپناتا وہ کردگال کہلاتا تھا۔ وقت

گذرنے اور آبادی کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ جب موجودہ براہوئی زبان کردگالوں کے گھروں تک پہنچ گئی اور وہ اسے اپنانے لگے تو پھر اس کا نام کردگال طائفوں کی نسبت سے کردگالی یعنی ''کردگال'' لوگوں کی زبان، ہوگئی یہ نام اُس وقت تک برقرار رہا جب تک کہ کردگالی یا کردی 66-1665ء کے دوران تشکیل پانے والے براہو اتحادیہ (براہوئی) کے ارکان کے گھروں میں داخل نہیں ہوئی تھی۔ براہوئی کا نام پانے والے گروہوں کے گھروں میں بولی جانے کے بعد اس کا نام براہوئی میں بدلنا شروع ہوا۔ جس کا طویل سفر ابھی منزل کے قریب ہے۔

15۔ یوروپی مصنفین نے اس زبان کو دراوڑی زبانوں کے زمرے میں شمار کیا ہے۔ لیکن پوری زبان کو وہ دراوڑی ثابت نہیں کر سکے ہیں۔ بلکہ ان مصنفین کی اکثریت کا آن دی ریکارڈ فیصلہ ہے کہ دراوڑوں کی اصل زبان کے بارے میں کوئی علم نہیں کہ وہ کونسی زبان بولتے تھے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دراوڑوں کی کوئی ایک مخصوص زبان نہیں ہوتی تھی۔ وہ زبانوں کے ایک گروہ سے وابستہ تھے۔ جنہیں مختلف دراوڑ قبیلے بولتے تھے اور ان میں سے کوئی بھی زبان ''دراوڑی'' کے نام سے وجود نہیں رکھتا تھا۔ کوئی کنڑی کہلاتا تھا، کوئی ملیالم کوئی گونڈی وغیرہ۔ اور جس ''گرائمر'' کو تقریباً 70 فیصد بلوچی، 20 فیصد سندھی اور 10 فیصد ترکی اور عربی الفاظ نے بولنے اور سمجھنے کے قابل بنایا ہے۔ اس کے اصل وارث صدیوں قبل ہجرت کر گئے، مر گئے، مارے گئے اور جو کچھ بچ گئے وہ نئے آنے والوں میں مدغم ہو کر اپنا قبائلی شناخت کھو بیٹھے۔ انہیں موجودہ براہوئی بلوچوں اور براہوئی بولنے

والوں میں تلاش کرنا ایک حماقت یا بدنیتی اور بلوچوں سے تعصب رکھنے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے کہ براہوئی زبان میں ہندوستان کے دراوڑی علاقوں کی زبانوں کے الفاظ سے ملتے جلتے جو گنتی کے چند الفاظ ملتے ہیں وہ بلوچی زبان ہی کے توسط سے براہوئی میں داخل ہوئے ہیں۔ اور متعدد الفاظ جو سنسکرت ماخذ کے ہیں وہ سندھی زبان کے توسط سے آئے ہیں۔ جنہیں بغیر کسی دلیل اور ثبوت کے یکطرفہ طور پر دراوڑی الفاظ یا دراوڑی ماخذ سمجھا جاتا ہے۔

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ لفظ یا نام ''دراوڑ'' دنیا کے کسی زبان میں نہ استعمال ہوا ہے اور نہ معنی دیتا ہے ماسوائے بلوچی زبان کے جس میں یہ لفظ ہمیشہ سے موجود رہا ہے اور آج بھی مستعمل ہے۔ جس کے معنی ''اجنبی اور ''غیر مقامی کی مانند'' کے ہیں۔ دراوڑوں پر تحقیقی کام کرنے والوں نے بھی دراوڑ نام کے معنی ''اجنبی'' ہی فرض کر لئے ہیں۔

16۔ اے۔ ڈبلیو۔ ہیوگز اور ہنری پوٹنگر بلوچی زبان کے مکرانی بولی کو فارسی سے ناقابل انکار مماثل لکھتے ہوئے کہتے ہیں۔ کہ یہ فارسی کی روزمرہ شکل ہے۔ لیکن مشرق کی طرف آتے آتے اس کی فارسیت کمزور پڑتی جاتی ہے۔ اس کا صوتی تاثر درشت اور کرخت ہوتا جاتا ہے۔ اور یہ کہ یہ قدیم فارسی سے ماخوذ بتائی جاتی ہے۔ ہیوگز کہتا ہے کہ فارسی اور بلوچی میں جو فرق پڑا ہے، اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ بلوچوں کو الفاظ کے حروف بدلنے کی ایسی عادت ہے کہ اصل الفاظ اپنی ہیت اور شناخت کھو بیٹھتے ہیں۔ (دی کنٹری آف

بلوچستان از ہیوگز)۔

سراوان گزیٹر کے مطابق بلوچی زبان تکنیکی لحاظ سے ہند یوروپی زبانوں کے آریا زمرہ کی ایرانی شاخ سے متعلق بتائی جاتی ہے۔ ڈاکٹر گریئرسن بھی اسی نظریے کا ہے میجر موکلر اور کیل یونیورسٹی کے پروفیسر لسانیات ڈاکٹر اینڈریز کے مطابق یہ زبان ایرانی گروہ کی ایک آریائی زبان ہے اور پہلوئی کی بہن معلوم ہوتی ہے یا کم از کم ایسی زبان جو قدیم فارسی سے اُسی وقت علیحدہ ہوئی جب پہلوئی الگ ہو چکی تھی۔ اور مکران میں اثر پذیر ہوئی۔ اور اس حد تک اسے ایک اوریجنل زبان سمجھا جا سکتا ہے (انٹروڈکشن ٹو اے گرائمر آف دی بلوچی لینگویج، لندن 1897ء)۔

مسٹر ہیوگز کا یہ کہنا بجا ہے کہ بلوچوں نے جو الفاظ فارسی سے اپنائے ہیں ان کی پھر ہیت بدل دی ہے۔ وہ یہاں یہ بھول جاتے ہیں کہ ہر زبان کا اپنا ایک قومی مزاج بھی ہوتا ہے جس کا اپنا سانچہ ہوتا ہے جو اپنائے گئے الفاظ کو غیر محسوس طور پر اپنے سانچے میں ڈھال لیتا ہے پھر وہ الفاظ ایک الگ قومی رنگ اختیار کر کے اپنے اصل سے بیگانہ نظر آتے ہیں۔ فارسی نے بھی کئی عربی الفاظ اپنا کر انکی ہئیت بدل دی ہے جن پر صرف عربی کا گمان ہی کیا جا سکتا ہے۔ بلوچی میں فارسی الفاظ کا شامل ہونا اس خطے پر صدیوں تک فارسی زبان کی بطور سرکاری زبان بالادستی کا نتیجہ ہے۔ اور یہ الفاظ اگرچہ زیادہ ہیں اور عربی مزاج نے اکثر کی ہئیت بھی بدل دی ہے لیکن ان الفاظ کا کم از کم ستر سے اسی فیصد قدیم ٹھیٹھ بلوچی مترادف بھی موجود ہیں جنہیں تعلیم یافتہ اور شہری بلوچوں نے متروک

کے درجے پر پہنچا دیا ہے لیکن ان کا استعمال دیہاتی، غیر تعلیم یافتہ لوگوں اور خصوصاً تعلیم سے بے بہرہ عورتوں میں موجود ہے۔ ان کے علاوہ وہ قدیم الفاظ جو دونوں زبانوں میں معمولی سی فرق کے ساتھ موجود ہیں جنہیں فارسی دان فارسی کا کہتے ہیں اور بلوچی اسکالر انہیں بلوچی کا کہتے ہیں، دراصل قدیم زبان پہلوی سے دونوں نسلوں کے اخذ کردہ ہیں۔ اور پہلوی کے بنیادی الفاظ اوران کے تراکیب فارسی کی نسبت بلوچی سے زیادہ مماثلت رکھتے ہیں۔ بیشتر قدیم بادشاہی کتبے جو زند اور قدیم تر پہلوی زبان میں لکھے گئے بتائے جاتے ہیں۔ فارسی میں نہیں پڑھے جاسکتے لیکن 80 سے 85 فیصد تک بلوچی میں پڑھے جاسکتے ہیں۔ نیز دیکھئے حاشیہ نمبر 63۔

17۔ پچھلے صفحات میں ہم براہوئی کی تاریخی وضاحت کر چکے ہیں۔ اور بتا چکے ہیں کہ براہوئی (سترھویں صدی عیسوی کا براہو اتحادیہ) قبائل کا براہوئی زبان سے جس کا قدیم نام براہوئی نہیں بلکہ تورنگ اور پھر کُردی اور کُردگالی رہا ہے، کسی قسم کا تاریخی تعلق نہیں ہے۔ کُرد بلوچوں نے اس زبان کو جو ''تورنگ'' کہلاتا تھا اپنا کر اسے کُردی کا نام دیا۔ کُردگال بلوچوں نے اسے اپنا کر ''کُردگالی'' کا نام دیا۔ ان سے براہو اتحادیہ کے ارکان ''براہوئی'' نے اپنا کر اسے براہوئی کا نام دیا۔ اور اب جس گھرانہ یا قبیلہ نے اسے اپنایا ہے تو وہ لسانی حوالہ سے براہوئی کہلاتا رہا ہے۔ جہاں تک براہوئی قدامت کی بات ہے تو ہم پچھلے صفحات میں بتا چکے ہیں کہ 66-1665ء سے قبل نام ''براہوئی'' وجود نہیں رکھتا تھا۔ تحریر میں اٹھارویں صدی میں پہلی دفعہ یہ نام خان بلوچ میر عبداللہ خان کیلئے سندھی

تاریخ ''تحفتہ الکرام (فارسی) بخش اوّل جلد سوئم کے صفحہ 422 پر استعمال کیا گیا اور اُسے ''براہوئی خان'' لکھا۔اوراس کا شجرہ نسب یوں درج کیا:۔

''عبداللہ خان بن سمندر خان بلوچ براہوئی

زمیندار عمدہ سرحد قندھار''

ہتورام نے اپنی ''تاریخ بلوچستان''میں 1907ء سے براہوئیوں کی قدامت کا عرصہ تین سو سال لکھا ہے۔اس طرح 1665ء تک یہ عرصہ تقریباً ڈھائی سو سال بنتے ہیں۔اور یہی سن براہوا اتحادیہ کے گروہوں کی قبیلائی تشکیل کا سال ہے۔

18۔میسن کی معلومات انتہائی ناقص ہیں۔مشرق سے کوئی رند قبیلہ آیا نہیں ہے۔اور یہ پورے بلوچستان میں ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔اوران کی زبان جٹکی نہیں بلوچی ہے لیکن جٹکی بول سکتے ہیں۔

19۔ان کے معزز ہونے میں کوئی شک نہیں۔جہاں تک ان کو لوٹ مار کی طرف مائل لکھنے کے الزام کا تعلق ہے،دراصل یہ ایک شکست خوردہ انگریز افسر کے بغض کا اظہار اور ایک ردعمل ہے کیوں کہ رند قبائل انگریزی کیمپوں پر حملوں پر حملے کر کر کے ان کو زک پہنچاتے رہے تھے۔

20۔''انٹروڈکشن ٹو دی بلوچی لینگویج''میں میجر موکلر لکھتے ہیں کہ مکران کی زبان تلفظ، قوائدی ساخت اور محاورہ میں یقیناً ایرانی زبان ہے اور لسانی طور پر اپنے حصّوں میں یک رنگ ہے۔تلفظ مکران کے مختلف علاقوں میں ہلکا ہلکا مختلف ہے خصوصاً بلوچستان کے جنوبی

اور مغربی حصّوں میں۔ کچھ الفاظ یا ایک ہی قسم کے الفاظ کی مختلف اشکال کم وبیش علاقہ کے بعض حصّوں تک محدود ہیں اور یہ خصوصی بمعہ لغوی یا محاوراتی فرق کوہ سلیمان میں رہنے والے قبائل کی زبانوں میں اتنی نمایاں ہیں کہ وہ بلوچی کی عوامی بولی سے ذرا ہی بہتر ہیں۔ان قبائل کی زبان بھی یقیناً وہی زبان ہے لیکن انہوں نے اسے ادھورا حاصل کیا۔ مکران سے گذرتے وقت وہ بارہ سے پندرہ سال اس علاقے میں تھے۔اس دوران یہ ایسا بدلا جیسے عربوں یا شامیوں سے بدلنے کی توقع ہوسکتی ہے یعنی سامی حروف حلقی اور دیگر اصوات کے ساتھ جو کسی ایرانی زبان کے لئے بدیشی نہیں۔سلیمانی زبان میں ہم بہت سے ہندوستانی الفاظ بھی دیکھتے ہیں جو مکران میں استعمال نہیں ہوتے۔اور قوائدی ساخت کی ایک نحو (یا اس کی کمی) جو کبھی قدرے پریشان کن معلوم ہوتا ہے۔

مکران گزیٹر لکھتا ہے کہ مشرقی اور مکرانی بلوچی میں اتنا فرق نہیں ہے کہ ان میں سے ایک، دوسری بولی بولنے والوں کیلئے نا قابل فہم ہو۔مکرانی بلوچی میں فارسی کی تہہ اسے نرم، رواں اور سُریلی بنادیتی ہے اور یوں یہ لطیف احساسات اور شجاعت کے کارناموں کو اپنی مشرقی بہن کی نسبت بیان کرنے پر زیادہ قادر ہے۔مشرقی بلوچی میں موجود سندھی اور پنجابی الفاظ کا ملاپ اس کے لب ولہجہ کو قدرے سخت اور تلفظ کو زیادہ مشکل بنادیتا ہے۔گزیٹر مزید لکھتا ہے کہ مکرانی بلوچی کی مقامی بولیوں میں موکلر نے جن اختلافات کا ذکر کیا ہے وہ صرف ساحلی اور مندکی بلوچی میں نمایاں ہیں بمقابلہ اُس کے جو اندرون مکران بولی جاتی ہے۔اوّل الذکر زیادہ مشرقی بلوچستان اور پنجاب میں بولی

جانیوالی بولی سے ملتی جلتی ہے۔ اندرونی بلوچی اور ساحلی ومندی بلوچی کا طرہ امتیاز یائے معروف کی بجائے واؤ معروف کا استعمال ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدیم تر زبان مند میں اور ساحل پر بولی جاتی ہے۔ (ڈسٹرکٹ گزیٹر مکران)

یادرہے کہ اس زبان کا تذکرہ دسویں صدی عیسوی میں ابوالقاسم محمد بن حوقل نے مکران کے بلوچوں کے ضمن میں یوں کیا تھا ''مکران میں وہ فارسی اور مکرانی بولتے ہیں'' (المسالک الممالک)۔ گیارھویں صدی میں الادریسی نے لکھا ''مکران کے لوگ فارسی اور ایک ایسی زبان بولتے ہیں جو اس صوبے سے مخصوص ہے۔ فارسی کا ذکر انہوں نے بحثییت سرکاری زبان کے کیا ہے۔

21۔ خان قلات کا شمار براہوئی میں اس لئے کیا جاتا رہا ہے کہ احمد زئی خوانین کا جدّ امجد میر احمد ایلتازئی جھالاوان کی معروف لڑائی ''براہو جدگال جنگ'' میں میروانی قبیلے کے سردار خیل طائفہ ''براہو'' کا اتحادی تھا۔ جس کی کمان میں میر بجار براہو کے ہاتھ میں تھی۔ اس جنگ میں براہو طائفہ کے تمام اتحادی کمانڈروں کے نام سے نئے قبیلے تشکیل پاگئے۔ میر احمد ایلتازئی کے نام سے قبیلہ احمد زئی تشکیل پا گیا۔ تمام نئے قبیلے ''براہو'' اتحادیہ کی نسبت سے نئے نام ''براہوئی'' سے متعارف ہوئے۔ اسی جنگ میں فتح کے نتیجے میں میر احمد 1666ء میں قلات کے دوسرے دوَر کے پہلے خان کے طور پر منصب خانی پر متمکن ہوئے۔ مندرجہ بالا وجوہ کی بناپر وہ براہوئی خان قلات لکھے گئے ہیں۔

نیز دیکھئے اشاریہ نمبر 17۔

22۔ ''خون بہا'' پر جرگہ ایک قدیم بلوچی رسم ہے۔ جس میں متحارب فریقین کو سب سے پہلے سادات کی سربراہی میں معتبرین چند عرصے تک جنگ بندی پر راضی کرتے ہیں اور اس رضامندی کی باقائدہ قرآن پاک پر حلف لیتے ہیں۔ پھر دوران جنگ بندی میڑھ یا مصالحتی کمیٹی تشکیل دی جاتی ہے جس پر دونوں گروپوں کا اعتماد ہو اور وہ تحریراً انہیں ہر قسم کا فیصلہ کرنے کا اختیار دیتے ہیں اور ان کے فیصلوں کو تسلیم کرنے اور ان پر عملدرآمد کرنے کا اقرار کرتے ہیں۔ اس کے بعد کمیٹی فریقین سے فرداً فرداً مل کر ان کا بیان ریکارڈ کرتی ہے۔ اور مالی وجانی نقصانات کی تفصیل اکٹھا کر کے قبائلی اصولوں کے مطابق ان کی مالیت مقرر کرتی ہے۔ اس کے بعد فریقین کے بااختیار نمائندے نقصانات کا ازالہ کرنے اور فیصلہ کرنے مل بیٹھتے ہیں اور فریقین میں آئندہ کے لئے صلح کراتے ہیں۔ اس صلح کو مزید محکم اور دوستانہ بنانے کیلئے فوری رشتے کراتے ہیں۔ اور مزید خونریزی کے راستے بند کراتے ہیں۔ اور فریقین بلوچی قول اور قرآنی حلف کی مرتے دم تک پاسداری کرتے ہیں۔

23۔ جی۔ پی۔ ٹیٹ کا مذکورہ بیان اُس کا ایک مفروضہ ہے اور اس کی متعصب ذہنیت کا عکاس ہے۔ اس کا خاص مقصد انگریزی تسلط کے خلاف نبرد آزما بلوچ متحدہ قوت کو کمزور کرنا اور شیعہ بلوچوں کے اذہان کو آلودہ کرنا تھا۔ بلوچوں نے من حیث القوم حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو اپنا روحانی مرشد کہا ہے۔ بلوچی زبان کا کوئی شعر اور داستان ایسا نہیں ملیگا جس میں اللہ تعالیٰ اور محمد صلعم کی ثنا کے بعد حضرت علیؓ کی ثنا نہ ہو۔ وہ ہر بلوچ کا

روحانی مرشد ہے۔ بلوچی ادب اس کی گواہ ہے۔ سندھ اور پنجاب میں شیعہ مذہب کو پھیلانے والے بلوچ ہیں۔ میر چاکر خان رند کا بیٹا میر شہداد وہ پہلا شخص تھا جو رندوں میں دینی تعلیم سے آراستہ تھا اور جس نے پنجاب میں شیعہ مذہب کو پھیلایا۔ تاریخی تصانیف اس بات کی شہادت دیتی ہیں۔ ہاں البتہ بلوچوں میں چاہے شیعہ ہو یا سُنی، ایرانی شیعہ حکومت سے اُس کے بلوچوں پر بے انتہا ظلم اور بیجا غارتگری کے نتیجے میں سخت نفرت موجود رہا ہے اور یہ نفرت اُس کے مسلسل ظلم کرنے کا قدرتی ردعمل ہے جو ابھی تک جاری ہے اس نفرت کو شیعوں سے نفرت کا نام دینا انگریزی منافقانہ قلمی چال ہے۔

24۔ میسن کا یہ کہنا بھی غلط ہے۔ بلوچوں میں پیر، فقیر، مُلّا، سّید، مرشد سب موجود ہیں اور وہ بھی بلوچوں سے ہونے کی بناء پر انتہا پسند اور کٹر نہیں ہیں اور بہت روشن دماغ اور سلجھے ہوئے ہیں۔ البتہ ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ بلوچوں میں مذہبی تعصّب کم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ بلوچوں میں مذہبی تعصّب بالکل ہی نہیں ہے اگر کہیں ہے تو وہ انفرادی ہے۔

25۔ میسن کی بلوچوں کے علاقے میں مسجد نہ ہونے کی بات بھی غلط ہے۔ میسن کے اپنے دور میں بھی مسجدوں کی تعداد بے حساب ہوا کرتی تھی۔ جس کا تذکرہ اُس کے ہم عصر مصنّفین کی تصنیفات میں ملے گی۔

26-27۔ کئی فرقوں کی بات غلط ہے۔ ایک نمایاں اور قابلِ ذکر فرقہ مہدی ہے جو عبادات میں ''ذکر'' کرنیکی وجہ سے ذکری کہلاتا ہے بلوچوں میں کوئی مذہبی تعصب نہیں ہوا کرتا تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مسلمان اور ذکریوں میں رشتے ناطے ہوتے تھے اور

آپس میں نکاح بھی کرتے تھے۔ یوروپی دور میں مذہبی نفرت نہیں تھا۔ مسلمانوں کو 1970ء کے بعد معلوم ہوا ہے کہ ذکری مسلمانوں میں شمار نہیں ہوتے اور ان میں نکاح جائز نہیں ہے اس کے باوجود اس بنیاد پر اب بھی کوئی نفرت موجود نہیں ہے۔

جسے مصنف اٹک میں ظہور کرنے والا پیغمبر کہتے ہیں اُس کا نام مُلّا محمد تھا۔ وہ ''اٹک'' کا کوئی پیغمبر نہیں تھا بلکہ مہدی ہونے کے مدعی سید محمد جونپوری کا ایک مرید تھا اور خاران کے گاؤں اٹیک کا رہنے والا تھا۔ جوٹھہ کے مقام پر اُن سے مل کر ان کا مرید بنا تھا۔ جب سید محمد فرح کے مقام پر فوت ہوئے تو ان کے گھرانے کا ایک شخص ساجد، ملا محمد اٹیکی اور دیگر کے ہمراہ کیچ چلے آئے اور یہاں مہدوی دین کی تبلیغ کی۔ چند وقت کے بعد مُلّا محمد اٹیکی کو وہاں اپنا خلیفہ چھوڑ کر خضدار ضلع کے گریشہ کی ایک پہاڑی وادی میں رہائش کر کے ذکری دین کی تبلیغ کرنے لگے۔ پھر وہ وادی اُس کے نام پر کوچہ ساجد مشہور ہوا۔ اور ابھی تک اسی نام سے ہے۔ اسی کوچہ ساجد سے نکل کر گریشہ اور قرب وجوار میں آباد ہونے والے مہدوی یا ذکری پھر ساجدی مشہور ہوئے۔ جو اب بلوچوں کا ایک باعزت قبیلہ ہے۔ ساجدی سردار خیل کا سلسلہ نسب اسی ساجد اور اس کے اجداد تک جاتا ہے۔ جو داناپور کے باسی تھے۔

28۔ ان کی کوئی مسجد نہیں ہوتی، ذکر کے مخصوص کمرے ہوتے ہیں جنہیں وہ ''ذکر خانہ'' کہتے ہیں۔ ''کوہ مراد'' ان کیلئے ایک متبرک مقام ہے جسے وہ زیارت کہتے ہیں۔ وہاں ان کا سالانہ اجتماع ہوتا ہے جسے وہ آپس میں خفیہ طور پر ''حج'' کا مترادف سمجھتے ہیں۔ اس

پہاڑی کے ایک حصہ میں ملّا مراد گچکی عبادت اور ذکر کیلئے آکر بیٹھا کرتا تھا اسی نسبت سے اس کو کوہ مراد کہتے ہیں۔ اسی گچکی سردار نے جو اللہ داد گچکی سردار پنجگور کا بھائی تھا ذکری دین کو پھیلانے میں اہم کردار ادا کیا۔

29۔ یہ راس کی انگریزی ذہن کا ایک مفروضہ اور پروپیگنڈہ ہے۔ ان سادہ لوگوں کو نہ ہندومت کے بارے میں علم ہے اور نہ کسی وشنو اور اس کے اوتار کی اصطلاحات کو سمجھتے ہیں۔ انگریز کا زمانہ تو ایک صدی قبل تھا۔ وہ آج ایک صدی بعد بھی اس بارے میں کورے ہیں۔

30۔ یہ وہ حبشی غلام نہیں ہیں بلکہ پنجگور سے لائے گئے نقیب قبیلہ سے ہیں۔ ان سے صرف گھروں میں اور زمینوں پر کام لیا جاتا تھا اور انہیں خرچہ اور معاوضہ دیا جاتا تھا۔ اور یہ قدیم زمانے سے خوانین کے ہمراہ اور ان کی رعیت ہوتے تھے جو بلوچی میں ''خان ءِ اُلس'' کہلاتے رہے ہیں۔ چونکہ خوانین کا نسلی اور وطنی تعلق پنجگور سے تھا اس لئے وہ دیگر غلاموں کی نسبت ان آزمائے ہوئے نچلے طبقے پر زیادہ اعتماد کرتے تھے۔ اور وہ انہیں غلام نہیں سمجھتے تھے اور نہ انہیں غلامی کا احساس دلاتے تھے۔ یہ بڑے خدمتگار، وفادار اور غیرت مند لوگ ہوتے ہیں۔ رئیسانی سردار بھی اپنے قدیم تاریخی تعلق اور اعتماد کی بنا پر اسی قبیلہ کے خدمتگار رکھتے رہے ہیں۔ نیز چپاو میں لانے والے قیدیوں کا معاملہ الگ ہے۔ نقیب خدمتگاروں سے سلوک اپنائیت کا ہوتا تھا۔

جی۔ پی۔ ٹیٹ نے حیرت کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر پوٹنگر کا کہا صحیح بھی ہو تب بھی

ان کی تصدیق نہیں کی جا سکتی اور انہیں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

31۔ مذکورہ بلوچ قبیلے جھکرانی اور ڈومبکیوں کو ڈاکو اس لئے کہا گیا ہے کہ یہ انگریزی استعمار کے خلاف لڑ رہے تھے۔ خان بھی انگریزی استعمار کا خریدا ہوا پرزہ تھا جس نے مختلف بلوچ علاقوں کو اجارہ پر حکومت برطانیہ کو معاہدات کے ذریعے دیئے تھے۔ اور خان برائے نام خان تھا۔ تمام معاملات انگریزوں کے ہاتھ میں ہوتے تھے۔ اس لئے بلوچ بجا طور پر دونوں کو ایک غاصب حکومت سمجھ کر لڑ رہے تھے۔ دنیا میں جہاں بھی غلامی کے خلاف مزاحمت کی جاتی ہے تو وقت کے غاصب اور قبضہ گیر مزاحمت کرنے والوں کو ڈاکو اور دہشت گرد کا نام دے کر انہیں کچلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

32۔ جب جھکرانی رند ہوئے تو ڈومبکیوں سے کیسے جدا ہوئے۔ مصنف کے دور میں بھی جھکرانی، ڈومبکیوں کے حصے تھے۔ اور کچھی میں بود و باش رکھتے تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف ان کی متحدہ قوت کی مزاحمت کو توڑنے کیلئے جھکرانی قبیلہ کی اکثریت کو جیکب آباد ایریا کے جانی ڈیرہ میں منتقل کیا گیا اب بھی ان کی دو بڑی شاخیں درکھانی اور رودینانی ڈومبکی میں شامل ہیں۔

33۔ سردار بجّار خان، ڈومبکی قبیلہ کے سردار تھے اور وزیرانی طائفے سے تھے۔ بڑے جنگجو اور بہادر شخص گذرے ہیں۔ انہوں نے اپنے مسلّح جنگجوؤں کے ساتھ انگریزی سرکار کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ انگریزی کیمپوں پر بار بار حملے کر کے انہیں تباہ کر ڈالتے تھے۔ ان کا شمار گورے سامراج کے خلاف مسلسل لڑنے والے ہیروؤں میں کیا جاتا ہے۔

34۔ جھکرانی قبیلہ کہیں باہر سے نہیں آیا تھا بلکہ کچھی ہی میں اس کی تشکیل ہوئی ہے اور قبیلہ ڈومبکی بھی ایران سے آنے والا قبیلہ نہیں ہے اور نہ کہ ندی ڈومبک ایرانی بلوچستان میں ہے۔ یہ علاقہ قلات کے کوہستان میں ایک چھوٹی سی خوبصورت وادی ہے جو ناگاؤ پہاڑی سلسلہ میں کلتاچ (کلچات) کے مشرق میں واقع ہے۔ یہاں سے نقل مکانی کرنے والے رند اسی وادی کے نام کی نسبت سے ڈومبکی کہلائے۔

35۔ کہیری، افغان قبیلہ نہیں بلکہ سید قبیلہ ہے جو ایرانی بلوچستان میں موضع ''کہیر'' میں آباد تھا اور اس کے بُزرگ رندوں کے مرشد ہوتے تھے۔ جب رند قبائل نے مکران اور کچھی کی طرف نقل مکانی کی تو ''کہیر'' کے یہ سید گھرانے بھی ساتھ آئے۔ افغانوں میں نہ یہ قبیلہ پہلے تھا اور نہ اب ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات مصنف کو کسی افغان نے ہی لکھوایا ہے۔ یہ موضع ''کہیر'' کی نسبت سے کہیری کہلاتے ہیں۔

36۔ صحیح تلفظ گوریچانی ہے جسے مشرقی بلوچی میں گوریشانی ادا کیا جاتا ہے۔ یہ بلوچی نام گوریچ سے ہے جو شمالی ہوا کو کہتے ہیں۔ کوئٹہ اور گردونواح میں اسے کندھاری ہوا کہتے ہیں۔

37۔ یوروپی ہر اُس قبیلہ کو لٹیرے اور غارتگر کہتے ہیں جو ان کی حکومت کے خلاف مزاحمتی لڑائی لڑ رہے تھے۔

38۔ اُس کا نام گورش نہیں گوریچ تھا جو ایک معروف بلوچی نام ہے۔ نیز دیکھیں اشاریہ نمبر 36۔

39۔ یہ قبیلائی نام ''بشکانی'' اور ''جلّبانی'' ہیں جو کہ غلط العوام میں بشیکانی اور جلوبانی ادا کئے جا رہے ہیں۔

40۔ ممکن ہے کہ اس میں کچھ حقیقت ہو لیکن مکران میں جہاں بیسویں ہندی اور سندھی قبیلوں کی آبادکاری کے آثار موجود ہیں مذکورہ قوم کے کسی طائفہ یا شخصیت کی آبادکاری کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔ ان کے تمام قبیلائی نام بلوچی نام ہیں۔

41۔ اس طرح کی جبری نقل مکانیاں محض انگریز کے خلاف لڑنے والوں کی قوت کو توڑنے کیلئے کرائی جاتی تھیں۔

42۔ ''پنجک'' یعنی پانچواں حصہ۔

43۔ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے۔ مکران بلوچستان و سندھ کا باب الاسلام رہا ہے۔ اسلام سے قبل بھی عرب تجارتی قافلے اسی راستے سے آتے جاتے رہے ہیں۔ ایسی گذرگاہوں پر غیر ملکی لوگوں کی آبادکاری روئے زمین پر ہر جگہ نظر آتی ہے۔ اسلام کے بعد تو مکران مسلمان حکومتوں اور خلفا کے زیر حکمرانی رہا ہے۔ عرب حکمرانوں کے نمائندے اور عمال بشمول مکران پورے سندھ اور بلوچستان میں موجود رہے ہیں۔

44۔ مصنف کا مذکورہ بیان از خود اُس کی نادانی کا اظہار ہے۔ عرب نسل کی تمام خصوصیات کسی خالص عرب میں تو دیکھی جا سکتی ہیں لیکن کسی مخلوط یا الگ گروہ میں بعینہ نہیں ملینگی۔ لیکن یہ صاحب وہی خصوصیات میدوں میں تلاش کرتے ہیں جن کا عرب نسل سے دور کا بھی واسطہ نہیں رہا ہے اور پھر وہ خود انہیں اپنے ہی قلم سے نچلی ذات کا

نمونہ بھی لکھتے ہیں۔

45۔مکران کے چپے چپے پر عربوں کے احداث کئے ہوئے کاریز پھیلے ہوئے ہیں کئی قدیم کاریزات، جو اب قدیم آثار کے طور پر نظر آتے ہیں، خصوصی طور پر ''عرب'' کہلاتے ہیں۔اس کے علاوہ کئی عرب قبائل کے گروہ مکران میں بس بھی گئے ہیں۔جیسے سعیدی، بُردی جسے بعض مصنفین نے بروہی بنادیا ہے۔قحطانی، قرمطی، بَرَ وغیرہ۔علاوہ ازیں اکثر بلوچوں میں قدیم بلوچی شاعری کی پھیلائی گئی ''میر حمزہ'' والی روایت بھی موجود ہے۔ جسے بطور حوالہ پیش کرتے ہیں۔کئی قدیم عرب قلعے بھی ایسی روایتوں پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں۔جیسے کہ کیچ میں گاؤں جوسق جو عربی لفظ ہے اور جس کے معنی ''قلعے'' کے ہیں۔ساحلی علاقے میں موجود بعض عربی نام بھی عرب آبادی اور اثر ونفوذ کا اشارہ دیتے ہیں جیسے راس جُڈی، راس ملان، راس بیلہ، راس مواری وغیرہ۔''راس'' عربی لفظ ہے جو سطح زمین سے اونچے مقام کیلئے استعمال ہوتا ہے۔اس کے لغوی معنی ''سر'' اور ''چوٹی'' کے ہیں اور اُس زمین کے ٹکڑے کیلئے بھی بولا جاتا ہے جو پانی میں دور تک چلا جائے۔اور یہ بھی ظاہر بات ہے کہ ایک کی عادات واطوار بھی دوسرے پر انداز ہوتے ہیں۔علاوہ ازیں نسلی بلوچ اور عرب دونوں سامی نسل سے ہیں ان کئی عادات مشترک ہیں۔اس میں حیرانی کی کوئی بات نہیں ہے۔دنیا میں ہزاروں سالوں سے جاری قومی مسافرتوں اور انقلابات کے نتیجے میں کسی بھی ملک میں ایک خالص نسل کی بقا کی امید رکھنا بذات خود ایک جہالت ہے۔

جہاں راس کے تجزیے کا حوالہ ہے اُس کی بھی کئی تاریخی تہذیبی اور نسلی وجوہات ہیں۔ لیکن مکران کے بلوچوں اور براہوئی بلوچوں میں جن تفاوتوں کا ذکر راس نے کیا ہے وہ اتنے گہرے نہیں، جس طرح ان کا پروپیگنڈہ کیا جاتا ہے۔ مکران کے نسلی بلوچ خون اور کلچر کو کئی بیرونی آبادکاروں نے متاثر کیا ہے۔ جن میں عراق اور راومان کے عرب، کیپسئن کی اوغز نسل ریس، ٹرکی سے آنے والے رند، ہندوسندھ کے جاٹ اور کشمیر کے گجر و دیگر قبائل شامل ہیں۔ جبکہ براہو اتحادیہ کے بلوچ مرکزہ کے گرد جمع ہونے والے مختلف مخلوط نسل طائفے ایک ایسے خطے میں پروان پڑھے جہاں صدیوں تک ہندی یا ہندو تہذیب حاوی تھی، ہندو نسل کے جاٹ اور تورانی ترکوں اور عرب حملہ آوروں کا کلچر پروان چڑھا تھا جن میں خراسان کے قبائل کی نسلی خصائص کی آمیزش بھی تھی جس کی آب وہوا بھی مکران کے آب وہوا کے متضاد رہی ہے۔ یہ اور ایسے کئی عوامل متذکرہ نام نہاد تفاوت کے اسباب نظر آتے ہیں لیکن یہ تفاوتیں بلوچی تہذیبی فریم ورک کو متاثر نہیں کر سکی ہیں۔

46۔ مصنف کو یقیناً یہ علم نہیں تھا کہ ''میروانی'' قبیلہ ہی دراصل براہو اتحادیہ کا مرکزہ رہا ہے۔ بیزنجو، اسی اتحادیہ کا ایک رکن تھا۔ تفصیل کیلئے دیکھئے حاشیہ نمبر 12۔

47۔ رند قبائل اپنے کو اُس بے بنیاد روایت کی بنیاد پر عربی نسل گردانتے ہیں جس کے مطابق انہیں ''میر حمزہ کی اولاد'' کہا گیا ہے لیکن اس شعری روایت میں یہ صراحت موجود نہیں ہے کہ میر حمزہ حضور صلعم کے عم ''امیر حمزہ'' تھے۔ یہ انہوں نے ازخود سمجھ رکھا ہے۔

رند قبائل کے اوّلین شجراتی اور قبیلائی نام زیادہ تر تُرکی نام ہیں۔اور ان کے شجرہ نسب کا اوّلین جدّ امجد ''اَلمش رومی'' ترکستان کا ایک بادشاہ گذرا ہے جو تُرکی کے شاہی شہر اناطولیہ کے موضع ''روم'' کا باشندہ تھا۔اسی روم گاؤں میں ان کا قدیم قلعہ ''اَلمش دزّ'' خستہ حالت میں تیمور لنگ تاتاری کے اناطولیہ پر قبضہ کے وقت موجود تھا جس میں تیمور نے گرفتار حکمرانوں، سرداروں اور اپنے مصاحبوں کو کھپایا تھا اور اس کے ایک خستہ حصے میں اپنے اصیل گھوڑوں اور ان کے خادموں کو ٹھہرایا تھا۔ مذکورہ بالا انکشافات رندوں کو عرب نسل نہیں ترک نسل ثابت کرتے ہیں۔ نیز رندوں کے کسی شجرہ نسب میں ''میر حمزہ'' کا نام نہیں ملتا۔البتہ رئیس قبائل کے شجرہائے نسب میں حمزہ کا نام آتا ہے جیسے کیچ و پنجگور کے رئیس،خوانین قلات،میروانی،ہوت وغیرہ۔

48۔مُلاّئی،کوئی قبیلہ نہیں ہے۔ یقیناً انہوں نے ذکری فرقے کے پیشواؤں کا نام سنا ہے۔مُلاّئی انہیں کہا جاتا ہے اور یہ ملاّئی کسی قبیلہ سے بھی ہوسکتا ہے بشرطیکہ وہ ذگری فرقہ کا ہو۔

49۔یہ نام ''کورائی''،نہیں کُہدائی'' ہے یہ بنیادی طور پر پنجگور کا رئیس قبیلہ ہے۔کُہدا'' کاریز کے مہتمم اور سررشتہ مال کو کہا جاتا ہے۔مذکورہ کہداؤں کی اولاد کہدائی کہلائے۔ کولواہ اور دشت کے کُہدا پنجگور ہی سے جانے والے رہے ہیں۔بعض مصنفین نے انہیں رند نسل لکھا ہے جو غلط ہے کیونکہ پنجگور میں قبیلائی لحاظ سے نہ پہلے رند ہوتے تھے اور نہ اب ہیں۔

50۔ جدگال، سندھ سے آنے والے نہیں بلکہ لوٹنے والے تھے جن کے اباواجداد مغربی بلوچستان (ایرانی) کے دشتیاری سے سندھ نقل مکانی کر گئے تھے۔ سندھ میں رہنے کی بنا پر ان کی زبان بلوچی سے بدل کر سندھی ہوگئی تھی۔ بلوچ، سندھیوں کو جٹ اور ان کی زبان اختیار کرنے والے بلوچ کو جدگال کہتے ہیں جو بنیادی طور پر جٹگال ہے۔ چونکہ ایرانی بلوچ فارسی زبان کے اثر کی وجہ سے ''ٹ'' نہیں بول سکتے اس لئے جٹگال، ان کے لہجے میں جٹگال سے جدگال بن جاتا ہے۔ یہ چند جدگال گھرانے چند نسلوں بعد واپس مکران لوٹ آئے تھے۔

51۔ کلمتی، سرحد حلب (ایران سے متصل ترکی کی سرحد پر واقع) سے کلمتی نہیں کہلاتے تھے بلکہ کلمت (پسنی کا موضع) میں آباد ہونے کے صدیوں بعد وہاں سے نقل مکانی کرنے والے کلمتی کہلائے۔ یہ سارے رند نہیں تھے۔ بلکہ ان میں رئیس، ہوت، جت ودیگر بھی شامل تھے۔

52۔ ''براھوئی'' کوئی نسل نہیں ہے بلکہ جھلاوان کے گاؤں سوراب کے بلوچ قبیلہ میروانی کے سردار خیل طائفہ ''براھو'' کے، جدگال اور جٹوں کے خلاف بنائی گئی ایک جنگی اتحادیہ تھا۔ اس اتحادیہ کا ہر رکن بعد میں ایک الگ قبیلہ بنا۔ جن کی تشکیل دونوں قبائل کے مابین جنگ کے اختتام پر 166-1665ء میں ہوئی۔ براھوئی نہ کوئی نسل ہے اور نہ اس نام سے کوئی قبیلہ موجود ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے اشاریہ نمبر 12 اور 14۔

53۔ کٹواری، نامی بھی کوئی قبیلہ وجود نہیں رکھتا۔ البتہ رئیس قوم کا ایک طائفہ ''کٹور''

(کٹ ءُ ور) موجود ہے۔ جس کا تاریخی نام "کٹوہر" ہے۔ یہ طائفہ کچھی میں ایک قبیلہ کے طور پر موجود ہے۔ "کٹوہر" کو کٹ وَر اِس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ کسی حکمران کو مالیہ وغیرہ نہیں دیتا تھا۔ اس بنا پر لوگ انہیں "کٹوہر، کٹ ور" کہتے تھے جس کے معنی کٹوہر، خود کمانے خود کھانے والا" کے ہیں۔ نیز اس قبیلہ کا براہوئی قبائل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مکران گزیٹئر نے انہیں رند بتایا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

54۔ گوادر کے مہدی زئی بنیادی طور پر بڑے قبیلہ "سنگر" کا طائفہ رہا ہے لیکن ابھی اُس کی حیثیت الگ قبیلے کی ہے۔ سنگر قبیلہ سے ہونے کے ناطے یہ بُلفت قبیلہ ہے، بلفت قبیلہ کی بعض شاخوں کو جٹکی زبان بولنے کی وجہ سے جدگال کہا جاتا ہے۔ کسی وقت یہ قبیلہ اوراس کے طائفے پورے جھلاوان پر چھائے ہوتے تھے۔ گوادر کے لوگوں کا کہنا ہے کہ سنگر کا یہ طائفہ کسی وقت مہدی پہاڑ کے پہلو میں رہتا تھا اسی نسبت سے یہ مہدی زئی کہلاتے ہیں۔

یہ نام "لگوری" نہیں "لگور" ہے۔ یہ بڑے قبیلہ نوحانی کا ایک طائفہ ہے۔ نوحانی کئی زمانوں سے مکران میں وجود رکھتے ہیں۔ یہ سندھ سے آئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ مکران سے سبّی، کچھی اور سندھ گئے ہیں۔ کسی وقت سارا قبیلہ "لگور" (بزدل) کہلاتا تھا۔

55۔ واڑیلہ، بھی سندھ سے آئے ہوئے نہیں ہیں بلکہ وڈھ ضلع خضدار کے موضع "واڑ" کے بیزنجو اور مینگل ہوتے تھے جن کے چند گھرانے نقل مکانی کر کے گڈانی، اور ماڑہ اور پسنی میں آباد ہوئے اور اُن علاقوں میں واڑ کی نسبت سے واڑیلہ یعنی "واڑ والا" مشہور ہوئے۔ ان

واڑیلوں میں نوشیروانی قبیلہ کے محمودانی طائفہ کے گھرانے بھی شامل رہے ہیں۔

56۔قبیلہ ''بردی'' کا بھی براہوئی قبائل سے کوئی تعلق نہیں رہا ہے۔یہ عربی نسل قبیلہ ہے جو جیونی میں آباد تھا۔دسویں صدی عیسوی میں ابن حوقل بغدادی نے کرمان کے قرب وجوار میں بودوباش رکھنے والے کئی قبائل کے ساتھ اس قبیلہ کا ذکر ''زم بُردی'' کے الفاظ سے کیا ہے۔اس بردی کو کتاب ''سرزمین بلوچستان'' کے مصنف مولائی شیدائی نے ''بروہی'' بنا کر صفحوں کے صفحے مفروضوں اور بے بنیاد جھوٹے حوالوں سے بھر دیئے۔

بردی قبیلہ موجودہ وقت میں زیادہ تر سندھ میں آباد ہے۔بعض مصنفین نے بردی اور بلیدئی کو ایک قبیلہ لکھا ہے جو غلط ہے۔ابن تغری بردی، اس قبیلے کا مشہور مورخ گذرا ہے جس کا انتقال 1467ء میں ہوا۔اُس کی مشہور کتاب ''بخوم'' ہے۔اُس کا والد تغردی بردی، تیمور لنگ تاتاری کے حملے کے دوران دمشق کا نائب سربراہ تھا۔

57۔ ''شیہی'' نام سے کہیں بھی کوئی قبیلہ وجود نہیں رکھتا۔البتہ قبیلہ ''شیخ'' ہے جو دو نسلوں سے وابستہ ہیں۔ایک شیخ نسلاً عرب ہیں اور اپنے کو سیّد کہتے ہیں جو انتہائی معزز اور قابل احترام سمجھے جاتے ہیں۔ان کے اجداد میں سے کئیوں کو بُزرگی کا منصب نصیب ہوا ہے۔

ان کا مرکز گوادر کا پلیری ہے دوسرے شیخ قبیلہ کچکی سے ہیں جو نیم بلوچ اور نیم راجپوت قبیلہ ہے۔یہ راجپوت سکھ ہوتے تھے جو انڈیا سے مکران کے پنجگور کی وادی کچک آئے تھے اور بعد میں ذکری (مہدوی) اور مسلمان ہو گئے تھے۔مکران میں دونوں شیخ بلوچی لہجے میں ''شئے'' کہلاتے ہیں شاید مصنف کی مراد ان شیئوں سے ہے۔

58-59۔ متذکرہ ''کھوسگی'' اور ''بوری'' کے نام سے بھی کوئی قبیلہ وجود نہیں رکھتا۔ البتہ ''کھوسگ'' قبیلہ ہے جو بلوچستان کے علاوہ سندھ اور پنجاب میں بھی پھیلا ہوا ہے۔ پنجاب میں انہیں کھوسہ اور سندھ میں ''کھوسو'' کہا جاتا ہے۔ مصنف کی مراد یقیناً یہی قبیلہ ہے لیکن ''بوری'' قبیلہ کوئی نہیں ہے۔

60۔ ''بہاری'' نام کا بھی کوئی قبیلہ وجود نہیں رکھتا۔

61۔ ''بیاضیہ'' فرقہ، مسقط میں موجود ہے اور گوادر کے مسقطی عرب عمال اور ان کا عملہ اسی فرقہ کے پیروکار ہوتے تھے۔

62۔ ملاحظہ کیجئے اشاریہ نمبر 16 اور 20۔

62-A۔ ہندی الفاظ، بلوچی زبان میں ہندی اور کشمیری قبائلی گروہوں کی وساطت سے داخل ہوئے ہیں جو اسلامی دور کی ابتداء میں پورے بلوچستان سے لے کر عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔ بیسویں گروہ اپنے قدیم قبائلی ناموں سے بلوچستان کے چپے چپے میں آباد ہوئے تھے اور ان کی باقیات اسی سرزمین پر بلوچ قبیلوں میں مدغم ہو کر اپنی قبائلی حیثیت کھو بیٹھے۔ ان کی آبادکاری کے آثاران کے مواضع کی صورت میں جا بجا موجود ہیں جو اُن کے قبیلائی اسماء لئے ہوئے ہیں۔ مثلاً پیشین، مار، مور، مشکی، گھنہ، کھٹان، نورگامہ، بٹ، گوڈ، ڈاہر، ناگ، کوروان، بھاگنانی، کلمانی، کشان، بابا، وندر، ہب، کوچہ، دیول، دازہ، ڈنڈا، کلو، بٹو، ونگو، کوشک، کوتر، سلطان، بالیچہ، کپّر، حلوائی، گورو، دادر، پروار، جیو، چھڈ، لنگہ، ڈینگر،، ڈڈھے، کنٹ، سانو، کاشی، ماڑی، کسانہ، مُولہ، سوڈ، چبّ، نارُو، باگڑ،

حر، سلاچ، جھالوار، کنجر، بیدی، آوار، بیلا اور دوسرے بہت سارے مواضع۔ بلوچی زبان نے جتنے الفاظ ہندی قبائل کے ذریعے اپنا لئے جو روزمرہ بول چال کی غیر محسوس میراث ہیں لیکن ان کے قدیم ٹھیٹھ بلوچی مترادفات بھی موجود اور محفوظ ہیں۔ جو کسی بھی ادبی تحریکات کے نتیجے میں میں دوبارہ ان کی جگہ لے سکتے ہیں۔ اور ان الفاظ کی بلوچی بدری کا نتیجہ بلوچی زبان اور ادب کیلئے زیادہ تکلیف دہ نہیں ہوگا۔

63۔ ملاحظہ کیجئے اشاریہ نمبر 50۔

64۔ بلوچی میں عربی الفاظ کافی داخل ہو گئے ہیں لیکن بغیر کسی تحقیق کے یہ ثابت نہیں کیا جاسکتا کہ یہ الفاظ فارسی ہی کے ذریعے بلوچی میں درآئے ہیں۔ ایسے بے شمار عربی الفاظ بلوچی میں، بلوچی رنگ میں مستعمل ہیں جو فارسی میں موجود نہیں ہیں۔ جس سے اس خیال کو تقویت ملتی ہے کہ بلوچی میں یہ الفاظ بلوچستان میں عرب قبیلائی گروہوں کی آبادکاری کے دوران بلوچی میں منتقل ہوئے۔ گذشتہ صفحات میں ہم دکھا چکے ہیں کہ کون کون سے عرب قبائلی گروہ بلوچستان میں سکونت کر چکے تھے جن کی آبادکاری کے ثبوت ان کے قبائلی ناموں کے قلعے اور مواضع ہیں۔ ایسے الفاظ کی چند مثالیں درج ذیل ہیں:

عربی	بلوچی	فارسی
لَعَب	لِعیب (لئیب)	بازی
بواد	پواد	وادی
قبر	قبر	گور

دَعاہ	داہیہ	فریاد
ضاو	ضاہ (زاہ)	دشنام
بَدر (چودھویں کا چاند)	بدرو	ماہ چہاردہ
	(چودھویں رات کے چاند جیسا)	
مکر	مکر	فریب
بَرّ	بَرّ	بیابان
بِنا	بِناہ	آغاز
حَلال	حِلار	روا
ہریسہ	. ہریسہ	گوشت گندمی
دابہ	دابّہ	جانور
میر، امیر	میر، امیر	سردار، دولتمند
زیارت	زیارت	زیارت گاہ
جُہر	جار	آوا
		(آواز کا مخفف، بانگ)
طاس	طاس (تاس)	آبخورہ
طباق	طبق (تبنک) •	رَکابی
بلّا (کیوں نہیں، ایسا ہی)	ہلہ، ہلہ چوں	چرانہ، ہمیں طور

وام	وام	فارسی میں اس کیلئے لفظ نہیں ہے وہ قرض استعمال کرتے ہیں جو عربی ہے۔
ذُریت	ذُریات	خاندان
مَنّی	مَنی	اَزمن
شِعب	شیپ ،شیف	شیلہ
شئے	شئے	چیز
عاجز	عاجز	ناچار
طَعَم	طام (تام)	مزا
قحبہ	قحبگ	بدکار

اور دیگر بے شمار الفاظ جو فارسی میں موجود نہیں رہے ہیں۔ جو اس دعوے کا ثبوت ہیں کہ عربی الفاظ بلوچ اور عرب قبائل کے براہ راست تعلقات اور میل جول کا نتیجہ ہیں۔

64۔اس میں کوئی شک نہیں کہ بلوچی نے بے شمار فارسی الفاظ کو اپنے بلوچی رنگ میں رنگا ہے لیکن اُس کے اپنے الفاظ و اصطلاحات بھی موجود ہیں جو فارسی تعلیم سے بے بہرہ اور غیر متاثر بلوچ طبقے میں مروج ہیں۔اور جن کا فارسی کے جدید یا قدیم لغت سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔البتہ ایک ایسی مختصر لغت موجود ہے جو بلوچی اور فارسی دونوں میں معمولی فرق

کے ساتھ مستعمل ہے لیکن وہ فارسی زبان سے اخذ کردہ نہیں ہے بلکہ اس کا ماخذ قدیم پہلوی زبان ہے جس سے مذکورہ دونوں زبانوں نے استفادہ کیا ہے۔

فارسی زبان پرستوں کا قدیم کتبات (کُتبہ کوہ، بیستون، کتبہ تخت جمشید، نقش رستم ،کتبہ شہنشاہ خسرو) کے بارے میں دعویٰ ہے کہ وہ قدیم پارسی میں تحریر کئے گئے ہیں۔ جبکہ فارسی دان ان کتبات کو فارسی میں نہ پڑھ سکے ہیں اور نہ سمجھ سکے ہیں۔ جبکہ انہیں موجودہ بلوچی زبان میں آسانی سے پڑھا جاسکتا ہے۔ ان میں موجود الفاظ فارسی کی نسبت بلوچی اور کردی زبانوں سے زیادہ قربت رکھتے ہیں ان میں پچاس فیصد سے زیادہ الفاظ موجودہ بلوچی زبان میں معنی دیتے ہیں لیکن فارسی کیلئے وہ اجنبی ہیں۔ اس طرح یہ کُتبے ثابت کرتے ہیں کہ بادشاہوں کی قدیم تحریری زبان فارسی نہیں بلوچی رہی ہے اور فارسی اسی قدیم بلوچی سے نکلی ہے۔ ممکن ہے اُس دور میں اس کا نام بلوچی کی بجائے کچھ اور ہو۔

"بلوچی زبان وادب کی تاریخ کے مصنف میر شیر محمد مری مذکورہ موضوع پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "بعض لوگ یہ دعویٰ کیسے کرسکتے ہیں کہ بلوچی زبان، فارسی سے نکلی ہے۔ دوسرا سوال کہ کہ ہخامنشی دور کے کتبوں کی تحریر موجودہ دور کی فارسی زبان کی پرانی صورت ہے، درست نہیں ہے۔ کیوں کہ اگر کوئی عالم زبان،

بلوچی، کردی اور زرتشتی زبانوں کا ماہر ہو اور ان زبانوں کے ادب سے پوری واقفیت رکھتا ہو تو وہ کبھی یہ دعویٰ نہیں کرے گا کہ موجودہ پارسی جو عربی لبادہ میں ملبوس ہے، ہخامنشی دور کے کتبوں کی پُرانی صورت ہے بلکہ ماہرین یہ کہیں گے کہ ہخامنشی کتبوں کی زبان ایرانی زبان ہے جو بلوچی، کُردی، لُری اور زردشتی زبانوں سے مشابہت رکھنے وکی وجہ سے ان سے زیادہ نزدیک ہے اور انہی زبانوں کے ساتھ قرابت داری رکھتی ہے۔'' (صفحات 37-36)۔

''جب ہم ان کتبوں کی زبان پڑھتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ اس زبان کے الفاظ موجودہ بلوچی زبان کے الفاظ کے ساتھ زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔'' (صفحہ 37)۔

''ان کتبوں کے الفاظ، افعال، مصادر موجودہ بلوچی زبان سے مشابہت رکھتے ہیں لہذا ان

حقائق کی بنا پر ہمیں ان دونوں آرا سے
اختلاف ہے کہ ان کتبوں کی زبان قدیم پارسی
ہے اور بلوچی زبان اس پارسی زبان سے نکلی
ہے اور اس کی ایک ذیلی شاخ ہے۔''
(صفحہ 37)۔

65۔ وہ کوئی کمبرانی حاکم نہیں تھا بلکہ خوانین بلوچ کا جدّ، حاکم پنجگور و سرحد (افغانستان، پاکستان اور ایرانی سرحد کے سنگم پر واقع رباط سے بطرف مغرب تا حد سرحد کرمان) اور فاتح قلات وزہری ''میر کمبر رئیس'' خان اوّل تھا جس کا تذکرہ ''انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا'' نیلسن انسائیکلو پیڈیا، جلد سوئم، ہنری پوٹنگر کے ''سفرنامہ سندھ و بلوچستان'' اور ''ابوالفضل کے ''آئین اکبری'' میں کیا گیا ہے۔ میر کمبر رئیس پر تفصیلی حالات کے لئے ملاحظہ کیجئے ''کمبران'' مطبوعہ رئیس آنی پبلیشرز کوئٹہ۔ نیز دیکھئے موضوع ''بُرز کوہی''۔

66۔ مصنف کا یہ کہنا غلط اور بے بنیاد بات ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو وہ ضرور کوئی مثال پیش کرتا یا انگریزی ریکارڈ سے جس میں بیسویں واقعات کے حوالے اور مثالیں موجود ہیں، کوئی حوالہ پیش کرتا۔ جبکہ اس نے ایسا نہیں کیا ہے اور ایک بے بنیاد بات کو پروپیگنڈے کے طور پر پیش کیا ہے۔ خان ایک ملک کا سربراہ ہوتا تھا۔ اور ملک میں باقاعدہ عدالتیں ہوتی تھیں۔ حزب اقتدار اور حزب اختلاف ہوتے تھے۔ مختلف آرار کھنے والے اور مزاحمت کرنے والے معتبرین اور قبائل ہوتے تھے۔ جو کسی بھی غیر رسمی اور غیر قانونی

اقدام کی مزاحمت کرتے تھے۔ ہر جائز و ناجائز اقدام خان کی مرضی پر نہیں چھوڑے جاتے تھے۔ اور نہ کہ خان کسی مقتول کے وارثوں کے دباؤ پر جھکتا تھا۔ رسوم و روایات سے بے خبر شخص ہی ایسی باتیں گھڑ سکتا ہے۔

67۔ یہ بھی غلط اور خوانین کی قائم کردہ شرعی قاضی عدالتوں سے مصنّف کی لاعلمی ہے یا پھر اس نے جان بوجھ کر یہ سارا کچھ سپرد قلم کیا ہے۔ مندرجہ بالا دونوں بیانات پر جی۔ پی۔ ٹیٹ نے حیرت کا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ اگر پوٹنگر کا کہا صحیح بھی ہو تب بھی ان کی تصدیق نہیں کی جا سکتی اور انہیں ثابت نہیں کیا جا سکتا۔

68۔ ''براہوئی'' سترھویں صدی عیسوی کے وسط میں تشکیل شدہ چند بلوچ قبائل اور لشکروں کا ایک اتحادیہ تھا۔ جو جٹوں اور جدگالوں کے خلاف لڑائی کے نتیجے میں وجود میں آیا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے ہماری کتاب ''براہو جدگال جنگ ءِ شیئر'' اور ''بلوچ اور بلوچستان، چند تاریخی گوشے'' مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ۔ نیز دیکھیں حاشیہ نمبر 12۔

69۔ بلوچ کے بارے میں مصنّف کی معلومات زیرو ہیں۔ بلوچ قوم سینکڑوں سال قبل مسیح سے موجود ہے اور اُس وقت سے اُس کے سینکڑوں قبیلے تشکیل پاتے اور معدوم ہوتے آرہے ہیں۔ جن تین قبیلوں سے وہ بلوچ نسل یا قوم کو برآمد کرتا ہے وہ سولہویں صدی کے تشکیل شدہ قبیلے ہیں۔ ناہروئی اور مگسی مخلوط طائفوں پر مشتمل علاقائی نسبت رکھتے ہیں جبکہ رند قبیلہ تُرک نژاد قبیلہ ہے اور اِدغامی بلوچ قبیلہ ہے۔

70۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے حاشیہ نمبر 64۔

71۔ملاحظہ کیجئے حاشیہ نمبر 23۔

72۔مصنف کا کہنا ان کی بلوچ قبیلائی تنظیم و تشکیل کے تاریخی اصولوں سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔کسی قبیلہ کے نام کی وجہ تسمیہ مہمل نہیں ہے۔ہر نام کے پس منظر میں ایک تاریخ یاایک توضیح ہے۔

73۔قبیلہ کمبرانی، بانی حکومت میر کمبر رئیس سے منسوب نہیں ہے۔ بلکہ براہو جدگال جنگ کے ایک جنگجو ہیرو میر کمبر کہدائی سے منسوب ہے جس کی کمان میں احمد زئی خوانین کے جدّ امجد میر احمد ایلتازئی،شاہ بیگ ایلتازئی اور دوسرے اپنے لشکروں کے ہمراہ لڑے تھے۔اُس کے اتحادی اُس کی نسبت سے کمبرانی کہلائے۔

74۔محمودانی قبیلہ،مصنف کے کہنے کے برخلاف خان قلات میر محمود خان احمد زئی سے منسوب نہیں ہے۔نہ اُس کے نام سے کوئی قبیلہ یا طائفہ تشکیل پا گیا ہے۔محمودانی قبیلہ بنیادی طور پر نوشیروانی قبیلہ کی شاخ ہے۔اس کے کچھ حصے بیزنجوؤں میں بھی شامل ہیں اور کچھ حصے ساجدی قبیلہ میں شامل ہیں۔ جو طویل ہمسایگی اور غمی خوشی میں شرکت کی بنیاد پر ہیں۔نسلاً یہ نوشیروانی قبیلہ کا طائفہ ہے۔

75۔یہ بھی غلط ہے۔کمبرانی اپنے ہمسر اور ہم مرتبہ خاندانوں میں رشتے دے دیتے ہیں۔اُن کی رشتہ داریاں نوشیروانی، گچکی،لسبیلہ کے عالیانی اور کئی دیگر معزز خانوادوں سے قائم ہیں۔

بلوچ سندھ گزیٹر میں

سندھ گزیٹر میں بلوچ قوم پر ایک مجموعی نظر ڈالا گیا ہے اور روایتی حوالوں کے ساتھ اُن کے اصل مرز بوم، بلوچستان اور سندھ میں ورود، ان کے قبیلے، سندھ میں بلوچ آبادی، ان کی خصلتیں، عادات واطوار اور رسوم ورواج پر بھی مختصر بات کی گئی ہے۔

''بلوچ قبائل میں ایک روایت چلی آرہی ہے کہ وہ حلب سے براستہ بغداد، خلیج فارس کے ساتھ ساتھ مکران آئے۔ جہاں سے وہ وادی سندھ میں پھیلے۔ ان کا کہنا ہے کہ دوسرے اموی خلیفہ یزید (680 تا684ء) نے انہیں نکال دیا اور وہ مکران آنے سے کچھ عرصہ پہلے کرمان میں رہے (1) اس روایت کی قدرے تصدیق یوں ہوتی ہے کہ سندھ میں آباد ہونے والے بلوچ قبائل کے نام اور موجودہ شام کے بعض قبائل کے نام ایک جیسے ہیں (2) لیکن بلوچوں کو کسی ایک ہی نسل سے ماخوذ قرار دینا تحصیل لاحاصل ہے۔ قبائل اور ان کے حصے مختلف اور مخلوط ماخذ کے ہیں۔ سندھ کے مسلم قبائل پر اپنی رپورٹ میں صادق علی نے مندرجہ ذیل بڑے بڑے بلوچ قبائل گنوائے ہیں۔ یعنی رند، ڈومبکی، جھکرانی، لغاری، لاشاری، چانڈیا، کرمتی، کورائی، جتوئی، بُردی، کھوسہ، جمالی،

عمرانی، بگٹی، مری اور مزاری، سماٹ قبائل کے بعد بلوچی موجودہ سندھ کا اہم ترین عنصر ہیں۔ 1941ء کی مردم شماری میں بلوچ سات لاکھ اُنچاس ہزار تھے لیکن سندھ کی کل آبادی میں بلوچ، آبادی کی نسبت مسلسل بڑھ رہی ہے۔

1941ء میں اس علاقے کی کل مسلم آبادی کا قریباً 23 فیصد بلوچ تھے۔ سابقہ سندھ میں بلوچوں پر درج ذیل تبصرہ کیلئے راقم الحروف (ڈاکٹر ایچ۔ ٹی۔ سارلی، آئی۔ سی۔ ایس) 1941ء کی مردم شماری رپورٹ از مسٹر ایچ۔ ٹی۔ لیمبرک سے مستفید ہوا ہے۔ اس کے مطابق جو قبائل قریباً سندھ تک ہی محدود ہیں تالپور ہیں، مشمولہ بہ نظامانی، چانڈیو، بلیدی اور کرمتی۔ ان میں سے تالپور اور بلیدی مدتوں سے کاملاً آزاد پاڑے بن چکے ہیں۔ سابقہ سندھ کے حکمرانوں کی حیثیت سے تالپور عرصے سے اپنی روایتی بلوچ قبائلی تنظیم ترک کر چکے ہیں۔ لیکن بلیدی پاڑوں میں اپنے اپنے سرداروں کے تحت یہ ہنوز رواں دواں ہے۔ اس کے برعکس چانڈیو اور کرمتی قبائل ہمیشہ ایک دوسرے کو سردار مانتے ہیں۔ اور گو اوّل الذکر خطے بھر میں پھیلے ہوئے ہیں۔ تاہم تمندار کو مقامی مقدموں کے ذریعہ قبیلے سے مربوط رکھا جاتا ہے۔

مجموعی طور پر سندھ میں بلوچ قبائل اپنی وہ تنظیم کھو چکے ہیں جو ان کے بلوچستانی ہمسایوں میں ہنوز جاری ہے۔ اور جہاں ہر قبیلہ صدیوں سے ملحق و متصل علاقے کا مالک ہے۔ مسٹر لیمبرک نے سندھ میں بلوچ قبائل میں یہ رُجحان دیکھا ہے کہ وہ باہمی پیوستگی کھو رہے ہیں۔ اور پاڑوں کے مقدم آزاد سردار بن رہے ہیں۔ یہ بلیدیوں میں دیکھا گیا

ہے اور اس کی ایک اور مثال جمالی قبیلہ ہے۔ جو سابقہ سندھ میں کثیر التعداد ہے۔ اور کافی علاقے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کا ایک سردار ضلع دادو میں ہے اور سابقہ بلوچستان کی نصیر آباد تحصیل میں اور دونوں اپنی اپنی فوقیت کے مدعی ہیں۔ ان کے برعکس گبول کے دو سردار ایک ہی جگہ پر مقیم ہیں۔ رسم پھوڑی کے تحت ہر قبائلی شادی یا مرگ کے مواقع پر اپنے قبائل کی مدد کرتا ہے۔ اور کئی قبائل ابھی تک اس پر عمل پیرا ہیں۔ بہت سے قبائل میں یہ قدیم رسم بھی جاری تھی کہ مستورات کو زمین میں حصہ نہ دیا جائے۔ اس سلسلے میں شرعی قوانین پر یوں برائے نام عمل کیا جاتا تھا کہ ایک عورت کو اس یقین دہانی پر حصہ دیا جاتا تھا کہ وہ اسے اپنے بھائی یا کسی مرد رشتہ دار کے نام ہبہ کر دے گی۔ (3)

بلوچوں میں شادی کا قائدہ اپنے ہی خاندان میں قریب ترین رشتہ داروں تک محدود ہے۔ ایک نوجوان کیلئے مثالی شادی اپنے چچا یا تایا کی بیٹی سے شادی ہے۔ اگر یہ ممکن نہ ہو تو وہ دُور کے رشتہ داروں میں ہونی چاہیے اور اگر یہ بھی ممکن نہ ہو تو پھر اسی طائفے یا پاڑہ کے کسی خاندان میں ہو سکتی ہے۔ ہم رُتبہ خاندانوں میں پاڑہ سے باہر شادی کا تصور قریباً مفقود ہے۔ اس گوت بیاہ کے علاوہ کبھی کبھار شادی پڑ شادی بھی ہوتی ہے یعنی ایک معزز بلوچ اکثر ایک براہوئی بولنے والے یا سندھی عورت سے بھی شادی کرلے گا لیکن غریب سے غریب بلوچ بھی اپنی بیٹی کسی غیر بلوچ کو نہ دے گا۔ سندھ یا اس سے قبل اماکن میں اس نسل کی تاریخ اس قائدے کی سخت پابندی کی بہت سی مثالیں پیش کرتی ہیں۔

خاندانوں میں انتقامی کاروائیوں کا تسلسل روکنے کیلئے ماضی کے جرگے رواج کے تحت سفارش کرتے تھے کہ ان کے درمیان بالغ لڑکیوں کا تبادلہ کرلیا جائے۔ اور کبھی اگر ایک طرف بالغ لڑکی نہ ہوتی تھی تو اس خاندان کو پابند کیا جاتا تھا کہ وہ آئندہ پیدا ہونے والی لڑکی کی منگنی دوسرے فریق کے لڑکے سے کردے (4) ان انتظامات سے خاندان، پاڑہ اور قبیلہ کی ذمہ داری کا نفاذ کیا جاتا تھا۔

بلوچ چھوٹے گول سروں کے لوگ ہیں اور ماہرین بشریات کو ان کی اس رائج العام رسم کو ذہن میں رکھنا چاہیے، جس کے تحت وہ مطلوبہ شکل پیدا کرنے کیلئے فطرت کی معاونت کرتے ہیں۔ ایک بلوچ ماں اپنے بچے کے پہلے چھ ماہ کا بیشتر حصہ اس کو سیدھا لٹا کر اس کا سر سخت زمین پر رکھتی ہے اور اسے اِدھر اُدھر لڑھکنے سے روکتی ہے۔ اس وقت کھوپڑی کی ہڈیاں نرم ہوتی ہیں اور پشت سر بہت زیادہ بلکہ بعض اوقات بدنما حد تک چپٹی ہوجاتی ہے مزید برآں اس سے چوڑی پیشانی اور غزالی آنکھیں بھی بنانا مقصود ہوتا ہے جو بہت مستحسن سمجھی جاتی ہے۔

سندھ میں بلوچوں کی اکثریت زمیندار اور ہاری ہے کچھ مخصوص قبیلے یا پاڑے زمین کی بجائے اپنے مویشیوں پر انحصار رکھتے ہیں۔ جیسے ضلع دادو کے لُنڈ اونٹ کرائے پر دیتے ہیں اور کیری اور تھرپارکر کے مری بھیڑ بکریاں چراتے ہیں۔ مغربی پہاڑیوں میں آباد بلوچ اور کچھی میں رہنے والے بھی زمین کی بجائے اپنے گلوں اور ریوڑوں سے ہی اپنی روزی حاصل کرتے ہیں۔ کیونکہ ان علاقوں میں آبپاشی میسر نہیں ہے۔ سوائے ایک مختصر حصے کے جو پہاڑی ندیوں سے سیراب ہوتے ہیں۔

حواشی:

1۔ مذکورہ تذکرہ بلوچ قوم کا تذکرہ نہیں ہے۔ بلوچ ہزاروں سالوں سے بلوچستان کی سرزمین کے مختلف حصّوں میں وجود رکھتے رہے ہیں ۔ مصنف جس روایت کا تذکرہ کرتے ہیں وہ رند قبائل کی ہے جو کہ نسلاً ترکی کے تُرک نژاد اور ادغامی بلوچ ہیں جن کی شاعری انہیں حلب سے آنے والے بتاتی ہے۔ لیکن یہ حلب، عراق وشام کا حلب نہیں ہے بلکہ ترکی سرحد سے پرے ایرانی سرحد پر ایک گاؤں ہے۔ جہاں پر رند قبائل تُرکی سے پہلی مرتبہ پہنچے تھے۔ اور پھر وہاں سے مغربی بلوچستان کے مختلف مقامات پر آباد ہوتے گئے جہاں زمانہ قدیم سے نسلی بلوچ اقوام پھیلے ہوئے تھے۔ مصنف کے کہنے کے برعکس کرمان کے گردونواح میں پہلے سے کوچ بلوچ کے سینکڑوں طائفے صدیوں سے آباد تھے اور ساحل سمندر کی پہاڑیوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کا مرکزی مقام مکران کا کیچ تھا جو اسی قبیلے کے نام پر ابھی تک ہے۔ کوچ کا مغربی لہجہ ''کیچ'' بنتا ہے۔ کوچ بلوچوں کے تذکرے رند قبائل کی ایران میں ورود سے صدیوں پہلے مورخین اور عرب جغرافیہ نویسوں نے کیا ہے۔ رندوں کی اپنی شاعری بتاتی ہے کہ ایرانی سرحد کے قریب کے ''حلب'' سے نکل کر وہ سیستان میں قیام پذیر ہوئے۔ اور بلوچوں میں مدغم ہوئے۔ چار سو سے پانچ سو سال کے درمیان ان کے گروہ مشرقی مکران میں آتے گئے اور اپنی آبادیاں بناتے رہے۔ جلال خان کی نسل مغربی بلوچستان اور سیستان کے بلوچی خطّوں میں پلتی اور بڑھتی

رہی مشرقی مکران میں وہ خود اپنی زندگی میں کبھی بھی نہیں پہنچا۔اس بارے مصنّفین کے تمام تذکرے غلط اور مفروضہ ہیں۔رند نسل، تُرکی کے شاہی شہر اناطولیہ کے موضع روم کی شاہی نسل تھی جو ایک تُرک بادشاہ اعلمش رومی کے پسماندگان تھے جنہیں یزیدیوں کے ظلم وستم نے ہجرت پر مجبور کر دیا تھا۔ان دنوں ترکی کی نسبت ایران میں امن تھا اس لئے یہ لوگ ایران چلے آئے اور مامون ہو گئے۔ان کے شجرہائے نسب ''اعلمش رومی'' تک موجود ہیں۔نیز دیکھیں موضوع ''بلوچستان کے بلوچ'' کا حاشیہ نمبر 47۔

2۔مصنّف نے کسی ایک نام کا بھی تذکرہ نہیں کیا ہے اگرچہ سامی ناموں میں یکسانیت کوئی حیران کن بات نہیں ہے۔

3۔مذکورہ رسم کا تعلق بلوچ کلچر سے نہیں رہا ہے بلکہ یہ سندھیوں سے اخذ کردہ ہے۔بلوچ اپنی عورتوں کو اسلامی احکامات کے مطابق حصّے دیتے رہے ہیں اور ابھی تک دیتے ہیں۔

4۔یہ رسم بلوچی میں ''لاف دیگ'' اور ''لاف زیرنگ'' کہلاتا ہے۔موجودہ وقت یہ رسم تقریباً متروک ہو چکا ہے البتہ ''لوڑیوں'' میں اِکّا دُکّا دیکھا جاتا ہے۔

سندھ کے بلوچ

1901ء کی مردم شماری رپورٹ میں یوروپی محقق آر۔ ہیوگز بٹلر سندھ کے بلوچوں کے بارے میں یوں لکھتے ہیں:۔

"وادی سندھ میں پائے جانے والے بلوچوں کا مرکزہ ابتداء (1) میں مکران اور جنوب کرمان میں ایرانی بلوچستان میں آباد تھا۔ اس کے لئے کافی شواہد موجود ہیں۔ بگٹیوں کا مرکزہ اپنے آپ کو "بگ" (ایرانی بلوچستان) سے ماخوذ قراردیتا ہے (2) بلیدی، مکران کی وادی بلیدہ کو اپنا ماخذ بتاتے ہیں، جس کے آس پاس وہ اب تک موجود ہیں ہیں (3) ڈومبکی ایرانی بلوچستان کے دریائے ڈومبک سے نسبت رکھتے ہیں

(4)لاشاری ،لاشار سے گشکوری، گیشکور ہے(گش ندی جووادی بلیدہ کوسیراب کرتی ہے) (5) کلاچی، کُلانچ (مکران) سے ، مگسی،مگس (ایرانی بلوچستان) سے۔مزید یہ کہ مکران میں مند کے مقام پر رندوں کا ایک مضبوط قبیلہ ہے جس سے میدان کچھی کے رند ماخوذ ہیں۔"(6)

ایک اور یوروپی محقق "ایلفنسٹن" اپنی تاریخ میں لکھتا ہے کہ 664ء میں عربوں سے اوّلین حملہ کے وقت بلوچ مکران کے کوہستان میں آباد تھے اور دسویں صدی کے ابن حوقل نے لکھا ہے کہ کوچ و بلوچ ، "ایران زمین" پر آباد تھے جو ہند وسندھ کی سرحد پر ہے۔ پشتو اور قدیم فارسی میں کوچی اور کوچائی کی مانند لفظ بلوچ کا مطلب ہے خانہ بدوش یاجہاں گرد (7)ایرانی بلوچستان اور مکران میں آباد ہونے سے پہلے بلوچوں کا ماخذ دھندلکوں میں ہے اور علماء میں اختلاف ہے۔ بعض لوگ

شامی کی کہانی کو برحق سمجھتے ہیں (8) اور کئی
انہیں ترکمان نسل سے گردانتے ہیں
(9) اپر سندھ فرنٹر کے پولیٹیکل سپرٹنڈنٹ،
سر ہنری گرین کو اپنی شام کی سیاحت کے
دوران ایسے قبائل ملے جن کے نام وادی
سندھ کے موجودہ بلوچ قبائل کی طرح تھے۔
اس کے برعکس عرب حملہ آور مہلب کو 664ء
میں کیکان (10) پر حملہ کرتے وقت اٹھارہ
تُرک شاہسواروں کا مقابلہ کرنا پڑا جو دُم کٹے
گھوڑوں پر سوار تھے۔ کیکان، کیچ مکران اور
خضدار کے درمیان کہیں واقع ہے اور یہ واقعہ
اس پر دال ہے کہ بلوچوں کے وسط ایشیائی
ماخذ کا نظریہ اصل میں بے بنیاد نہیں ہے
(11) اور اگر ہم موجودہ بلوچوں میں سابقہ یا
جاریہ عمل انضمام کو ذہن میں رکھیں تو شاید
ہمارے لئے یہ تحقیق حیران کن نہ ہوگی کہ
بلوچ عرب اور تورانی نسلوں کا امتزاج ہیں

(12) وادی سندھ کے بلوچوں میں متداولہ روایت جو جلال خان یا جلالہان کے گرد گھومتی ہے جس کے چار بیٹے (رند، ہوت، لاشاری اور کورائی تھے اور ایک بیٹی مائی جتو نامی تھی، جس پر شک وشبہ کی گنجائش ہے، بالخصوص اس لئے کہ مکران کے ہوت متفقہ طور پر علاقے کے قدیم باشندے سمجھے جاتے ہیں۔ اور وہ خود بھی رندوں اور علاقہ کے دیگر بلوچ قبائل سے ایک علیحدہ نسل کے دعویدار ہیں۔ اور ممکن ہے کہ وہ اوریتائی یا ہوریتائی کے باقیات ہوں جو سکندر اعظم کو براستہ مکران مغرب کی طرف جاتے ہوئے ملے تھے (13) بلوچوں کا مغربی جانب سے وسیع پیمانے پر ورود چودھویں اور پندرھویں صدیوں میں وقوع پذیر ہوا تھا۔ کیونکہ سولہویں صدی تک مستند شواہد کے مطابق وہ کثیر تعداد میں تھے اور چاروں طرف حملے کر رہے تھے'' (14)۔

ایک اور یوروپی سیاح اور نامی گرامی مصنف ''رچرڈ برٹن'' نے سندھ کا دورہ کیا اور سندھی عوام، بلوچ عوام کے ہر طبقے اور بلوچ تالپور حکمرانوں کی قومی، سماجی، تہذیبی اور سیاسی جہتوں کا بھرپور مشاہدہ کیا اور پھر اپنی یادداشتوں پر مبنی اپنی کتاب ''آن پیی ویلی آف سندھ'' کے نام سے لندن میں 1855ء میں چھپوائی۔ انہوں نے لکھا:

''جنگی بلوچ کی کھال، کالی، داغدار (15) اور کٹر بُری نظریں ہیں۔ مگران کی ہئیت سے آزادی چھلکتی ہے اور یہ بھی لگتا ہے کہ گویا پوچھ رہا ہو کہ یہاں کتنی غارتگری ہوئی ہے؟ ان کا کردار کسی ایسی جنگی بلّی کی طرح کا ہے جو بھاگتے ہوئے پیدل شخص پر حملہ کردے۔

بلوچ بعض معاملات میں اپنی طاقت کی بڑی عزت کرتے ہیں۔ یہ چھوٹے چھوٹے قطعات کی کاشت کرنے کے علاوہ ماہی گیری بھی کرتے ہیں اور شکار، گھوڑوں، اونٹوں اور بھیڑوں کے پالنے کے پیشوں سے منسلک ہیں۔ ان کے جاگیرداروں نے اپنے اور اپنے فوجیوں کیلئے سب سے زیادہ زرخیز

علاقوں پر قبضہ جمایا ہوا ہے۔ عام طور پر وہ
قابل رحم حالت کی غربت میں ہیں۔ میں نے
پورے خاندانوں کو سڑکوں پر سادگی سے،
گرے ہوئے دانے چنتے ہوئے دیکھا ہے''

جان ووڈ نامی یوروپی سیاح نے 36-1835ء کے دوران سندھ کا دورہ کیا۔ اس دورے میں انہوں نے سندھ کے عوام اور حکمران طبقے کا بغور مشاہدہ کیا تھا۔ بعد میں انہوں نے اپنی یاداشتوں کو کتابی شکل دی جس کا نام ''جرنی ٹو دی سورس آف دی اوکسس'' ہے، یہ کتاب 1836ء میں لندن میں طبع ہوئی۔ انہوں نے سندھ کے بلوچوں کے بارے میں درج ذیل خیالات کا اظہار کیا ہے:

''بلوچ لوگ دراز قد و مضبوط، پتلی کمر والے،
آنکھیں بڑی بڑی اور خوبصورت، گیسو کمر تک
دراز اور کندھوں پر ہوتے ہیں، سر کے گرد
عمامہ باندھا ہوتا ہے، ان کی آنکھوں سے
اکثر بدنیتی ظاہر ہوتی ہے (16) یہ عام
مسلمانوں، ہندوؤں، ایرانیوں، افغانیوں اور
عربوں سے مشابہت نہیں رکھتے۔
بلوچ سفر کے دوران بھی اپنا حقہ اور چلم ساتھ

رکھتے ہیں، عام اور رستا نشہ بھنگ ہے،
بہت سرگرم دکھائی دینے والے بلوچ یقیناً
بھنگ پیے ہوتے ہیں تب وہ جنونی اور پاگل
نظر آتے ہیں۔

قدیم زمانے کے یہودیوں کی طرح واسکٹ
پہنتے ہیں (17) لیکن سوتی یا اونی کپڑا پہننے کی
مقدس یہودی روایت نہیں رکھتے ہیں۔ وہ جو
لباس موجودہ وقت پہنتے ہیں اس سے بُرا
لباس کوئی نہیں ہے۔ عرب روایت کے
موجب اپنے لباس پر اسلحہ، پیٹیاں اور پوڈر
کی بوتلیں باندھتے ہیں ۔ ان کے ساتھ
تلواریں، ڈھال اور توڑے دار بندوقیں بھی
ہوتی ہیں (18)۔

کتاب ٹریولزِن انڈیا کے مصنف لیو پوٹریون اور لیچ نے درج ذیل تبصرہ کیا ہے۔ ان کی کتاب لندن میں 1845ء میں شائع ہوا:

''بلوچوں کا تعلق جنگجو نسل سے ہے۔ جو
صحراؤں کے آزاد باشندے ہیں اور سندھ

میں شمال مغربی کوہستان سے آئے ہیں۔ ان کی کئی رسمیں موسوی دین کے قوانین سے مشابہت رکھتے ہیں۔ ان کی تحریری اور زبانی روایات کے مطابق بھی وہ یہودی نسل سے ہیں (19)ان کے خدوخال سے بھی یہی ظاہر ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ وہ بنی اسرائیل کے گمشدہ قبائل سے ہیں۔ یہودی رسوم کی طرح بیوی کے شوہر کی وفات پر اس کا بھائی بیوہ سے شادی کرنے کا پابند ہے(20)اور یہودیوں کے رواج کی طرح یہاں بھی شوہر بیوی کو طلاق دے سکتا ہے (21)وہ اپنے کو اس ملک کا مالک سمجھتے ہیں۔ وہ اسلحہ، شکار اور لوٹ مار سے رغبت رکھتے ہیں۔ ہر قبیلہ اپنے سردار کے تابع ہے اونٹ اور گھڑسواری کے سب ماہر ہیں۔

یہ ہمیشہ تیر کمان اور ڈھال سے مسلح رہتے ہیں۔ مرد سوت اور ریشم سے بنی، سونے

چاندی کا کام کئے ہوئے ٹوپی پہنتے ہیں۔
بلوچ لوگ دراز قد تو نہیں مگر مضبوط جسم کے
مالک ہوتے ہیں۔ ان کی رنگت بھوری اور
آنکھیں خوبصورت اور پُرکشش ہوتی ہیں۔
وہ اپنی داڑھی کو بہت وقعت دیتے ہیں۔"

کتاب "پرسنل آبزرویشنز آن سندھ.......... 1843ء کے مصنف مسٹر ٹی۔ پوسٹن، بلوچ موضوع پر اپنا جائزہ یوں پیش کرتے ہیں:

"بلوچ کوئی خاص رکھ رکھاؤ کے
دلدادہ نہیں ہیں۔ خاندان تالپور نے اپنے
آباواجداد کے قدیم طور طریقوں کو نہ صرف
دربار میں اپنایا ہے بلکہ اپنے گھریلو معاملات
میں بھی انہیں برقرار رکھا ہے۔
انہیں وہ عظمت اور بڑائی کی علامت سمجھتے
ہیں۔ امیروں کی شادیاں اپنی ہم پلّہ بلوچ
گھرانوں میں کی جاتی ہیں۔ ہم پلّہ خاندانوں
میں مری اور دیگر قبیلے شامل ہیں جنہیں
دیگر قبائل میں اہمیت حاصل ہے۔ تالپور

خاندان کی اگلی نسلیں بھی اپنے آباواجداد سے
مختلف نہ تھیں۔

امیروں کا لباس بلوچی ہونے کی وجہ سے کافی
امتیازی لگتا ہے۔ لنگی اور کمر پر باندھنے والے
پٹکے کے علاوہ ان کی ٹوپی بہت اہمیت رکھتی
ہے جسے وہ سونے اور چاندی کے اجزا سے
سجاتے ہیں"

"ٹریولز ان سندھ اینڈ بلوچستان" کے مصنف ہنری پوٹنگر نے اپنی تصنیف مطبوعہ 1809ء میں لکھا ہے کہ:

"سندھ کی مجموعی آبادی کی تشکیل جاٹ،
بلوچ اور ہندو کرتے ہیں۔ جاٹوں اور بلوچوں
سے ایک تیسری نسل وجود میں آئی ہے۔
جاٹ ہندوؤں کی نسل ہے جو سندھ کے اصل
قابض تھے۔ جاٹوں نے اسلام لانے کے
بعد اپنے اِملاک کے تحفظ کیلئے بلوچوں کو
اپنالیا۔ سندھی لوگ قلات کے خان محمود خان
کی رعیت سے دشمنی رکھنے کے باوجود انہی

سے اپنا ماخذ بتانے کے شوقین ہیں اور اپنے سردار کو اصل بلوچ بتاتے ہیں۔ سندھی، لالچی، دھوکہ باز اور احسان فراموش ہیں۔ان میں کچھ ذاتی بہادری، جفاکشی اور اطاعت شعاری بلوچوں سے وراثتاً ملے ہیں لیکن ان اعلیٰ اقدار واحساسات سے عاری ہیں جو بلوچوں میں اب بھی موجود ہیں۔''

مسٹر ایڈورڈ آرچر لانگلے اپنی دوحصّوں پر مشتمل تصنیف ''نیریٹو آف اے ریزیڈنٹ ایٹ دی کورٹ آف میر علی مراد'' (1860ء) میں سندھ کے بلوچوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''بلوچ قبیلہ سندھ کا سابق حکمران قبیلہ ہے جو سب سے طاقتور اور جنگجو قبیلہ ہونے کی وجہ سے بہت رعب ودبدبہ رکھتا ہے۔ ان میں آبائی موروثی اچھی عادتیں ہیں۔ یہ جاگیردار اور زمیندار ہیں اور رشتہ داروں کے ساتھ شفقت اور دوسروں پر مہربانی سے پیش آتے ہیں۔ اپنے بزرگوں کی عزت کرتے ہیں اور

سردار کے فرمانبردار ہیں جسے قبیلہ میں باپ
جیسا مقام حاصل ہے ان کے ہاں آرام
وآسائش کا تصور نہیں ہے۔ ان کی عورتیں
مظلوم اور مردوں کی غلام ہیں (22) کچھ کے
راجپوتوں کی طرح بلوچوں میں شاعر اور گانے
والے ہوتے ہیں جو ان کے قدیم گیت گاتے
ہیں۔"

ایک دوسرے یوروپی سیاح ایچ ایلس نے، مذکورہ بالا سیاح سے قبل 1809ء میں سندھ کی سیاحت کی، اور سندھ کے بلوچ حکمرانوں کے بارے میں تبصرے کئے، نے اپنی یادداشتوں پر مشتمل کتاب "میموریز آن دی سٹیٹ اینڈ ریسورسز آف سندھ اینڈ کار سپنڈنس وِد غلام علی ٹالپر" میں لکھا ہے کہ سندھ کے بلوچ، بلوچستان کے پہاڑوں سے آنے والے جنگجو قبائل سے متعلق ہیں۔ ملک کے قدیمی باشندے جٹ اور جھوکیہ ان میں نہیں ہیں اور نہ ان کا کوئی احترام ہے۔ بلوچ دشمن کا پیدل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ بلوچی اچھے توپچی ہیں مگر نظم وضبط کے حوالے سے دیگر اقوام کے برابر اعلیٰ کردار نہیں رکھتے۔(23)

حواشی:

1۔ مصنف نے صرف ابتداء لکھ کر کسی سن وسال کی نشاندہی نہیں کی ہے اور نہ اس بارے میں خود کوئی تحقیق کی ہے اور نہ کسی تحقیق یا تحریر سے استفادہ کیا ہے۔

2۔ بگٹی قبیلہ کا مرکزہ کون سا طائفہ تھا۔ مصنف نے اس کی وضاحت بھی نہیں کی ہے۔ مری بگٹی گزیٹر کے مرتب کنندگان نے اس بارے میں لکھا ہے:

"قبیلہ کے مرکزہ کے بارے میں کوئی نہیں جانتا کہ کب علاقے میں اس کا پھیلاؤ ہوا۔ لیکن یہ کہا جاتا ہے کہ یہ ایرانی بلوچستان کے بگ سے آئے ہیں۔"

یوروپی محقق لانگ ورتھ ڈیمز نے لکھا ہے کہ بگٹی قبیلہ مختلف عناصر سے مل کر بنا ہے اور اصلاً رند نسل سے ہے جو میر چاکر خان رند کے چچازاد گیاندار کی جدّیت سے ہے۔ گیاندار کے لڑکے "راہجہ" کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اُس کے نام سے راہجہ طائفہ ہے لیکن یہ نام ہندی الاصل معلوم ہوتا ہے۔ (بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر، مری بگٹی کنٹری، مطبوعہ گوشۂ ادب کوئٹہ صفحات 25-624)۔

جہاں تک بگٹیوں کے ایرانی بلوچستان کے بگ سے آنے کی بات ہے وہ غلط ہے (ایرانی بلوچستان میں کئی موضع بگ نامی ہیں۔ ایک گاؤں "بگان" بھی ہے۔ جو بگ کی جمع ہے یعنی ایک سے زیادہ بگ، اسی طرح مشرقی مکران کے کیچ اور پنجگور میں بھی

بگ نام کے مواضعات ہیں۔ندی کے کنارے کا زرخیز قطعہ ''بگ'' کہلاتا ہے۔) واضح ہو کہ بگ نام سے ''بگی'' کی اصطلاح تو بن سکتی ہے لیکن بگٹی کی نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ممکن ہے یہ لوگ ترکی کے کُرد بلوچوں میں موجود قبیلہ ''بکتائی'' سے ہوں جو کسی قدیم دور میں نقل مکانی کر کے آئے ہوں گے۔ اگرچہ اس کی تصدیق تا حال نہیں ہوئی ہے لیکن پھر بھی اس کا امکان ہے۔ کیوں کہ رند قبائل کی اصلیت بھی تُرکی کے اناطولیہ کے ترکوں سے ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر بگٹی، ترکی کے بکتائی کردوں سے ہوتے تو تُرکی سے قلات کے کوہستان تک کے طویل خطے میں رند قبائل کے برعکس ان کے ایک گھر کی آبادکاری کے آثار کیوں نہیں ہیں؟ نہ بکتائی کے نام سے اور نہ بگٹی کے نام سے۔ اس طرح اس مفروضے پر بھی اتفاق کرنا مشکل ہے۔ لیکن ایک چیز یقینی ہے کہ کسی زمانے میں غالباً رندوں کے مشرقی بلوچستان آنے سے قبل بگٹی مرکزہ کا اسی نام کا چھوٹا سا قبیلہ سیوستان کے کوہستان میں کہیں موجود تھا۔ اور بشمول قبیلہ مری کے دونوں ''گُردگال'' کہلاتے تھے۔ جس کے معنی کردوں کی زبان (موجودہ مغربی بلوچی) بولنے والے کے ہیں۔ اُس کی باقی شاخیں باہر سے آئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ مثلاً نوتھانی قبیلہ لسبیلہ سے آنے والا بتایا جاتا ہے۔ اسے لسبیلہ میں جام عالی ہوت کی نسل سے روایت کیا جاتا ہے، نوتھانی قبیلہ اس وقت لسبیلہ اور خضدار میں موجود ہے لیکن وہ اپنے کو بگٹی نہیں کہتے۔ اسی طرح مسوری قبیلہ ہے جو سندھ میں آباد ہے اور مشوری کہلاتا ہے۔ وہ بھی وہاں پر بگٹی نہیں کہلاتے ہیں۔ ممکن ہے کہ یہ لسبیلہ کے قبیلہ ''مسور'' ہی کا بچھڑا ہوا گروہ ہو اور مسور کی

نسبت سے مسوری کہلاتا ہو اور نوتھانی کے ساتھ نقل مکانی کے نتیجے میں آیا ہو۔ نیز اسی نام کا ایک ہندی قبیلہ بھی ہوتا تھا جو ہند کے دہرہ دون کے قریب کے کوہستان میں تیرھویں صدی عیسوی کے دوران آباد تھا۔ وہ شہر آج بھی مسوری کہلاتا ہے۔ یہ پہاڑی سلسلہ کی اونچائیوں پر آباد ہونے کی وجہ سے اس کے سر سبز نظارے دور سے نظر آتے ہیں۔ جب ہندوستانی لیڈر جواہر لال نہرو دہرہ دون کے جیل میں قید تھا۔ تو ہر شام جیل کی کھڑکیوں سے گھنٹوں مسوری شہر کے نظاروں کو دیکھ کر دل بہلاتا تھا۔ اُس نے مسوری شہر کی دلکشی کے بارے میں اپنی بیٹی کو لکھے گئے خطوط میں بتایا ہے (دیکھئے نہرو کی تصنیف ''تاریخ عالم پر ایک نظر'' حصہ اوّل، ترجمہ از طاہر منصور فاروقی) کیا یہ ممکن نہیں کہ مذکورہ ہندی قبیلہ کا کوئی گروہ وہاں سے نقل مکانی کر کے سیوستان کے انہی پہاڑیوں میں آ کر بس گیا ہو اور بگٹی مرکزہ کا حصہ بن گیا ہو۔ جبکہ اسی خطے میں بے شمار کشمیری اور ہندی قبیلوں کی آباد کاری کے آثار موجود ہیں۔

پھر سردار گھرانہ ''راہیجہ'' ہے جس کے نام کی بندش ہندی اور جدگالی ہے۔ راہی یا راہو، ہندوانہ نام ہے ایسے کئی نام ہیں جو ہندوؤں اور بلوچوں میں مشترک ہیں جیسے راہو، چندن، ہوت، بالا، دلو، رامن، سونی، رادھا، وادھو، مہر وغیرہ۔ ''راہیجہ'' ایک الگ سندھی قبیلہ ہے جو بولان، کچھی، نصیر آباد و جیکب آباد میں پھیلا ہوا ہے۔ بعض جگہ اسے ''راہوجہ'' بھی کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک مخصوص روایت بتائی جاتی ہے کہ راہجہ کا جدّ امجد ''راہو'' جو مشرقی بلوچی تلفظ میں ''راہی'' بن جاتا ہے، ایک جٹ تھا جسے کچھ لوگ

(دو چار بگٹی بھی) ہندو بتاتے ہیں جو ایک گھومنے پھرنے والا بیوپاری تھا جو اپنا مال بیچتا تھا اور سرداروں کے مہمان خانوں میں رہتا تھا اور لوگوں سے بھیڑ بکریوں کے بال اور اون خرید کر سندھ جا کر فروخت کرتا تھا۔ یہ جٹ یا جاٹ ہندو راہی کو ایک نامعلوم بگٹی سردار نے اپنا منشی اور کاردار رکھا جو پھر کسی وقت مسلمان ہو کر اس قبیلہ کا حصّہ بنا۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اُس راہی کا راہیجہ بگٹی سے کوئی تاریخی تعلق بنتا ہے یا نہیں۔ بعض اوقات سیدھے سادھے بلوچ کوئی نام سُن کر بھی بغیر اُس پر غور کیے یا کسی سے پوچھے بغیر اُسے اپنے کسی بچے پر رکھ لیتے ہیں۔ یہ ممکن ہے ''راہیجہ'' کے والد نے یہ قبیلائی نام سُن کر اور پسند کر کے اپنے بیٹے پر رکھا ہو۔ جیسے کہ کئی پٹھانوں نے اپنے بیٹوں کے نام کابل خان اور پشتونستان خان رکھا ہے۔ میرا اپنا ایک یوسف زئی دوست کا نام سوات خان ہے۔ بگٹیوں کا ایک اور طائفہ ''نوحکانی'' ہے جس کے بارے میں یہ روایت بھی ہے کہ اصل مرکزہ ''نوحکانی'' ہے جو خاران کے موضع بکت سے نقل مکانی کر کے موجودہ علاقے میں آیا اور بکت سے بکتی کہلایا جو پھر جدگالی کے اثر سے بگٹی میں بدل گیا۔ لیکن یہ بھی قابل قبول نہیں لگتا کیونکہ خاران میں نوحکانی نامی کسی قبیلہ کے کوئی روایت اور آثار نہیں ہیں۔ ویسے بھی خاران اور مکران کے قدیم قبائل میں ''آنی'' کے لاحقے والا کوئی قبیلہ نہیں ہوا ہے۔ ایک روایت جو خود بگٹیوں سے منسوب ہے یہ ہے کہ بگٹی نام اپنانے سے پہلے یہ لوگ ''زرکان'' کے نام سے مشہور تھے اور دُکی کے موضع ''بگٹ'' میں آباد تھے۔ جب بگٹ سے نقل مکانی کر کے موجودہ کوہستان میں بلیدئیوں کی ہمسائیگی میں آباد ہوئے تو

''بگٹ'' کی نسبت سے بگٹی کہلائے۔ اس روایت میں کافی وزن ہے اور یہ بھی حقیقت سمجھا جاتا ہے کہ بگٹی قبیلہ کا مرکزہ ''زرکان'' قبیلہ ہوتا تھا اب یہ دیکھنا کہ زرکان کون تھے اور ان کا نسلی سلسلہ کس بڑے قبیلہ سے منسلک ہے اس نقطہ پر تا حال کسی کی تحقیق نظر سے نہیں گزری ہے۔

بگٹیوں میں ایک واحد قبیلہ یا طائفہ ہے کہ قدیم ہونے کے ساتھ ساتھ ایرانی بلوچستان میں بھی موجود ہے اگرچہ موجودہ وقت میں چند گھروں پر مشتمل ہے وہاں ان کے نام سے ایک قدیم موضع بھی ہے۔ یہ قبیلہ ''کلپر'' ہے۔ ایران کے اس بلوچ طائفے کو کسی بگٹی نام کے قبیلے کا علم نہیں ہے۔ وہاں ان کا مسکن ''کلپر کہن'' کہلاتا ہے جو قدیم قلعہ بلوچ سے اندازاً تمیں کلومیٹر پر دزک جانے والے راستے پر واقع ہے۔

درج بالا جائزے سے معلوم ہوتا ہے کہ بگٹی نام والے مرکزہ کے اردگرد جتنے بھی طائفے ایک واحد قبیلہ کی شکل میں جمع ہیں ان میں سے کوئی ایک بھی بنیادی بگٹی مرکزہ کی نمائندہ نہیں ہے اگرچہ ان سب نے ملکر ایک مستحکم اور پائیدار بگٹی فیڈریشن کی بہترین آبیاری کی ہے۔

3۔ ''آس پاس موجود ہیں'' سے کوئی مطلب نہیں نکلتا۔ بلیدہ دیگر گاؤں کی طرح ایک گاؤں ہے۔ اُس میں تمام رہنے والوں کے جداجُد ا قبیلے ہیں اور ہر کوئی اپنے قبیلہ کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ مثلاً رئیس، کچکی، نوشیروانی، میر، محمد زئی، سید، شنبہ زئی، رند، درزادہ وغیرہ وغیرہ۔ بلیدہ میں ''بلیدئی'' نام استعمال نہیں ہوتا۔ یہ مشترک نام بلیدہ سے نکلنے

والے لوگ باہر کی دنیا میں بلیدہ کی نسبت سے استعمال کرتے ہیں۔ اور کسی دوسری جگہ آباد ہونے کی صورت میں اپنی ایک متحدہ قوت کا تاثر دینے کے لئے اسے بطور قبیلہ اپناتے ہیں۔ اس اصول کے تحت تمام گروہ باہر سے ایک اور اندر سے مختلف ہوتے ہیں۔

4۔ نہ ڈومبکیوں کا تعلق ایرانی بلوچستان سے ہے اور نہ ''ڈومبک'' ایرانی بلوچستان میں تھا۔ ڈومبکی جب تک قلات کے کوہستان میں تھے تو ڈومبکی نہیں کہلاتے تھے بلکہ اس کا مرکزہ جو تھا وہ براہیم زئی رند کہلاتا تھا۔ اور بڑے لڑاکو اور جھگڑالو ہوتے تھے۔ ابتداء میں یہ ایک موضع ''ڈومبک'' میں رہائش پذیر تھے۔ جہاں پر دیگر جاٹ وغیرہ گھر بھی تھے۔ جو سب ایک ہوکر ''براہمانی'' کہلائے۔ ڈومبک کی چھوٹی سی وادی سراوان کے پہاڑی سلسلہ ''ناگاہو'' کے دامن میں کلتاچ وادی کے مشرق کی طرف واقع ہے جسے انگریزی گزیٹئر اور رائے ہتورام نے ایرانی بلوچستان میں بتایا ہے جو غلط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قلات سے مغرب کی سمت تا آخری حد ایرانی بلوچستان کوئی ایک ڈومبکی گھر بھی نہیں ہے۔ وادی ڈومبک میں ایک تباہ کن سیلاب کے نتیجے میں بڑی تباہی آئی تھی۔ بچے کچھے براہمانی و دیگر نقل مکانی کر کے ایک قریبی جگہ ''لاہڑ'' میں بس گئے۔ یہاں وہ ڈومبک موضع کی نسبت سے ڈومبکی کہلائے۔ ان ڈومبکیوں میں براہمانی رندوں کے علاوہ دیگر طائفوں کے لوگ بھی تھے اور ڈومبکی ان سب کی شناخت تھی۔ مذکورہ علاقوں سے رند قبائل آہستہ آہستہ سبی اور کچھی کے اطراف میں نقل مکانی کر رہے تھے۔ اسی نقل مکانی کے نتیجے میں ''لاہڑ'' موضع میں بسنے والے براہمانی ڈومبکی اور ان کے بعض غیر رند ڈومبکی بھی

ہجرت کر گئے اور کچھی میں آباد ہوئے اور وہاں یہ ڈومبکی اپنے دوسرے مسکن ''لاہڑ'' کی نسبت سے ''لاہڑی'' کہلائے اور نئے موضع کا نام بھی ان لاہڑ کے ڈومبکیوں کی نسبت سے ''لاہڑی'' پڑ گیا جو ان کے سابق آخری مسکن کی نشاندہی کرتا ہے نہ کہ ان کے قبیلے کی ''لاہڑ'' کے بعض براہمانی ڈومبکی بجائے کچھی جانے کے ''نرمک'' میں بس گئے اور پھر آس پاس پھیل گئے۔ یہ لاہڑی اپنے بھائیوں سے کٹ کر ایک الگ قبیلہ بنا جو کہ وہی ڈومبکی ہی تھے۔ جن کا مرکزی طائفہ ان کا خالص گھرانہ براہیم زئی ڈومبکی تھا۔ یہ قبیلہ آج تک لاہڑی کے نام سے پہچانا جاتا ہے جو کہ وہی ڈومبکی ہیں جنہوں نے کچھی میں لاہڑی بسایا۔ سراوان گزیٹر نے لاہڑی قبیلہ کے بارے میں لکھا ہے:

> ''اس کے چھ حصے ہیں۔ یعنی براہیم زئی، حیدرزئی، زبیرانی، شادیانی، خلیچانی اور شنگرانی۔ پہلے دونوں قبیلہ کا مرکزہ ہیں اور ڈومبکی بلوچوں سے ماخوذ ہیں۔ باقی تمام بیگانے ماخذ کے ہیں۔ زبیرانی پھوررند ہیں خلیچانی بلوچ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں (شاید قدیم ترین نسلی بلوچوں سے ہوں گے۔نسیم) شادیانی، ذگر مینگلوں سے برآمد ہوئے اور شنگرانی افغان ہیں (غلط، رخشان کے شنگر

سے آمدہ بلوچ تھے۔نسیم) نرمک ، قبائلی
صدر مقام ہے اور یہیں اکثر براہیم زئی
حیدرزئی، زبیرانی اورشادیانی رہتے ہیں۔''
(مطبوعہ گوشئہ ادب کوئٹہ۔ 1997ء
صفحہ 930)۔

5۔''گیشکور'' ایک موضع کا نام ہے جو کیچ ضلع میں تربت آواران روڈ پر واقع ہے۔ محض ''گش'' ندی سے ''گیشکوری'' اصطلاح نہیں بنتی ہے۔

6۔ڈسٹرکٹ گزیٹر کچھی، موضوع''بلوچوں کا ماخذ''۔

7۔ایضاً۔حیرت کی بات ہے کہ نام بلوچ پر بحث کرتے ہوئے مصنّف فارسی اور پشتو میں ''کوچی اورکوچائی'' کے معنی بتاتا ہے جو ایک غیر متعلق بات ہے نام''بلوچ'' نہ فارسی سے متعلق ہے اور نہ پشتو سے۔ یہ بلوچوں کا اپنا ایک تاریخی نام ہے اور ان سینکڑوں بلوچی ناموں میں سے ایک ہے جنہیں بلوچ ہزاروں سالوں سے بطور قومی میراث کے اپناتے رہے ہیں اور دوسروں کو منتقل کرتے رہے ہیں۔کئی پٹھانوں نے بلوچ خان نام اپنایا ہوا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ یہ پشتو میں معنی دیتا ہے۔ بلوچوں کے نام اپنے ہیں اور قدیم ترین تاریخی نام ہیں۔جن کا کہیں ربط اگر ملیگا تو ''سامی'' ذخیرے میں ملیگا۔ انہوں نے بلوچوں کی خانہ بدوشانہ معاشی زندگی کو پیش نظر رکھ کر''جہاں گرد'' کو بلوچ کے معنی بتائے وہ بھی غیر متعلق حوالہ ہے۔ویسے خود بلوچوں میں ''بلوچ'' نام کے بارے میں

دو چار تشریحیں ملتی ہیں جن کی بازگشت بعض کتابوں میں سنی گئی ہے لیکن وہ بھی غیر مصدقہ اور مفروضے ہیں۔ بلوچ نام کی تعریف جو بھی ہو لیکن سو فیصد حقیقت یہی ہے کہ ''بلوچ''، عظیم تاریخی شہر ''بابل'' کا بانی اور شہنشاہ لیڈیا وغیرہ ''الکاؤس'' کا عظیم فرزند تھا۔ جو باپ کی وفات کے بعد شہنشاہ بنا جس نے ملکہ بلقیس سے شادی رچائی، شہر ''بابل'' انہوں نے اپنے ایک بیٹے ''بابل'' کے نام پر بنوایا۔ جو پھر ''بلوچ'' سلسلے کے بادشاہوں کا عظیم الشان مرکز بنا۔ موجودہ زمانوں کے منتشر خانہ بدوشانہ زندگی گزارنے والے بلوچوں کو دیکھ کر ''بلوچ'' کی تعریف کرنا ایک جہالت اور حماقت کے سوا کچھ نہیں۔

8۔ بلوچوں کا ماخذ دھندلکوں میں نہیں رہتا اگر اسے جان بوجھ کر نظر انداز نہ کر دیا جاتا۔ ہر مصنف اور محقق نے اپنی جستجو رند نسل یا رند قبائل سے شروع کی اور رندوں کی روایات اور ان کی شاعری پر توجہ مرکوز کی اور رند ہی کو بلوچ ماخذ قرار دیا گیا۔ یہی وجہ ہے ہر تاریخ و تذکرہ نویس نے بلوچ تاریخ کو پندرھویں صدی عسیوی سے شروع کیا۔ حالانکہ یہ نام یعنی بلوچ اور اس کا معرب بلوچ و بیلوص، تاریخی تذکروں میں ہزاروں سال قبل پڑھنے اور سننے میں آیا ہے۔ جیسے شہنشاہ کالدیا بلوچ بن الکاؤس، شہنشاہ نینوس بن بلوچ، اسی خاندانی سلسلے کے بادشاہ ''سیمی رامس''، میر سیلوس بن میر سوس، ملکہ بلقیس، نمرود اوّل، نمرود دوئم (جس کے تاریخی قلعہ کے آثار ''سنگگیں ڈور'' (خاکسترندی)، نمرود کلات (قلعہ نمرود) اور ''سوتکال ءِ کلات (قلعہ سوختہ) کے ناموں سے موجود ہے)، مُلک بلوچ، جس کا تذکرہ آٹھویں صدی عیسوی کی عربی تاریخوں میں موجود ہے، ساتویں

صدی عیسوی کے دوران وادی مستونگ اور کوئٹہ کے دشت میں بلوچ قبائل اور جنگجوؤں کا تذکرہ جو شاہنامہ فردوسی وغیروں میں کیا گیا ہے، اور اس سے قبل کا بلوچ ملک ''بیلوص'' جس میں مستونگ سے تا حدود تفتان و قندھار و بلخ و بست وغیرہ شامل تھے، محققین کی تحقیق کی بے حساب کڑیاں ہیں جن پر کام کر کے بلوچ ماخذ تک پہنچا جا سکتا تھا۔ لیکن یہ سارا کچھ نظر انداز کیا گیا اور سطحی کام کیا گیا اور مفروضوں کا انبار لگا دیا گیا۔ اس سلسلے میں رالنسن پہلا شخص تھا جس نے صدیوں پیچھے نظر دوڑائی اور شامی ماخذ کی کہانی کو جزوی طور پر ایک مذہبی نقطہ نگاہ سے بیان کیا اور قدیم دیوتا ''بعل'' کے پجاریوں کو بعل کی نسبت سے ''بعلوص'' یا بیلوص بتایا۔ یہ بندش اُس کی اپنی ذہنی اختراع لگتی ہے۔ بنیادی نام ہی ''بلوچ'' ہے جسے معرب صورت میں کہیں بلوص، کہیں بیلوص اور کہیں بعلوص اور بعلوث لکھا گیا ہے۔ قندھار اور بُست دارالحکومت رکھنے والے ملک ''بلوچ'' کو عربوں نے ''بیلوص'' کہا اور لکھا جبکہ ترکستان والوں نے اسے ''بیلوص'' بتایا۔ ہوتے ہوتے یہ ''بعلیس، بعلیش، پھر بالش اور والشان کی مختلف صورتوں تک پہنچا یہاں تک کہ بے نشان ہو گیا۔ اس بے نشانی میں بھی اُس قبیلائی جگر شوں کے قدیم ترین نام انہی حدود میں مواضع کے اسماء کی صورت میں امر ہو گئے۔ اسی ''ماخذ'' کے سلسلے میں کتاب ''بلوچ قوم......تاریخی واقعات اور حقائق'' کے مصنف احمد خان قیصرانی نے قدیم تواریخی کُتب کے حوالوں سے لکھا ہے کہ بلوچ خاندان کے بائیس یا تئیس بادشاہوں نے ملک لیڈیا پر 400 ق م سے 690 ق م تک حکمرانی کی تھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ شہنشاہ بلوص کی وفات کے

بعد اس کا فرزند شہنشاہ نینوس اور اُس کے بعد سیمی رامس اور آخر میں میر سیلوس بن میر سوس نے حکمرانی کی۔ وہ لکھتے ہیں کہ بیلوص (بلوچ) بن الکاوس ہی وہ بلوچ اعظم ہے جس کے نام پر بلوچ قوم دنیا کے گوشے گوشے میں آباد ہے۔ اسی بلوچ اعظم کی اہلیہ ملکہ بلقیس تھیں جن کے بطن سے ایک فرزند بادشاہ نینوس تھے۔ قیصرانی صاحب نے چند قدیم ترین حوالوں کے ساتھ ایک مشہور و معروف تاریخی کتاب ''دی ہسٹاریکل لائبریری کا بھی حوالہ دے کر لکھا ہے کہ اس کتاب میں جناب بلوص کے کردار پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کتاب کا انگریزی ترجمہ ایک دانشور اور محقق مسٹر جی۔ بوتھ نے کیا ہے۔ کتاب ڈیوا ڈورس سیکولس کی تحقیقی کاوش ہے۔ نیز دیکھئے موضوع ''بلوچستان کے بلوچ'' کا حاشیہ نمبر 2۔

9۔ دیکھئے ''بلوچستان کے بلوچ'' موضوع کا حاشیہ نمبر 3۔

10۔ موجودہ زمانے میں ''کیکان'' کی نشاندہی میں مورخین ناکام رہے ہیں۔ کیچ مکران اور خضدار کے درمیان کوئی ایسا قابل ذکر مقام نظر نہیں آتا جس کے خرابات اور کھنڈرات وغیرہ پر کیکان کا گمان کیا جاسکے۔ جھلاوان گزیٹر کے یورو پی مصنفین نے اسے قلات کے خطے پر گمان کیا ہے اور اس کا مرکزی مقام ''نال'' کو بتایا ہے جبکہ یہ انکشاف کسی آثار قدیمی تحقیق کا نتیجہ نہیں ہے۔ کیکان ایک قدیم ترک یا عرب (قعیقعان) قبیلہ گذرا ہے۔ جس کا آباد کیا ہوا موضع نے تاریخ میں ایک ملک کی حیثیت اختیار کرلی تھی۔ یہ ملک ایک قدیم ملک معلوم ہوتا ہے کیونکہ عربوں کے حملوں کے زمانے میں اس ملک میں جاٹ

قبائل رہتے تھے جنہوں نے کئی عرب حملوں کا مقابلہ کیا۔ اس ملک پر بار بار حملوں سے اس کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہاں پر کئی سپہ سالار جنگوں کی بھینٹ چڑھے اور سینکڑوں لوگ شہید ہو گئے۔ ایسا تاریخی مقام صدیوں تک سطح زمین پر اپنے خاموش آثار یقیناً چھوڑ جاتا ہے لیکن ''نال'' جیسی غیر اہم جگہ اور سیدھی سادی سطح زمین کسی طرح بھی کیکان نہیں ہوسکتا۔ یہ اہم ملک جو قلعوں اور مقبروں سے خالی نہیں تھا ''خاران'' ہی ہوسکتا ہے جس میں قلات بھی شامل ہوا ہوگا جہاں پر بے اندازہ تاریخی قلعوں، گنبدوں اور شہدا کے مقبروں جن پر کئی عربی نام بھی کندہ ملے ہیں کے بے شمار آثار پھیلے ہوئے ہیں جتنے آثار سطح زمین پر موجود ہیں ان سے کئی گناہ زیادہ آثار وہاں صبح و شام اڑتی ہوئی ریت اپنی تہوں میں چھپائے ہوئے ہیں۔ خاران کے بعد اگر کوئی مقام کیکان ہوسکتا ہے تو پھر وہ مشکے کا ملک ہوگا۔ ان دونوں کے بعد جس علاقے پر اس کا گمان کیا جاسکتا ہے وہ پھر خضدار اور کچھی کا درمیانی کوہستان یعنی مولہ کا کوہستان ہوسکتا ہے جہاں پہاڑی دامانوں اور ان کی چوٹیوں پر سنگین قلعوں کے ملبے اور چپے چپے پر گمنام شہدا کے مقبرے پھیلے ہوئے ہیں۔

ایک اور اہم بات جس پر توجہ نہیں دی گئی ہے وہ ہے دو ''کیکان'' ملکوں کا ذکر جنہیں ایک ''کیکان'' سمجھا جارہا ہے۔ ایک تو صرف ''کیکان'' ہی کہلاتا ہے جبکہ دوسرا جمع کی صورت میں ''کیکانان'' کہلاتا ہے۔ تاریخی کتابوں میں دونوں نام بیان ہوئے ہیں لیکن انہیں ایک ''کیکان'' یا ''کیکاناں'' سمجھا گیا ہے۔ جو بالکل غلط ہے۔ یہ دونوں

الگ الگ ہیں اسی لئے تاریخی کتابوں میں اس بارے میں بیانات بھی متضاد لگتے ہیں۔ یہ عقدہ آثار قدیمہ کی تحقیقی کاوشیں ہی حل کر سکتی ہیں۔

11۔ بلوچوں میں وسط ایشائی نظریہ یقیناً بے بنیاد نہیں ہے لیکن یہ نظریہ ''بلوچ نسل'' یا بلوچ مرکزہ کے متعلق غلط ہے۔ بلوچوں میں تُرک عنصر نہایت قوی ہے جیسے کہ پچھلے صفحات میں مکران کا قدیم اور طاقتور قبیلہ رئیس کی مثال دی گئی ہے جو کیپیئین کا اوغز ماخذ ہے اور ترکمان کا برادر قبیلہ ہے۔ دوسرا سب سے بڑا عنصر رند قبائل کا ہے جو تُرکی کے اناطولیہ کی نسل ہے۔ لیکن یہ سب بلوچ مرکزہ کے ارد گرد کے جمع ہونے والے شاہی پروانے ہیں۔ بلوچستان کے پورے خطے میں جگہ جگہ تُرک قبائل کی آبادکاری کے بے شمار آثار ہیں۔ قدیم طوران کے بعد بلوچ سرزمین پر ترک قبائل کی آبادکاری کا نتیجہ دوسرا چھوٹا طوران ہوا جس کا مرکز خضدار تھا۔ یاد رہے کہ ''طور'' ایک بڑا ترک قبیلہ رہا ہے آج بھی منتشر گھرانوں کی صورت میں جگہ جگہ موجود ہے۔ ''طوران'' قبیلہ ''طور'' کی جمع کی صورت ہے۔ نیز دیکھئے ''بلوچستان کے بلوچ'' کا حاشیہ نمبر 3۔

12۔ دیکھئے اسی سلسلے کا حاشیہ نمبر 4۔

13۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ''ہوت'' قبیلہ ایک پُرانا قبیلہ مانا جاتا ہے اور صدیوں سے وہ رند قبائل کی بجائے قبیلہ رئیس سے منسلک ہے اور اپنے آپ کو رئیس قوم کا جو اپنے کو مکران کا بنیادی قوم ''بیج دار'' سمجھتا آرہا ہے، مرکزی قبیلہ اور سردار گھرانہ کہتا ہے۔ اس کے بزرگوں کا کہنا ہے کہ:

''جلال خان کا ایک بیٹا ہوت نامی ضرور تھا
لیکن قبیلہ کا ہوت بن جلال خان سے کوئی
تعلق نہیں ہے بلکہ جو ہوت کیچ کا حاکم تھا وہ
قبیلہ رئیس سے تھا اور اس کے باپ کا نام میر
عالی رئیس تھا''

مندرجہ بالا موقف موسیٰ زئی رئیسوں کی ہے۔ کیچ کے شہر تُربت میں جو رئیس قبیلہ آباد ہے انہیں ہوت بھی کہتے ہیں اور رئیس بھی۔ اسی طرح پنجگور کے تاریخی حاکم میر کمبر رئیس نے، جو شمالی بلوچ خطہ ''سرحد'' (بشمول علاقہ تفتان و کرمان کے مشرقی اضلاع) کا بھی حکمران تھا، جب قلات وزہری پر یلغار کر کے ان پر قابض ہوا اور جو خوانین بلوچ کا جدّ امجد تھا، ہوت بھی کہلاتا ہے۔ قاضی نور محمد گنجابوی نے جو فارسی زبان میں منظوم ''جنگ نامہ نصیر خان'' (نوری، خان قلات) لکھا ہے اُس میں وہ میر کمبر رئیس کو قبیلہ ہوت سے تحریر کرتا ہے۔ ہوت قبیلہ کی اپنی روایتیں بھی ایک موقف کی نہیں ہیں۔ ڈسٹرکٹ گزیٹرز بلوچستان، مکران ڈسٹرکٹ، مطبوعہ گوشہ ادب کوئٹہ 1997ء صفحہ 735 میں لکھا ہے:

''وہ رندوں سے خونی یگانگت کے دعویدار
ہیں۔ اور بلوچ بیت کی سند پر انہی کے ہم
جد مانے جاتے ہیں۔'' میر جلال کے چار

بیٹے تھے۔ لاشار اور رند سردار تھے۔ اور
ہوت اور بلوچ گلہ بان''
(جلال خان کے بیٹوں میں ''بلوچ'' نامی
بیٹے کی روایت مشکوک ہے۔نسیم)

کچھی ڈسٹرکٹ کے مرتب کنندگان نے اُن کی درج ذیل روایت کا تذکرہ کیا ہے:

''مکران کے ہوت متفقہ طور پر علاقے کے
قدیم باشندے سمجھے جاتے ہیں اور وہ خود بھی
رندوں اور علاقہ کے دیگر بلوچ قبائل سے
ایک الگ نسل ہونے کے دعویدار ہیں''
(بلوچستان ڈسٹرکٹ گزیٹر کچھی اور گزیٹر
سبّی ،مطبوعہ گوشۂ ادب کوئٹہ 1997ء صفحات
(996،228

مندرجہ بالا متضاد روایتوں کے پیشِ نظر یوروپی مصنّفین نے اُنہیں ''ہوت'' سے ملتے جلتے ایک قدیم قبیلائی اصطلاح ''اوریتائی'' یا ''حوریتائی'' سے قرار دیا اور لکھا کہ یہ علاقے کے قدیم باشندے ہیں جن سے سکندر مقدونی کو مکران ولسبیلہ کے سفر کے دوران واسطہ پڑا تھا:

''اغلب ہے کہ وہ اوریتائی یا جوریتائی کے
باقیات ہوں جو سکندر کو مکران کے راستے
مغرب کی طرف جاتے ہوئے ملے تھے۔''
(ڈسٹرکٹ گزیٹر و مکران، مطبوعہ گوشۂ ادب
کوئٹہ، 1997ء صفحات نمبر 996اور
(735،675

یوروپی مصنفین کا مذکورہ خیال ایک بے بنیاد خیال اور مفروضہ ہے۔ وہ اکثر ملتے جلتے ناموں سے متاثر ہو کر تحقیق کی سرگردانیوں سے گریز کرتے ہوئے سطحی خیال آرائی کرتے ہیں۔ اور قاری کو گمراہ کرنے کا باعث بنتے ہیں۔ انہیں سکندر مقدونی کے زمانے کے ''حوریتائی'' اور بلوچوں کے قبیلہ ہوت کے ناموں میں صرف معمولی سے صوتی مشابہت نظر آئی تو جھٹ سے فیصلہ صادر کر دیا کہ ''ہوت'' قدیم حوریتائی ہیں۔

واضح ہو کہ لفظ حوریتائی بنیادی طور پر صرف ''حوری'' ہے۔ لفظ ''تائی'' یونانی زبان میں ''گروہ'' اور ''لوگ'' کے معنی دیتا ہے۔ جسے قبیلہ کے بھی معنی دیئے جاتے ہیں۔ یونانی ہی اس لفظ کا ایک مترادف ''یائی'' بھی ہے۔ ''حوریتائی'' سے مراد ''حوری'' قبیلہ یا ''حوری'' لوگ ہیں اور انہوں نے بھی اسے انہی معنوں میں استعمال کیا ہے۔

لفظ ''حوری''، ''حور'' (معرب خور) کی نسبت سے ہے ''خور'' خلیج، کھاڑی کو کہتے ہیں، یعنی پانی کا وہ حصہ جو بہاؤ سے ہٹ کر خشکی میں دور تک چلا گیا ہو اور جھیل کی

صورت میں ٹھہرا ہوا ہو۔ ایسی کھاڑیوں میں غریب مچھیرے جالوں سے مچھلیاں پکڑتے ہیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے ہیں۔ یہی مچھیرے ''حور'' کی نسبت سے ''حوری'' کہلاتے ہیں جو یونانی زبان میں ''حوری تائی'' بنتا ہے۔ یہ مچھیرے جو سکندر کے زمانے میں ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ آباد تھے آج بھی بلوچی زبان میں ''حوڑی'' کہلاتے ہیں۔ سندھی اور جدگالی میں انہیں ماچھی اور میانی کہا جاتا ہے۔ وسیع معنوں میں ان کا شمار میدوں میں ہوتا ہے۔ یہ کوئی نسل یا جدّی قبیلہ نہیں ہے بلکہ مشترکہ روزگار یا کسب کی بنا پر ''حوڑی'' کہلاتے ہیں۔ موجودہ وقت بھی یہ کسبی گروہ لس بیلہ، پنجگور، کیچ اور ایرانی بلوچستان کے علاقوں میں اسی نام سے موجود ہیں اور ندیوں سے جالوں کے ذریعہ چھوٹی مچھلیاں پکڑنے کا کام کرتے ہیں اور اپنی روزی کماتے ہیں۔ ان حوریوں یا حوریتائیوں سے قبیلہ ہوت کا کچھ بھی تعلق نہیں ہے اور معاشرے میں یہ پست حیثیت کے حامل ہیں۔

14۔ مردم شماری رپورٹ انڈیا 1901ء، جلد پنجم صفحات 95-94۔

15۔ ظاہر بات ہے کہ سندھ کی تپتی اور جھلساتی ہوئی دھوپ میں سڑکوں پر دانہ چُننے والا بلوچ یا غیر بلوچ جب اپنے بال بچوں کے معاش کی تلاش میں خاک چھانتا پھرتا ہے تو اُس میں کونسا نسلی یا خاندانی حسن و نزاکت برقرار رہ سکتی ہے۔ یہ کالی کھال اور داغدار چہرہ کوئی نسلی خصوصیت نہیں ہے جسے یہ گورا سندھ کے غریب بلوچ میں تلاش کرتا ہے۔ لگتا ہے کہ یہ بے مغز گورا جس کے نفرت بھرے جملوں میں اُسکی چھپی کدورت جھلکتی ہے، انسانوں پر موسمی اثرات کے قدرتی عمل سے لاعلم ہے۔

16۔ خوبصورت آنکھوں میں بدنیتی نہیں نیک نیتی جھلکتی ہے۔ تمام یوروپی مصنفین میں یہ واحد مصنف ہوں گے جو بدنیتی کو خوبصورت آنکھوں میں تلاش کرتے ہیں۔

17۔ واسکٹ پہننا چاہے ضرورت کیلئے ہو یا لباس کو اپنے خیال میں جاذب نظر بنانے اور قدرے منفرد نظر آنے کیلئے ہو یہ کوئی تہذیبی شناخت ہے اور نہ یہودیوں سے اخذ کردہ رسم۔ بلوچوں کا یہودیوں سے کونسا تاریخی، تہذیبی، علاقائی یا مذہبی تعلق رہا ہے جو انہیں یہودی روایت اپنانے کی ترغیب دے۔ چونکہ وہ یہودی روایت کے مطابق لباس نہیں پہنتے اس لئے ان کا لباس قابل مذمت اور حقیر بن جاتا ہے۔

18۔ مصنف کو غلط فہمی ہے۔ بلوچوں کا اسلحہ سے لیس ہونا بھی ان کی اپنی قدیم ترین سامی روایت ہے، عربوں کی تقلید نہیں ہے۔ عربوں نے بھی یہ روایت اپنے سامی اجداد سے وراثت میں پائی ہے۔ بلوچوں کا عربوں سے مخلوط قسم کا طویل میل جول کبھی بھی نہیں رہا ہے اس کے برعکس وہ ایرانیوں سے صدیوں تک میل جول رکھتے رہے ہیں اور اکثر بلوچ علاقے ایرانی حکمرانوں کے ماتحت رہے ہیں اور فارسی زبان کی ان پر بالادستی بھی رہی ہے لیکن ان کے طاقتور امتیازی کلچر نے ایرانی کلچر کو قبول نہیں کیا اور سینکڑوں سالوں سے دونوں میں ایک واضح حدّ فاصل قائم ہے۔ مصنف نے اپنی تحریر میں بلوچوں کی شکل وصورت کے بارے میں خود تسلیم کیا ہے کہ وہ عربوں، ایرانیوں، افغانیوں وغیرہ سے مختلف ہیں۔ بلوچوں کا یہ امتیازی صفت ان کے لباس، زبان، رسوم وعادات اور تاریخ وجغرافیہ میں بھی صدیوں سے قائم ہے۔ یہاں ہم ایک ایرانی دانشور فردوس جمال کا ایک

مختصر تجزیہ پیش کرتے ہیں جو انہوں نے بلوچ کیریکٹر پر لکھا ہے۔فردوس جمال کا زمانہ 1623-1705ء ہے۔

> ''بلوچ جنگ وجدل کا شوقین ہے لیکن وہ سپاہی بننے سے نفرت کرتا ہے۔ وہ موسیقی کا دلدادہ ہے لیکن موسیقار کو اچھا نہیں سمجھتا، وہ مہربان اور نہایت شریف ہے لیکن اس کی نمائش نہیں کرتا، وہ جوشیلا غصیلا اور غریب ہے لیکن اپنے عجیب اصولوں پر فخر کرتا ہے وہ اپنی نئی بندوق اور پُرانی بیوی سے محبت کرتا ہے، وہ موت کو قبول کرے گا لیکن اپنے قول سے ایک قدم پیچھے نہیں ہٹے گا۔ وہ ایک مہربان اور مخلص دوست مگر دشمنی میں کٹر بھی ہے۔''

بلوچ قوم کی دیگر کئی صفات میں سے ایک ''شاہی اور سلطانی صفت'' یہ بھی ہے کہ وہ کسی کی، کسی بھی تہذیبی صفت سے متاثر نہیں ہوتا لیکن کسی عرب، عجم، شامی وعراقی وخراسانی کی تقلید نہیں کرتا۔ وہ اپنی قدیم ''سلطانیں سر'' جسے ایرانی ''پدرم سلطان بود'' کہتے ہیں، پر ابھی تک نازاں ہے اسی لئے کسی کو اپنا ہمسر نہیں سمجھتا۔

19۔ یہ بیان مصنف کا یہودی جھوٹ ہے۔ بلوچوں کی کوئی تحریری اور نہ زبانی ایسی روایت ہے۔ اگر وہ پٹھانوں کے بارے میں یہ بات کہتے تو اس کی بات میں وزن ہوتی کیونکہ پٹھان تاریخ نویس اپنے کو یہودی نسل سے کہتے ہیں۔ اور ان کی عادات واطوار بھی اس پر دال ہیں۔ لیکن بلوچ کے بارے میں یہ دروغگوئی ہے اور بلوچوں پر ایک بہتان ہے۔ بلوچ قوم نہ دین موسوی کے بارے میں علم رکھتا ہے اور نہ یہودی روایات کا اُسے معلوم ہے۔ نیز مصنف کے کہنے کے بالکل برعکس بلوچ خدوخال بھی یہودی خدوخال کی ضد ہیں۔ ان کی معلومات انتہائی ناقص اور جہالت کے غماز ہیں۔

20۔ بلوچوں میں یہ شادی زبردستی نہیں کی جاتی بلکہ بیوہ اور اُس کے خاندان اور وارثوں کی مرضی پر منحصر ہوتی ہے۔ بلوچ عورت اگر چہ اپنے ماحول میں بادشاہت نہیں کرتی لیکن اپنے ہمسایہ قوموں میں سب سے زیادہ باوقار غیرت منداور نسبتاً زیادہ آزادی رکھتی ہے اور بیشمار حقوق سے استفادہ کرتی ہے۔ اُس کا قیمتی اور خوبصورت لباس اور پہنے زیورات اس چیز کی گواہی دیتے ہیں کہ وہ تنگدست محتاج اور غلام نہیں ہاں البتہ ایک مہذب ومعزز دائرے میں ضرور ہے اور بے لگام نہیں ہے۔ وہ خود بھی اپنے ''سلطانیں سر'' کی حیثیت اور مقام سے بے خبر نہیں ہے اس لئے اس کے مالکوں کو اُس کی نگرانی اور جاسوسی نہیں کرتی پڑتی۔

21۔ شوہر کا طلاق کا حق اسلامی شریعت کا نتیجہ ہے نہ کہ یہودی کلچر کا جس سے بلوچ نسل کا کوئی قدیم ترین تعلق بھی نہیں ہے۔

22۔اوپراس پروپیگنڈے کا جواب دیا گیا ہے۔

23۔نظم وضبط کے حوالہ سے اعلیٰ کردار کوہستانی اور خانہ بدوشانہ زندگی میں حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اُس کیلئے ایک ترقی یافتہ معاشرہ اور باقاعدہ منصوبہ بندی کے تحت رہنمائی وتربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر بھی بلوچ معاشرہ اپنے ہمعصر اقوام سے نسبتاً کئی گناہ زیادہ مہذب ہے۔اور جہاں جہاں اس کا معاشرہ خالصیت کے زیادہ قریب ہے وہاں اُس کا کردار ہمہ پہلو مثالی اور قابل رشک رہا ہے۔مصنّف ایک تو ذہنی لحاظ سے متعصب اورزہرآلود ہے جسے یقیناً قدم قدم پر بلوچ مزاحمت نے ایک خاص بلوچ مخالف رُخ پر ڈال دیا ہے جو بلوچوں میں کئی اچھی صفات کو دیکھ کر بھی انہیں حقیر بنانے کی کوشش کرتا ہے۔اور دوسری طرف وہ سندھ کے مخلوط بلوچ معاشرے سے ایک خالص بلوچ کلچر کی صفات کا متلاشی ہے جو بذات خود ایک نادانی ہے۔

تالپور بلوچ حکمرانان سندھ

مندرجہ بالا موضوع کے تحت سندھ کے تالپور بلوچ حکمرانوں کی سیاست، طرز حکمرانی، عوام کے ساتھ ان کا برتاؤ ان کے آپس کے تعلقات، ان کے مشاغل اور حکومتی دربار کے بارے میں سیاحوں اور تبصرہ نگاروں کے بیانات دیئے جائیں گے۔ یہ منتخب پیرے یوروپی مصنفین کی تصانیف سے معروف مورخ اور دانشور جناب مبارک علی نے نچوڑ کر اپنی تصنیفات میں بلاتبصرہ پیش کئے ہیں۔

ناتھن (Nathan Crow) نے 1799ء تا 1800ء کے دوران سندھ کی سیاحت کی اُس نے اپنی کتاب ''اکاؤنٹ آف دی کنٹری آف سندھ'' میں تالپور حکمرانوں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''میر فتح علی خان اپنے قبیلہ کا سردار ہونے
> کے باوجود سندھ کا خودسر حکمران نہیں ہے۔
> انہوں نے حکومت کو مضبوط اور ملک کو کمزور
> ہونے سے بچانے کیلئے اپنے اقتدار میں

اپنے بھائیوں کو شامل کرلیا ہے۔ وہ ایک ذہین
اور سوجھ بوجھ رکھنے والا اور مشکل معاملات کو
سلجھانے والا شخص ہے۔ اُس کا دوسرا بھائی
میر غلام علی خان ایک طاقتور اور فہم اور فراست
رکھنے والا شخص ہے۔ دوستانہ مزاج رکھتا ہے
لیکن جلد باز ہے۔ جب چاہے اپنے سردار
بھائی کی اجازت کے بغیر دربار لگا سکتا ہے۔
اُس کے تعلقات قندھار تک پہنچے ہوئے
ہیں۔ تمام بھائیوں کی زمینیں، علاقے اور
اختیار الگ الگ ہیں۔ ہر ایک کے پاس
فوجیوں کا ایک چھوٹا سا دستہ ہے۔ جو ان کے
گھروں پر تعینات ہیں۔ دشمنوں کے مقابلے
میں ان چاروں بھائیوں کا اتحاد مثالی ہے۔
میر فتح علی خان کی نرینہ اولاد نہیں ہے۔
چاروں بھائیوں کی چویاری حکومت مشہور
ہے۔ دربار میں نواب اور اس کے بھائی مرتبہ
کے مطابق نشستیں رکھتے ہیں اور مسلح رہتے۔

ہیں۔ ہر ایک کے پاس ڈھال بھی ہوتی ہے۔ چاروں بھائی اکھٹے کھاتے اور ایک ہی کمرے میں سوتے ہیں۔ ہتھیار ان کے پہلو میں رکھے ہوتے ہیں (صفحات 17-12)'' تمام سندھ میر فتح علی خان، سہراب خان اور میر ٹھارہ خان کی سرداری میں ہے۔ کاشتکاروں پر حکومتی مظالم ہیں اور ٹھٹھہ کے کئی کاروباری ہندوستان چلے گئے ہیں۔ سندھ کا دارالحکومت حیدرآباد شہر اور قلعہ کی آبادی تیس ہزار کے قریب ہے۔ قلعہ کی فصیل اونچی ہے جس پر بھاری توپیں نصب ہیں۔ دیواریں موٹی اور گہرائی میں ہیں۔ پورا اینٹوں کا بنا ہوا ہے اور مضبوط ہے۔ دیواریں بغیر بناوٹی کام کے ہیں اور قلعہ مرعوب کن نہیں ہے۔ ٹھٹھہ چالیس ہزار اور واحد بندرگاہ کراچی ماسوائے شاہ بندرا اور لاہری بندر (1) کے دس ہزار کی آبادی رکھتی ہے۔ کرمتی

(کلمتی) قبیلہ لاہری بندر کے آس پاس آباد ہے۔ نوموردی (نہمردی)، جھوکیہ اور کرمتی (کلمتی) کل بیس پچیس ہزار کے قریب ہیں یہ پیشہ ورانہ فوجی ہیں۔

کراچی کے چاروں طرف مٹی کی دیوار ہے جو موٹی ہے اور جس پر کچھ توپیں نصب ہیں۔ یہاں سے تقریباً تین میل دور جہاز سمندر میں اُترتے ہیں لیکن ان توپوں کے نشانے پر ہیں۔ بعض توپیں بہت ہی بھاری ہیں۔ یہاں کے امیر اور بلوچی (بلوچ) دراز قد، موٹے تازے ہیں۔ سندھی فریبی، نیچ اور بے صبر ہیں ان پر بہت کم اعتبار کیا جاتا ہے۔ ان میں مذہبی جوش وخروش نہیں ہے۔ ان کا شوق کاہل سیدوں کی خدمت اور مقبرے سجانا ہے تمام امیر اور ان کے شہزادے گھڑسوار، نشانہ بازی اور بندوقوں اور تیر کمانوں کے ماہر ہیں۔ عام سندھیوں

میں کچھ بھی مہارت نہیں ہے۔ موجودہ امیروں کی آمد کے بعد سندھیوں نے اپنا ہندوستانی فیشن ترک کیا ہے۔

امیروں کے ایک شہزادے نے حیدرآباد کے آس پاس کی زرخیز زمینوں کو غیر آباد کر کے شکار گاہ بنائی ہے۔ ایک چھوٹے شہزادے نے ایک قدیم گاؤں کے لوگوں کو بیدخل کیا تاکہ ان کی مویشیاں اور مرغوں کی بانگیں اس کے شکار کے شغل کو خراب نہ کریں"

"سندھ کا مالیاتی آمدنی چالیس لاکھ روپے ہے۔ اسمیں سے چوتھائی میر فتح علی خان کا ہے۔ دس ہزار کابل کے بادشاہ کو خراج جاتا ہے۔ میر سہراب کو ملنے والا مالیہ تقریباً گیارہ لاکھ اور میر تھارہ خان کو چار لاکھ ہے۔ کلہوڑہ خاندان سے ملنے والی جائیداد علاوہ ہے۔ امیروں کے خزانے ریگستانوں میں بتائے گئے ان کے قلعوں میں محفوظ ہیں۔ ہنگامی حالات میں یہ قلعے ان کی پناہ گاہیں

ہیں۔ زمینداروں، کاروباریوں پر محصولات اور مظالم تجارت کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ مالیہ کا پانچواں حصہ مالیہ وصولی کیلئے خرچ میں جاتا ہے۔ اس میں امیروں کے گھروں کے خرچے بھی شامل ہیں۔"

"تالپور فیملی کے پاس چالیس ہزار کی فوج ہے جو بہت مستعد ہیں اور پیش قدمی کے لحاظ سے یہ پوری دنیا کے تمام افواج سے نہایت تیز تر ہیں۔ میر فتح علی خان کم وقت کے نوٹس پر پچیس ہزار فوجی میدان میں لا سکتا ہے۔ امیروں میں سے میر سہراب کی کمان میں دس ہزار اور میر تھارہ کی کمان میں پانچ ہزار کی بہترین فوج ہے۔ ان کا اسلحہ توڑے دار بندوقیں اور تلواریں ہیں اور میر فتح علی خان کے پاس توپ خانہ بھی ہے۔ ایک مخصوص تنخواہ دار فوجی ٹولہ ہر ایک کے پاس ہر وقت موجود ہوتی ہے۔"

ایک اور یورپی سیاح ہنری پوٹنگر نے 1809ء میں سندھ کا دورہ کیا۔ بلوچستان کو تو وہ پہلے گھوم پھر کر دیکھ چکا تھا۔ انہوں نے دونوں ملکوں کے بارے میں اپنی یادداشتیں تحریر کیں۔ تالپور بلوچ حکمرانوں کے بارے میں ان کا تجزیہ اس طرح ہے:

"جون 1779ء میں ایک بلوچی قبیلہ ٹالپر کے سردار نے اپنے بڑے بھائی اور موجودہ میروں کی رہنمائی میں کلہوڑہ نوابوں کے خلاف بغاوت کرکے ان کے تقریباً سو حمایتیوں کو قتل کرکے کلہوڑہ نواب کو بیدخل کیا جو مدد کیلئے قندھار چلا گیا۔ تیمور شاہ نے اپنے سپہ سالار مدد خان کی سرکردگی میں ٹالپروں کے خلاف ایک فوج بھیجی، فوج کے پہنچتے ہی ٹالپر بجانب صحرا نکل گئے۔ جب فوج واپس چلی گئی تو کلہوڑوں کو پھر نکال باہر کیا گیا۔ 1786ء میں کابل نے ایک اور فوج بھیج دی۔ لیکن تالپوروں کی فوج نے شکار پور کے قریب جیوند کے مقام پر افغان فوج کو شکست دیدی اور افغان فوج فرار ہوگئی۔ پھر

تالپوروں اور افغان شاہ کے درمیان معاملات طے پا گئے اور شاہ نے میر فتح علی خان کو حکمرانی پر مقرر کیا۔ اس معاہدے کے تین سال بعد تالپر اُمرا نے شاہ کو خراج دینے سے انکار کیا۔ تیمور شاہ کوئی فوجی کاروائی نہ کر سکا۔ جب 1793ء میں اس کے لڑکے زمان شاہ نے بمشکل چوبیس لاکھ کا خراج قبول کیا جو اصل خراج کا چوتھائی سے بھی کم تھا۔ 1805ء میں شاہ شجاع الملک نے خراج کا مطالبہ کیا لیکن آپس کے گفت وشنید کے نتیجے میں بغیر کسی ادائیگی کے شاہی وفد لوٹا دیا گیا۔"(2)

"میر فتح علی خان نے حکمرانی ملتے ہی اس میں اپنے بھائیوں کو شریک کیا اور ملک کو چار بڑے حصّوں میں تقسیم کیا۔ میر فتح علی خان کی وفات کے بعد بھی تینوں بھائی غیر معمولی طور پر ملک کے انتظام میں ایک دوسرے کے معاون ہیں۔"

''بلوچستان اور سندھ کے باشندے ہم نسل ہیں (3) ان دنوں سندھی اُمراء نے لاڑکانہ کو صدر مقام بنایا ہے جہاں وہ سندھ میں داخل ہونے والوں سے چونگی وصولتے ہیں۔ یہاں ایک فوجی چھاؤنی بھی ہے جسے کچھ گنداوہ کے بلوچوں کے ممکنہ حملوں کو روکنے کیلئے بنایا گیا ہے۔ 1799ء میں تالپور حکمرانی کے بانی میر فتح علی خان نے علی بندر پر ایک عظیم بند باندھ کر نمکین دریا کے پانی کو زرخیز زمینوں کو اُجاڑنے سے بچالیا جو اس سے قبل بارہ میل تک اوپر چڑھ آتا تھا۔ یہ حکمران خاندان کا واحد اچھا کام ہے''۔

''حیدر آباد کا قلعہ میر فتح علی خان نے بنوایا تھا جو موجودہ امیروں کا بڑا بھائی تھا۔ جسے سندھی ناقابل تسخیر جانتے ہیں لیکن یہ یوروپی دشمنی کے سامنے مزاحم نہیں ہوسکتا۔ اینٹوں کی موٹی دیواریں بے ڈھنگی سے

پہاڑیوں کی چوٹیوں کے کناروں پر کھڑی کردی گئی ہیں جو اوپر جا کر پتلی ہو جاتی ہیں۔ گول مینار یں صحیح جگہ پر بنائی گئی ہیں۔ شمال کی طرف ایک خندق ہے جس پر پل بنایا گیا ہے جس پر ایک بُرج ہے۔ قلعہ پر ستر توپیں نصب ہیں، گیٹ پر نصب آٹھ دس توپیں بڑی ہیں لیکن باقی چھوٹی اور ناکارہ قسم کی ہیں۔ قلعہ کے مضافات میں کوئی آٹھ ہزار جبکہ قلعہ کے اندر بھی اتنی ہی تعداد کے مکانات ہیں۔ آبادی دس ہزار ہے۔ لیکن قلعہ کے اندر اسکی آدھی تعداد بھی نہیں رہتی۔ زیادہ تر سپاہی رہتے ہیں۔"

"سندھ کے موجودہ حکمران اپنے شکار کے شوق کی بنا پر ملک کی خوبصورتی اور اپنے عوام کے مفادات کی پرواہ نہیں کرتے اور زرخیز علاقے شکارگاہ بنائے ہوئے ہیں۔ جو علاقے پہلے پیداوار دیتے تھے اب جنگل

بن چکے ہیں۔''

''(امیروں کے دربار میں) کہا گیا تھا کہ جب ہمارا مشن وہاں پہنچے تو تینوں امیر ان کے استقبال کو اٹھ کھڑے ہوں لیکن انہوں نے انکار کیا اور الٹا (سفیروں) کو اسلحہ وغیرہ باہر رکھ کر آنے کا کہا گیا تھا۔ آخر کار ولی محمد (لغاری) کے ذریعہ ہمیں دربار لیجایا گیا اور وہ ہمیں قلعہ کے اندر ایک کشادہ چبوترے کی طرف لے چلے جہاں پر تینوں امیر خوبصورت ایرانی قالینوں پر بیٹھے تھے۔ ہم جوتے اتار کے آگے بڑھے تو امیر اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارے بیٹھتے ہی مسلّح شمشیر باز گھس آئے اور ہمیں محصور کیا، آدھے گھنٹے کی ملاقات کے بعد ہمیں رخصت کا اشارہ دیا گیا۔ یہاں ہندوستان اور ایران کے درباروں کی طرح رخصتی کیلئے کوئی رسم موجود نہیں تھا۔

تینوں امیر اپنی اپنی عمروں کے مطابق بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کی تلواریں اور خنجر اور کمر پٹیاں جواہرات سے مرصّع تھے اور خود بھی بیشمار جواہرات پہنے ہوئے تھے۔ ان کے ریشمی گدے اور تکیے سونے اور چاندی کے پھولوں سے منقش تھے اور جواہرات سے چمک رہے تھے۔ امیر اوران کے وزرا بہترین پوشاکوں میں تھے اور پورا منظر نہایت دلکش تھا جسکی حیدر آباد کے امیروں کے دربار سے توقع نہیں تھی۔

امیر صحت منداور درمیانہ قد و کاٹھ کے تھے۔ بڑاامیر میر غلام علی پینتالیس سال سے زیادہ کا نہیں لگتا تھا۔ امیر ٹھنڈے طبیعت کے اور رعونت والے مگر ظالم نہیں ہیں۔ ان کی پگڑیاں باریک جالی دار، صاف ستھری اور خوبصورتی سے باندھی گئی تھیں۔ جو بہت ہی موزوں لگتی تھیں۔"

''استقبال کے اگلے دن میروں کو
تحفے بھیجے گئے۔ ان میں چھینٹ کپڑے بھی
تھے۔ جن پر میروں کے نمائندے نے
اعتراض کر کے واپس کرنے کی دھمکی دی تھی
انہیں کیا گیا کہ یہ دوستی کی علامت ہیں۔ اگر
وہ ایسا کرنے کے خواہشمند رہیں تو کوئی بات
نہیں مگر پھر امیران سندھ کو عزت مآب گورنر
جنرل کو اس اقدام کی جوابدہی کرنی ہوگی۔
اس پیغام پر امیروں کو سانپ سونگھ گیا اور فوراً
بطور تحفہ تلوار، گھوڑے اور دیگر چیزیں بھیجی
گئیں۔ دوسری باریابی کے موقع پر پہلی والی
صورتحال نہیں تھی۔ ایک مودبانہ اور معززانہ
ماحول تھا۔ شاید پہلی باریابی میں وہ جان کی
امان کے خطرے میں تھے۔ وہ بار بار ہماری
تلواروں کی صناعی کا معیار دیکھتے رہتے تھے۔
انہوں نے اپنی تلواریں اور خنجر وغیرہ بھی
دکھائے اور کہتے تھے کہ وہ ہر سال بہترین

اسلحہ خرید کرنے کیلئے اپنے نمائندے ایشیائے کوچک اور ایران روانہ کرتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ تلوار اور اسلحہ جات کا انہیں جنون تھا۔ اسی جنون کا اثر ہے کہ حیدرآباد میں عمدہ اسلحہ بنایا جارہا ہے۔ امیر بہترین لباسوں اور موتیوں کے ہار پہنے ہوئے تھے۔ ایک کے خنجر میں کبوتر کے انڈے سے بڑا ایک گول زمرد لٹک رہا تھا۔"

"امیروں کے وزیر بقا خان، ولی محمد خان (لغاری) اور مشتک رام قابل لوگ اور امیروں کے معتمد تھے۔ حیدرآباد قیام کے دوران امیران میں پہلی والی احساس برتری دیکھی نہیں گئی اور ہمارے سفیر کو بہترین سفارتی کاری پر ان کے افسران نے بہت داد دی"

1809ء میں سندھ کی سیاحت کرنے والے سیّاح ایچ۔ ایلس نے تالپور حکمرانوں کے بارے میں تبصرے کئے ہیں۔ یہ تبصرے ان کی تصنیف "میموریز آن دی

سٹیٹ اینڈری سورسز آف سندھ اینڈ کارسپنڈنس وِدغلام علی ٹالپر'' سے اخذ کئے گئے ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

''میر غلام علی کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ ایک ظالم، لالچی اور دھوکہ باز ہے۔ اس کا بھائی میر کرم علی اگرچہ اپنے بڑے بھائی جیسا نہیں ہے مگر وہ بھی اپنے علاقے میں ایک جابر حاکم ہے۔ وہ فیصلہ کرنے میں کمزور ہے اور فیصلوں پر استقامت نہیں رکھتا۔ میر مراد علی اپنے بھائیوں سے قدرے اچھے اوصاف کا مالک ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ حاکمیت پر قبضہ جمانے کی نیت رکھتا ہے۔ وہ میر غلام علی کے حکمرانی کی گرفت کو کمزور کرنا چاہتا ہے۔

میر فتح علی خان کے بیٹے میر صفدر کی جانب سے اقتدار میں حصہ مانگنے کے خطرے کے پیش نظر میر غلام علی نے اُسے اپنا داماد بنالیا ہے''

''سندھ میں مسلمان اور برہمن دونوں کو

مساوی طور پر امیروں کا اعتماد حاصل ہے سب
کو مذہبی آزادی ہے۔ امیر شیعہ مسلک کے
ہیں جبکہ عوام کی اکثریت سنّی ہے۔

ٹھٹھہ موجودہ حکمرانی میں تجارتی
لحاظ سے زوال پذیر ہے۔ میر غلام علی نے
یہاں سے مالیہ اور کسٹم کی مد میں ایک لاکھ
پینتالیس ہزار روپیہ کے قریب وصولا ہے۔

شاہی خاندان کی اہم شخصیتیں ٹنڈو
محمد خان کا رہائشی اور میر ٹھارہ خان کا بہنوئی
میر سلطان علی، حیدرآباد کے شمال میں
دریائے سندھ کے مغربی کنارے کے رہائشی
میر بھاگہ (4)، حیدرآباد کے میر غلام حسین
ولد بیجور جو موجودہ امیروں کا چچا ہے اور کمسن
میر صفدر ولد میر فتح علی خان ہیں۔

بارسوخ اور معتمد سرداروں میں میر
ولی محمد خان، وزیراعظم اسماعیل کوہ تن اور
مخدوم علی شامل ہیں۔ مخدوم علی کو ولی محمد کا دشمن

جانا جاتا ہے۔ ولی محمد لغاری کا پورے سندھ میں کوئی ثانی نہیں ہے۔(5) وہ ایک انتہائی معتمد اکنامسٹ ہے۔ وہ طاقتور بلوچ قبیلہ لغاری کا سردار ہے۔ آخوند محمد بقا انگریزی حکومت سے وابستگی اور حکمرانوں سے بغض رکھتا ہے وہ ایک بزدل شخص بھی ہے............

ملک کے بیالیس قبائل اپنے سرداروں کے ذریعہ لشکر مہیا کرتے ہیں جنہیں فوجی خدمات کے عوض اراضیات دی گئی ہیں اور یہ فوجی زیادہ تر کوہستان بلوچستان کے جنگجو قبائل سے ہوتے ہیں۔''

''میر سہراب خان اور میر ٹھارہ توڑیدار بندقوں تلواروں اور ڈھالوں سے مسلح چھتیس ہزار فوجی لا سکتے ہیں۔ وہ دشمن کا پیدل مقابلہ کرنیکی صلاحیت رکھتے ہیں اور اچھے توپچی ہیں۔ ایک سپاہی روزانہ پانچ پیسے تنخواہ لیتا ہے۔ پُرامن حالات میں انہیں ایک

سیر چاول روزانہ ملتا ہے۔ موجودہ وقت میں
امیروں کی روزانہ بیالیس لاکھ اٹھتر ہزار
روپے کی آمدن ہے جو تالپور خاندان میں تقسیم
ہوتے ہیں۔ کلہوڑوں کے وقت یہ آمدن اسی
لاکھ کے قریب ہوتی تھی۔ جس سے امیروں
کی بختی اور بے پروائی کا اظہار ہوتا ہے۔ مذکورہ
آمدن سے شاہ کابل کو بارہ لاکھ کا سالانہ خراج
بھیجا جاتا ہے۔"

ایک سیاح جیمز۔ برنس تھا جس نے 1827ء میں سندھ کی سیاحت کی۔ اپنے سفر کی روداد "اے وِزٹ ٹو دی کورٹ آف سندھ" کے نام سے بمبئی سے 1829ء میں شائع کی۔ وہ سندھ کے بلوچ حکمرانوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

"سندھ کی حکومت دونو جوانوں میر کرم علی اور
میر مراد علی کے ہاتھوں میں ہے جو ملک کے
اندر اور ملک سے باہر امیر اعلیٰ کہے جاتے
ہیں۔ تمام عوامی معاملات سے متعلق
دستاویزات پر انہی کی مہریں ثبت ہوتی ہیں۔
انہوں نے میر غلام علی اور میر فتح علی کی

اولادوں کو انتظامیہ میں حصہ دار بنایا ہے۔ان میں میر فتح علی کا لڑکا میر صفدر نے امیروں کے برابر مرتبہ حاصل کیا ہے۔میر فتح علی کی وفات کے بعد صوبے کو چار حصوں میں بانٹا گیا تھا۔موجودہ وقت میں ملک کا چار مساوی حصوں میں بٹوارہ ہے۔سندھ کا مالیہ اکیس لاکھ روپے سے زیادہ نہیں ہے۔تالپوروں کے اور بھی امیر دربار سے وابستہ ہیں۔اور میر یالارڈ کہلاتے ہیں۔لیکن ریاست کے معاملات میں مخل نہیں ہیں۔ان میں میر ٹھارہ اور میر سہراب کے پاس علیحدہ علیحدہ ضلعے ہیں۔میر ٹھارہ نابینا ہیں اوراس کا لڑکا علی مراد ایک غیر واضح رُکن دربار ہے۔جس کے تعلقات برطانوی حکومت اور کچھ کی حکومت سے قریبی ہیں۔حکومتی اختیارات صرف میر مرادعلی کے پاس ہیں۔وہ ایک اعلیٰ صفات کا باصلاحیت شخص ہے۔دیگر ایشائی حکومتوں

کے مقابلے میں اس خاندان نے گذشتہ تیس
برسوں سے ملک میں امن وسکون اور اپنے
اعلیٰ وقار کو برقرار رکھا ہے۔
مراد علی پچپن برس کا کوتاہ قامت ، صاف
رنگت اور جسمانی لحاظ سے ایک لحیم شحیم شخص
ہے۔عوام کیلئے ہیبت ناک ہونے کی وجہ سے
اقتدار اعلیٰ سنبھالنے کی اہلیت نہیں رکھتا۔
ظاہراً وہ لالچی ،عوامی مفادات کو داؤ پر لگانے
والا اور خودغرض ہے۔اس کے برعکس میر کرم
علی کا کردار ہے ،درباری آداب رکھتا ہے،
آزاد خیال خوش پوش اور منکسر المزاج شخص
ہے۔ حیدرآباد کے عوام میں اُسکی تعریف کی
جاتی ہے۔ بھائیوں کے مابین بہت محبت ہے
اور ہر ایک دوسرے پر جان نثاری کو تیار ہے۔
اعلیٰ امیروں میں میر غلام علی کا لڑکا میر محمد خان
نمایاں پوزیشن رکھتا ہے تیس سالہ خوبصورت
نوجوان ہے۔ اچھی طبعیت رکھتا ہے۔ حکومتی

معاملات میں دل لگاتا ہے۔ اُس کے ماتحت اُسے بہت پسند کرتے ہیں۔ اُس کی اولاد کوئی نہیں ہے سندھ کے اس دربار میں لونڈیوں سے پیدا ہونے والے بچوں کو پیدائش کے وقت مار دینے کی رسم ہے لیکن ایک مرتبہ اسی خاندان کے ایک شخص نے اپنے تقریباً ستائیس ناجائز اولادوں کو مارا نہیں بلکہ انہیں ایک درگاہ پر دیا گیا۔

میر مراد علی کا تیس سالہ لڑکا ہو بہو اپنے باپ پر گیا ہے۔ بہت بدنام اور بُری عادتوں کا شکار ہے، خودغرض اور دولت کا حریص ہے۔ یہ سردار اپنے پورے خاندان میں واحد بے تعلیم شخص ہے۔ میر مراد علی کا دوسرا لڑکا میر محمد نصیر خان ہے۔ خوبصورت اور اچھی عادتوں کا پچیس سالہ نوجوان ہے۔ حکمران خاندان میں اچھی خاصی شہرت رکھتا ہے۔ وہ برطانوی حکومت کی جانب مائل ہے

اور حیدر آباد میں ہمارے نمائندے کے ہاں

رہتا ہے، حرب وضرب کا ماہر ہے۔

میر صفدر کے بارے میں مجھے خاص

واقفیت نہیں ہے۔ وہ میر فتح علی خان کا لڑکا

ہے جس نے تالپوروں کو برسر اقتدار لایا۔

وہ اپنے باپ کی وفات سے چند گھنٹے قبل پیدا

ہوا۔ میر کرم علی نے کئی سالوں تک اسے بیٹا بنا

کر اسکی پرورش کی۔ اسے مرگی کا مرض تھا۔

اس نے جب اپنے حق کا تقاضا کیا تو مراد علی کو

بُرا لگا اور دربار میں کوئی اس سے بات نہیں کرتا

تھا اور نہ اُسے عزت دیتے تھے۔ صفدر میر ٹھارہ

کے لڑکے علی مراد کے ساتھ اپنے حق کیلئے ساز

باز میں تھا جسے میں نے ناکام بنا دیا۔ وہ

سازشیوں کے ساتھ مل کر صحرا میں واقع اسلام

کوٹ کے قلعے میں جا بیٹھ گیا اور پانچ ہزار

حمایتوں کے ساتھ حیدر آباد پر ہلہ بول دینے

کیلئے چل پڑے لیکن امیر نے اُس سے

معاہدہ کیا اور صفدر کو ملک کا ایک حصہ دینے پر راضی ہوئے۔ وہ ذہن کا کمزور لیکن باذوق شخص ہے اور فارسی کتابیں اور شاعری کے ذخیرے رکھتا ہے۔

سندھ کے یہ امیر اپنے دوسرے مسلمان نوابوں کے مقابلے میں بخشش اور معاف کرنے کے کاموں میں لاپرواہی برتتے ہیں۔ مجھے اس بات کا یقین ہے کہ سندھ کے امیر نشہ بازی سے دور رہے ہیں۔ وہ شراب پینے والوں کو اپنے میں بیٹھنے نہیں دیتے۔ دربار میں نہ شراب نظر آتی ہے اور نہ کہ ان کے خاندانی لوگ افیم کھاتے ہیں۔ حالانکہ سندھ میں کچھ کی طرح افیم کھانا عام ہے۔''

''سندھی پولیس کے پاس کوئی بندوق یا تلوار تک نہ تھی۔ حیدرآباد کا قلعہ امیروں کی جائے رہائش ہے جہاں ان کے گھرانے رہتے

ہیں۔ دربار کے ملازمین چند تنگ اور تاریک گلیوں میں رہتے ہیں۔ مجھے میروں سے ملاقات کیلئے ان سے گزارا گیا۔ پھر ایک کھلا میدان تھا جس کی دیواروں کو منقش کیا گیا تھا اور ان پر تصاویریں تھیں۔ فرش پر قیمتی قالین بچھی ہوئی تھیں، تین محرابی دروازوں پر پردے لٹک رہے تھے۔ میرے جوتے اتروا کر امیروں کے سامنے لیجایا گیا۔

حکمران خاندان کو اپنے سامنے دیکھنے کا منظر میں نے بچپن میں مشرقی ملکوں کی کہانیوں میں پڑھا تھا۔ دو بڑے امیر فرانسیسی سفید زری سے کڑھائی شدہ مسند پر بیٹھے تھے جس کے چاروں کونوں پر سونے کے جواہرات لگے تھے۔ امیروں کے گھرانے کے افراد ہر جانب تھے۔ ان میں میر صفدر، میر مراد علی، میر نور محمد اور نصیر خان بھی تھے ،میرے سامنے کا ماحول صاف ستھرا اور

باذوق تھا۔ قرمزی اور بھڑکیلے رنگوں کے لباس نہیں تھے۔ تمام امیر اور ان کے نائب وغیرہ ایک جیسے سفید ململ کے پوشاکوں میں تھے۔ ان کے ریشم کے تُرکی پاجامے ٹخنوں پر سے تنگ اور قدرے گہرے نیلے تھے۔ ان کا اچھا اخلاق اور عروج بے مثل تھا۔ وہ بوڑھے نظر آتے ہیں۔ لیکن ان کی دھاڑی اور بالوں کے معائنے کی صورت میں وہ پچاس سے زیادہ عمر کے نہیں ہوں گے۔ چھوٹے امیروں میں نصیر خان بہت خوبصورت تھا۔

ماحول کے سکوت، تنظیم اور ان کے وضع قطع سے میں بہت متاثر ہوا۔ مجھے سندھ میں انتہائی عزت افزائی ملی ہے اور مجھے قلعہ میں اپنے ساتھ رہائش کرنے کی بھی پیشکش کی گئی تھی۔"

"امیر سورج نکلنے سے دو گھنٹہ پہلے کام شروع

کرتے ہیں اور حکومتی اور عوامی معاملات
نمٹاتے ہیں اور روشنی ہونے کے ساتھ دربار
میں آتے ہیں۔ آنے والے خطوط پڑھتے
ہیں اور احکامات جاری کرتے ہیں۔ ظہر کے
وقت پھر دربار لگتا ہے اور رات تک چلتا ہے۔

میر فتح علی خان کی زندگی میں سب
متحد تھے اور ایک ساتھ رہتے اور کھاتے تھے۔
اور ہنگامی حالات سے نمٹنے کیلئے باہر گھوڑوں
اور محافظوں کو تیار رکھا جاتا تھا۔ لیکن اب وہ
الگ الگ ہیں اور ہر کوئی اپنا انتظام الگ رکھتا
ہے۔ اور ہتھیار اپنے ساتھ رکھتے ہیں۔ اور
ایک دوسرے پر کامل اعتبار نہیں کرتے۔

کسی بڑے سے بڑے شخص کو بھی
ان کے برابر بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی تھی
سوائے برگزیدہ میرزادوں کو۔ ان کے دربار
میں سب سے زیادہ خوبصورت اور خوش لباس
شخص ان کا بوڑھا چچا میر محمد ہے۔''

''میر مراد علی کسی دوسرے کے مشوروں کی پرواہ نہیں کرتا۔ اُس کی تاریک روح کے بارے میں کسی کو علم نہیں۔ اس کا صرف دو شخصوں پر اعتماد نظر آتا ہے جو اُس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ایک نواب ولی محمد خان لغاری ہے کہ تالپور خاندان کے بڑوں کے بعد اس کا مقام ہے اور وہ وزیر سندھ اور اہم ترین شخص ہے۔ وہ طاقتور بلوچی قبیلہ کا سردار ہے جس نے موجودہ حاکموں کی جدو جہد میں بھر پور کردار ادا کیا ہے۔ اندرونی معاملات میں وہ حکمرانوں کا مشیر ہے۔ اسکی عمر ستر سال کے قریب ہے اسکی وفات سے سندھ ایک مخلص محافظ اور امیر لوگ ایک بہترین خدمتگار سے محروم ہوں گے۔

نواب ولی محمد خان کے بعد کی اہم شخصیت حکمرانوں کے خارجی معاملات کے مشیر میر اسماعیل شاہ ہیں۔ اس کا باپ

کلہوڑوں کی حکمرانی کے وقت ایران سے آیا
تھا اور آخری کلہوڑہ حاکم کا سرکاری طبیب
بن گیا۔ 1820ء میں اسے بمبئی میں سفیر
بنایا گیا تھا۔ اس سے اس کی شہرت ہوئی۔ میر
اسماعیل پچاس سال کا ہے اورصرف فارسی
میں بات کرسکتا ہے۔ دونوں مشیر اور طبیب
ہونے کی وجہ سے ایکدوسریے سے حسد
کرتے ہیں۔ نواب لغاری ایک نیک اور
خداترس شخص ہیں جبکہ میر اسماعیل شاہ میں
غروراور کنجوسی بہت نمایاں ہے۔ ان کی اہمیت
ان کے سیّد ہونیکی وجہ سے ہے۔ چنداورلوگ
بھی میروں پر قدرے اثرورسوخ رکھتے ہیں۔
جن میں میر کرم علی کا اٹھارہ سال قبل کا خرید
کردہ جارجیائی غلام میرزا خسرو، ایک اور
جارجیائی جوان مرزا باقر، بہادر خان اور خیر محمد
تورا شامل ہیں۔ میر غلام علی لغاری جونواب
ولی محمد کے بھائی ہیں اور محمد کوٹ کے قلعے کا

مہتمم ہے جہاں پر مشہور ہے کہ امیروں کا کروڑوں روپے کا خزانہ ہے۔ چیف سیکرٹری کا عہدہ ایک ہندو منشی خوشی رام کے پاس ہے۔ امیروں کیلئے خط وکتابت کا کام بھی وہی کرتا ہے۔''

''حیدرآباد میں مضبوط فوجی دستے نہیں ہیں۔ بلوچیوں کا ایک حقیر فوجی دستہ ہے جو قلعہ کے گریژن میں متعین ہے۔ دربار میں رہنے والے سرداروں کے ذریعے حکومت کی فوجی خدمات کیلئے چالیس ہزار افراد اکٹھا کر سکتا ہے۔ اس خطے میں ماسوائے مذہبی جذباتیت کے حب الوطنی کی کوئی پہچان نہیں ہے۔ امن وسکون کے حالات نے عوام کی جنگجو یانہ صفات کو سُلا دیا ہے۔ پھر وہ کسی غارتگری کے لئے ہتھیار نہیں اُٹھا سکتے ہیں۔ جب مذاکرات کا فائدہ نظر نہ آئے تو پھر یہ لڑائی کیلئے چیخ وپکار کرتے ہیں۔ وہ اپنے

آباواجداد کے قصے آپس میں ایک دوسرے کو
اور سپاہیوں کو سناتے رہتے ہیں اور وہ بڑی
دلچسپی اور تحمل سے انہیں سنتے ہیں۔امیروں کی
فوجی اجتماع لوگوں کا خاک آلود مجمع نظر آتا
ہے جس میں بلوچستان کے پہاڑی جنگجو
شامل ہوتے ہیں۔ان میں قبیلہ رند بھی ہوتا
ہے جس سے امیر اپنی نسل ملاتے
ہیں۔"(6)

چارلس میسن اپنی کتاب "نیریٹیو آف وری ئس جرنیز ان بلوچستان، افغانستان، پنجاب اینڈ قلات" میں جو تین حصوں پر مشتمل ہے 1830ء کے دوران سندھ کی سیاحت کے نتیجے میں سندھ کے بلوچ حکمرانوں کے متعلق درج ذیل جائزہ پیش کرتے ہیں:۔

"حیدرآباد کی امارت اس وقت میر مراد علی ،
نور محمد ولد مراد علی، نصیر خان ولد مراد علی، امیر
صفدر (ولد میر فتح علی خان) اور میر محمد
(ولد میر غلام علی ٹالپر) کے ہاتھوں میں ہے۔
ان میں سب سے بڑا میر مراد علی ہے جو گلی

اختیارات کا مالک ہے جس نے دوسروں کو حصہ دار بنایا ہے۔ مراد علی سے عوام ناخوش ہیں اور سندھ میں اس کی سب سے زیادہ مخالفت ہوتی ہے۔ میں نے اپنے حیدرآباد کے تین چار مہینوں کے دوران قیام میں ان کے کسی ظلم وستم کی بات نہیں سُنی ہے جبکہ لوگوں کو ان کی قبائلی، ملکیتی اور جان کے تحفظ کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے۔ اس کا بھتیجا صفدر نسبتاً سرکش ہے۔" (حصہ سوئم صفحہ 363)

"شمالی سندھ کے کاشتکار حکومتی مظالم کے شاکی ہیں۔ مساجد خوبصورت ہیں اور ان کی خوب دیکھ بھال کی جاتی ہے۔ ہر مسجد میں ایک پیش امام مولوی اور چند خادم ہوتے ہیں۔ لیکن ملک کا نظم ونسق بہتر نہیں ہے۔ سردار لوگ دھونس دھمکیوں سے کام نکالتے ہیں۔ ان پر کوئی چیک نہیں ہے۔ سیّدوں کی کافی عزت ہے اور خوشحال ہیں۔ وہ بڑی بے

خونی سے جرائم کرتے ہیں۔ وہ اپنے کو اعلیٰ
گردانتے ہیں اور غیر سیّد گھروں میں
آمدورفت نہیں رکھتے۔

''حیدرآباد کا قلعہ ایک بے قاعدہ لمبا قلعہ
ہے جسکی دیواریں بہرحال مضبوط ہیں۔اونچی
بُرجیاں ہیں۔ سوراخوں نے اسے پرکشش
بنادیا ہے۔ زیادہ امیر یہیں رہائش کرتے
ہیں۔اجنبی قلعہ کے اندر نہیں آسکتے۔

موجودہ وقت میں حیدرآباد میں
امیر مراد علی اور اس کے لڑکے نور محمد اور نصیر
خان، اسکا بھتیجا میر صفدر اور میر محمد ہیں۔امیر
صفدر قدرے سرکش ہے۔ مراد علی عوام میں
مقبول نہیں ہے اور اسکی شکایت عام ہے لیکن
اس کے کسی ظلم کی کہانی نہیں ملتی۔لوگوں کو تحفظ
اور جائداد کی آزادی حاصل ہے۔''

1823ء میں سندھ میں موجود نامور یوروپی مصنف الیگزینڈر برنس اپنی تصنیف ٹریولز ان بخارا اینڈ اے وائیج آن دی انڈس'' (حصہ سوئم) میں یوں رقم طراز

ہیں:۔

''1876ء کے بعد علاقے میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ جو حکومت قبل اس کے چار بھائیوں کے اشتراک سے چلائی جاتی تھی اب آخری بھائی ساٹھ سالہ مراد علی کے ہاتھ میں ہے اور اب تک یہ تبدیلی بغیر کشت وخون کے آئی ہے۔ لگتا ہے ان کے بعد بھائیوں میں جھگڑے اٹھیں گے۔ ان کے دو بیٹے نصیر خان اور نور محمد اپنے چچا کے لڑکوں میر صفدر اور محمد کے ہمراہ دربار میں ایک ہی درجے میں بیٹھتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے پروگراموں کی کامیابی پر لگا ہوا ہے۔ امیر کا بڑا بیٹا میر نصیر خان دربار اور برطانیہ کے مابین رابطے کا ذریعہ ہے جبکہ اس کا باپ انگریزوں سے حسد رکھتا ہے لیکن بیٹے کو اس رابطے سے منع نہیں کرتا۔ میرے خیال میں یہ آنیوالے مشکل وقت میں ہم سے امداد کی امید پر یہ کر رہا

ہے۔ لیکن اس وقت طاقت حاصل کر سکے گا
جب اپنے باپ کی دولت پر قابض ہو۔ لیکن
وراثتی دولت کے لٹانے سے سندھی جیسے ضمیر
فروش لوگوں کی بمشکل حمایت حاصل کر سکے۔
نصیر خان کا بڑا بھائی اور موجودہ حکمران کا بڑا
بیٹا نور محمد اپنی بُری خصلتوں کی بناء پر کسی بھی
صلاحیت سے محروم ہے۔ میر غلام علی کے
لڑکے میر محمد نے برطانوی حکومت سے
سازباز کرنے کیلئے مجھے پیغام بھیجا تھا لیکن
میں نے نہیں مانا۔ اس شاہی خاندان کے بانی
کا بیٹا میر صفدر ہی مراد علی کا حقیقی جانشین ہے
لیکن امیر کو وہ پسند نہیں ہے۔ کئی سردار اور فوجی
اُس کے باپ کی اچھائیوں کی وجہ سے اُسکے
حمایتی ہیں۔ موجودہ وقت میں وہ اپنے
منصوبوں کو چھپائے بیٹھا ہے۔

پچاس سالہ نواب میر رستم خان
خیر پور کا نواب ہے۔ اسکی بڑی شہرت ہے اور

اچھا منتظم ہے۔ یہ علاقہ بہت وسیع اور نہایت زرخیز ہے۔ افیم پر ٹیکس وصولنے کے معاملے پر حیدرآباد اور خیر پور کے نواب کے مابین حصہ داری پر کچھ اختلافات چل رہے ہیں۔ حیدرآباد کا نواب اُسے حصہ دینا نہیں چاہتا۔ نواب کا سارا خاندان برطانوی حکومت سے اپنی دوستی کا اظہار کرتا رہتا ہے۔ میر سہراب کے تیس لاکھ روپے کے خزانہ پر اس کے چھوٹے بھائی علی مراد کا قبضہ ہے۔ اس مسئلہ کے علاوہ ان کے درمیان کوئی دوسرا قضیہ نہیں ہے۔

خیر پور کا امیر انتہائی بااثر ہونے کی بناء پر سندھ کے تمام معاملات اور منصوبوں کی منظوری میں اہم ترین حیثیت کا حامل ہے، اس کے اپنے ہمسایہ ریاستوں کے حکمرانوں سے قریبی اور دوستانہ روابط ہیں۔ اس کی حکومت میں داؤد پوتے، نوابوں کا نمائندہ،

ہمارا ریذیڈنٹ ،جیسلمیر اور بیکانیر کے نمائندے موجود رہتے ہیں۔ سندھ کے سرداروں کے تحفظ کے پیش نظر اس کی فوج ہمیشہ مستعد ہے۔ شکار پور پر افغان فوج کی یورش کے موقعہ پر اس نے اپنی فوج بھیج دی تھی۔علی مراد اس نواب گھرانے کا سربراہ ہے لیکن سندھی امیروں پر اس کا کوئی خاص اثر ورسوخ نہیں ہے۔ یہ میر صفدر کا حمایتی ہے۔ اگر کبھی حکومت تبدیل ہوئی تو وہ اس میں اہم پارٹنر ہوگا۔''

''جب سے شہر ٹھٹھہ موجودہ حکمرانوں کے ماتحت آیا ہے ان کے مظالم کی وجہ سے برباد ہوگیا ہے۔ اس کی موجودہ آبادی پندرہ ہزار نفوس سے زیادہ نہیں ہوگی۔ سابق اور موجودہ حکمرانوں کے باہمی جدل سے افغان حکمرانوں نے فائدہ اٹھا کر حملے کر کے اسے کھنڈر بنادیا ہے۔ تاجروں کی اکثریت یہاں

سے بھاگ گئی ہے۔ اقتدار میں آتے ہی ٹالپروں نے اسے اپنادارالحکومت بنایا ہے۔

خیر پور شہر سردار سہراب خان ٹالپر کا بنایا ہوا نیا شہر ہے جس نے شمالی سندھ کے علاقے سے کلہوڑوں کو نکال کر قابض ہوا تھا۔ بھکر کا قلعہ اینٹوں کا بنا ہوا ہے جہاں پر امیر خیر پور کے تقریباً ایک سو فوجی تعینات ہیں پیادہ فوج کے بھی پچاس افراد موجود ہوتے ہیں جو دیگر کام سرانجام دیتے ہیں۔

ہمارے دارالحکومت پہنچتے ہی پتہ چلا کہ میر مراد علی خان کے چار وفد ہمارے منتظر تھے۔ شام کو اس کا لڑکا نصیر خان نے ہمارا استقبال کیا اور پھر امیر کے ہاں لے گیا۔ وہ ریاستی خفیہ رازیں ہمیں پہنچانے کا اہم ذریعہ تھا۔ امیر نے مجھ سے انتہائی قربت کا اظہار کیا اور التجا کی کہ سابقہ مسائل اور تلخیوں کو بھول جانا چاہیے۔ دراصل وہ تین لاکھ

بلوچوں کا سردار اور ایک سپاہی ہے جو سیاسی
معاملات کو زیادہ نہیں سمجھتا۔ دربار میں سوائے
امیروں کے جواہرات جڑے ملبوسات کے
اور کوئی چیز متاثر کن نہیں تھی۔ ان سے ملاقات
شوروغل کرنے والے سپاہیوں سے بھرے
ایک گندے کمرے میں ہوئی جس میں قالین
تک نہ تھا اور ان کی ڈھانٹ اور تاکید کے
باوجود بھی کوئی خاموش نہیں ہوتا تھا۔ ہم ان
کے لئے کچھ یوروپی مصنوعات کا تحفہ لائے
تھے۔ انہوں نے دو مرتبہ کہلوایا کہ تحفے صرف
اُسی کو دیئے جائیں۔ پندرہ لاکھ اسٹرلنگ کی
دولت رکھنے والے امیر نے یہ تحفے یکطرفہ
اپنے لوگوں میں تقسیم کرلیں۔ جن کی قیمت
چند سو پاؤنڈ ہی تھی۔ ہمیں خیال آیا کہ
حیدرآباد کے حکمران کتنے ہلکے ذہن اور
چھچھورے پن کے مالک ہیں۔ اُن سے
دو مرتبہ کی ملاقات اور معاملات پر بات چیت

سے ہمیں اطمینان ہوا کہ اب لاہور کی طرف ہماری پیش قدمی میں وہ رکاوٹ نہیں ڈالے گا۔ نصیر خان نے مجھے ململیں پوش کا سونے سے مزین دمشقی تلوار کا تحفہ دیا اور اس کے باپ نے پندرہ سو روپے کی تھیلی بھجوائی۔ جس طرح حیدر آباد میں ہمارا استقبال اور عزت افزائی ہوئی تھی اُس کی ہمیں توقع ہی نہیں تھی۔

پچاس سالہ میر رستم خان سے ملاقات کے دوران اس کے باپ کے چالیس مرد لوگ بھی موجود تھے، حیدر آباد سے زیادہ یہاں پر رونق تھی اور نظم وضبط بھی اچھا تھا۔ اُس نے برطانوی حکومت کے احترام میں لمبی تقریر بھی کی۔ اُس نے انگریزوں کی طرف اشارتاً کہا کہ وہ ایک فوجی قوم نہیں ہے اور چند سو برس قبل تک وہ بے لباس گھومتے تھے اور اپنے جسموں پر نقش نکلواتے تھے۔ اُس نے میری تلوار کے بارے میں کہا کہ یہ کسی کو

نقصان نہیں پہنچا سکتا (7) امیر کی باتوں سے
مجھے یقین ہی نہ آ رہا تھا کہ یہ بلوچی دربار ہے
انہوں نے سفر کیلئے ایک سو پچاس افراد کی
خوراک اشیا اور آٹھ دس بھیڑیں بھی دیں اور
جب تک ہم اُن کے مہمان تھے، روزانہ
دو وقت (72) مختلف قسم کے کھانے بھیجتا تھا۔
کھانے لذیذ اور چاندی کے برتنوں میں
ہوتے تھے۔ انہوں نے تحفے میں دو خنجر اور
خوبصورت اور وافر سونے سے مزین تلواریں
اور ایک ہزار روپے کی تھیلی بھی بھیجی۔ رقم میں
نے معذرت کے ساتھ واپس کر لی'' (8)

''بھکر پہنچنے سے پہلے ہماری
ملاقات سندھ کے ایک 72 سالہ وزیر بلوچ
سردار نواب محمد خان لغاری سے ہوئی۔ اُس
کے محبت بھرے سلوک نے ہمارے دل جیت
لئے۔ اُس نے مجھے ایک گھوڑا اور قیمتی کنگی کا
تحفہ دیا۔ وہ شکار پور سے ہمیں ملنے آیا تھا اور

اُس کے ساتھ چار سو افراد مع قالینوں، خیموں اور پالکیوں اور رقاصائیں تھیں۔ جنہیں سننے کی ہمیں دعوت دی گئی۔ محفل کے دوران رقاصائیں شراب پی کر گلے صاف کرتے رہے۔ ہمارے دیگر ساتھیوں نے بھی اس پرمسرت دعوت کا لطف اٹھایا۔ اس نے دودن تک ہمیں مہمان رکھا۔''

''علی پور میں میر رستم خان کے وزیر فتح خان غوری نے ہمارا استقبال کیا اور اپنے امیر کا پیغام پہنچایا کہ وفد کی آمد سے وہ بہت خوش ہے اور برطانوی حکومت سے تعلقات بڑھانے کا خواہشمند ہے۔ اُس نے ہمیں خاص طور پر ذہن نشین کرایا کہ خیر پور (کی ریاست) حیدرآباد (کی ریاست) سے الگ سندھ کا حصہ ہے۔ میں سمجھ گیا تھا کہ اُس کا حاکم اپنا کوئی مقصد ہم سے پورا کرنا چاہتا ہے۔''

الیگزینڈر برنس کے بعد جس سیاح نے سندھ کے معاملات کا مطالعہ کیا وہ ولیم پوٹنگر تھا جس نے 1831ء تا 1832ء کے حالات کے بارے میں اپنی تصنیف ''میمائرز آن سندھ'' میں میروں اور ان کی حکمرانی کا یوں جائزہ لیا ہے:

''ستر سالہ لحیم و شحیم ضعیف میر علی مراد حیدر آباد کا موجودہ امیر ہے۔ جس کی صحت اچھی ہے مگر وہ ایک جابر اور ظالم امیر کے طور پر مشہور ہے۔ جبکہ سندھ کا سمجھدار اور قابل ترین شخص ہے۔ جسے تجربات نے دُور اندیش بنا دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ تیرہ کروڑ روپوں کا مالک ہے۔

اس کا بڑا لڑکا نور محمد خان ایک پینتیس سالہ جوان مگر بے صلاحیت اور سخت مزاج ہے اس کے بُرے کرتوتوں اور حریص و لالچی ہونے کی وجہ سے لوگ اُسے ناپسند کرتے ہیں ہیں میر مراد علی کا دوسرا آزاد خیال اور فضول خرچ مگر بہادر بیٹا میر نصیر خان ہے۔ مراد علی اسی کو سرکاری بات چیت میں آگے کرتا ہے تا کہ

اسے اپنا جانشین بنا سکے مگر اس میں حکمرانی کی صلاحیتیں نہیں ہیں۔ میر صفدر میر مراد علی کے مرحوم بھائی میر فتح علی خان، جس نے تالپور حکمرانی کی بنیاد رکھ دی، کا لڑکا ہے۔ اسے دوسرے بھائی پسند نہیں کرتے اور اُسے نظر انداز کرتے رہے ہیں اسی لئے اُس نے کچھ عرصے قبل اپنے پندرہ ہزار حامیوں کے ہمراہ بغاوت کی۔ اس کا کردار اعلیٰ ہے اور قابلیت رکھتا ہے۔ میر غلام علی کے بیٹے میر محمد خان میں بھی میر صفدر والی صفات موجود ہیں۔ اسے جو ملکیت اُسکے والد نے دی ہے اُس سے اُس کا سالانہ آمدنی تین لاکھ ہے۔ برطانیہ کے وفد کی سندھ میں موجودگی کے دوران میر محمد خان اور میر صفدر کو ان سے ملاقات کی اجازت نہیں تھی۔ لیکن ایک روز میر مراد علی خان نے دربار میں میر محمد خان کو سفیر سے متعارف کرایا اور کہا کہ یہ خاندان کا

سربراہ شہزادہ ہے۔ حالانکہ اس کے باپ کو معلوم ہے کہ وہ اس قابل نہیں ہے۔ امیر اصل میں اپنے بیٹے نصیر خان کو آئندہ کی حکمرانی کیلئے آگے لانے کا خواہش مند ہے۔ لیکن سندھ کے عوام میر صفدر کو زیادہ پسند کرتے ہیں اور اس میں سب سے زیادہ صلاحیتیں ہیں۔ میر نصیر خان برطانوی حکومت کی طرف بہت مائل ہے اور وقت آنے پر ہر شہزادہ ایسا ہی کرے گا اور ہر شرط ماننے پر تیار ہوگا۔ جو خانہ جنگی کو جنم دے گا۔ لہذا بہتر یہی ہوگا کہ سب چھوٹی شاخوں کو نظرانداز کر کے پورے ملک پر قبضہ کرلیا جائے۔

بڑی ریاست میر رستم خان ٹالپر کی خیرپور ہے جو حیدرآباد کی میر خاندان کا اتحادی ہے۔ میر رستم ایک خوش طبیعت اور رحمدل شخص ہے۔ اس کا ایک مکار بھائی میر مبارک خان حکمرانوں کے مراد علی خان کے

زیر اثر ہے۔ تقریباً آدھی ریاست کا مالک اس
کا بھائی مراد علی ہے جو انتہائی لالچی ہے۔

میر رستم کے بیٹے بھی دیگر بلوچوں
کی طرح جاہل اور وہمی ہیں۔

میر پور سب سے چھوٹی ریاست
ہے اس کے حکمران علی مراد خان کو دیگر
دو حکومتیں اپنا چھوٹا دشمن خیال کرتی ہیں۔ مراد
علی خان کی جانشینی کے جھگڑے کی صورت
میں یہ میر صفدر کا ساتھ دیگا۔''

''امیروں کی تنگ نظری اور حوصلہ شکنی نے
سندھ کی صنعتوں کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا
ہے۔ حکومت نے کئی چیزوں پر ٹیکس لگا دیا
ہے۔ اس وجہ سے تجارت کم رہ گئی ہے۔

ہندوؤں کے مسلمان بھائی ان سے اچھا برتاؤ
نہیں کرتے۔ لیکن وہ اپنا کاروبار رازداری
سے چلاتے ہیں۔ ان کو کہیں بھی ماسوائے
گدھے اور بیل کے کوئی دوسری سواری

استعمال کرنے کی اجازت نہیں اور نہ وہ اپنے تہواروں کی خوشیاں منا سکتے ہیں۔ امیروں کے سپاہی ہمارے بلاوے پر سامان بیچنے کیلئے آئے ہوئے ہندوؤں کو بلاوجہ مارا کرتے۔''

''تیس ہزار کی آبادی کے شہر شکارپور اور اس کے قریبی چھوٹی جگھوں پر امیروں نے کابلی حاکم کو بیدخل کر کے قبضہ کر لیا ہے۔ افغانوں اور رنجیت سندھ کی دھمکیوں کو کسی خاطر میں نہیں لا رہے ہیں۔ امیروں کو یہاں سے پچاس ہزار روپے مالیہ ملتا ہے جس کا دو تہائی حیدرآباد کے امیر کا اور باقی خیرپور کے سردار کا ہے کیونکہ مالیاتی حقوق حیدرآباد کے پاس ہیں۔''

''حیدرآباد سے تقریباً 45 میل پر واقع سندھ کی تیسری ریاست کا دارالخلافہ میرپور ہے۔ یہاں سے جیسلمیر سے آنے والی شاہراہ گذرتی ہے جس پر علی مراد افیون کی چونگی لیتا

ہے۔حیدرآباداورخیرپور کے امیروں کواس پر اعتراض ہے۔ مرادعلی خان کے پاس تین ہزار کی آبادی والا مہوراگاؤں ہے جو سہون سے تقریباً پندرہ میل کے فاصلے پر ہے۔

ریاست حیدرآباد کے سردار جس کے قریب ہوتے ہیں۔ان میں امیرترین اور طاقتورترین سردار نواب محمد خان لغاری مرحوم گذرے ہیں۔ جسکی وراثت پر اس کے بڑے لڑکے احمد خان لغاری نے قبضہ کرلیا ہے جو ایک باصلاحیت بڑے بہادر شخص ہیں اور فوج میں اوّل یا پھر دوسرے نمبر کے عہدے دار مانے جاتے ہیں۔ تمام سردار اپنی اپنی جاگیروں پر پوری طرح بااختیار ہیں۔مگران کی طرف سے کسی کو سزائے موت سُنانے کی کوئی بات سننے میں نہیں آتی۔ نیز سیاہ کاری کے معاملات میں وہ پوری تحقیق وتفتیش کے بعد کاروائی کرتے ہیں۔

تینوں ریاستوں کی حکومتیں ظالمانہ فوجی قسم کی
ہیں۔ خیر پور اور میر پور کی حکومتیں کافی
اثر ورسوخ کے مالک ہیں۔ حیدرآباد میں
بڑے سردار کم موثر ہیں مگر امیر کو اپنے مفادات
میں کر سکتے ہیں۔ سندھ میں نہ قومیت کا جذبہ
موجود ہے اور نہ اس کا تصور کیا جاتا ہے۔''

ولیم پوٹنگر ہی کے ایک ہمعصر سیّاح اور مصنّف۔ای۔ ڈلہوسٹ نے اپنے
مشاہدات اور تاثرات پرمبنی سفرنامہ اور یادداشتوں میں لکھا ہے کہ:

''مراد علی کو لوگ چاہتے ہیں جبکہ میر مبارک کی
چالاکی اور ظالمانہ روّیہ مشہور ہے۔ میر رستم
خان بھنگ، افیون وغیرہ کا نشہ کرنے کے
باوجود انسان دوست اور عوام دوست میر
ہے۔ اس کی ان کمزوریوں سے اُس کا وزیر فتح
محمد خان غوری مارواڑی خوب فائدہ اٹھا رہا
ہے(9)

میر رستم خان کا نامزد بیٹا میر محمد حسن کی بھی
لوگ تعریف کرتے ہیں۔ میر مبارک خان کا

بیٹا نصیر خان بہت خوبصورت نوجوان اور فوجی تجربہ کار ہے۔ جب ہم سندھ کے حاکموں سے جنوری 1832ء میں ملے تو وہ لوگ ایک لمبے برآمدے میں قالینوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ جس قالین پر میر مراد علی خان بیٹھے تھے وہ بہت قیمتی تھا۔ وہ سب سے قدرے آگے ہوکر بیٹھا تھا۔ ساٹھ برس کے اس ذہین حکمران نے قیمتی لباس پہنا ہوا تھا اور ان کی تلواریں اور ڈھالیں قیمتی جواہرات سے مزّین تھے۔ آس پاس عزیز واقارب بیٹھے تھے۔ دربار میں مختلف حیثیت رکھنے والے لوگ بیٹھنے کیلئے دھکم پیل کر رہے تھے۔ وہ اپنے حکمرانوں کو خاطر میں نہیں لا رہے تھے۔ ہم نے متعدد مرتبہ دیکھا ہے کہ بلوچی اپنے حکمرانوں کے خاص دبدبے میں نہیں ہیں'' (10)

''جب مارچ 1832ء میں میں ایک اعلیٰ
مرتبے والے بلوچی عالم خان کے ہمراہ دربار
میں پہنچا تو میر رستم خان نے میرا استقبال کیا۔
اسکے پاس میر علی مراد اور علی اکبر اور دیگر عزیز
واقارب بھی تھے۔ میں نے انہیں کرنل پوٹنگر کا
ایک پیغام دیا جس کے جواب میں انہوں نے
کہا کہ وہ جلد اُن سے ملیگا۔ میر رستم تقریباً
70 سال کا خوش مزاج اور صحت مند شخص ہے
جسے اس کے عوام پسند کرتے ہیں۔
حیدرآباد کی حکمرانی کا مستقبل کچھ خطرناک لگتا
ہے کیونکہ اس کے چار دعویدار ابھی سے ہیں۔
یہ مراد علی خان کے آنکھ بند کرتے ہی لڑنے کو
تیار ہوں گے۔ یہ میر نور محمد، میر نصیر خان، میر
صفدر اور میر محمد ہیں، میر صفدر مرحوم میر فتح علی
خان کا بیٹا ہے، میر محمد میر غلام علی کا لڑکا ہے۔
میر نور محمد، میر مراد علی کا بڑا بیٹا ہے جبکہ میر نصیر
خان کی سائیڈ پر باپ کا جھکاؤ زیادہ ہے اور

برطانوی حکومت کے ساتھ رابطے میں وہی رہتا ہے۔''

''حیدرآباد کا قلعہ ایک بے قائدہ اور پانچ کناروں کی طرز کا پکی اینٹوں سے تعمیر شدہ ہے جس کی بُرجیاں گول اورر چوکور ہیں۔ دیواروں کی اونچائی چالیس فٹ سے زیادہ نہیں ہیں اور چٹان کے اوپر کنارے سے اٹھائی گئی ہیں۔ اگر اس پر آدھے گھنٹے تک گولہ باری کی جائے تو دیواریں ٹوٹ کر راستے بن جائینگے۔ قلعہ کے اندر امیروں کی رہائش ہے، وسط کی ایک کوٹھڑی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں امیروں کے خزانے محفوظ کئے گئے ہیں۔ جنوبی جانب کے میدان سے قلعہ پر آسانی سے حملہ کیا جاسکتا ہے شہر کے ایک طرف قلعے کا راستہ ایک خستہ حال پُل سے جاتا ہے جو ایک تیس فٹ چوڑی اور بیس فٹ گہری خندق کے اوپر

بنایا گیا ہے۔ شہر کی آبادی پچیس ہزار ہے۔ جس
کی ایک تہائی ہندو اور باقی سندھی اور بلوچ
ہیں۔"
قلعہ میں چھوٹے بڑے ایک سو چالیس توپیں
ہیں، جن میں ساٹھ زیر استعمال ہیں۔ میرپور
شہر ایک چاردیواری میں بند ہے اور میر علی
مراد اور میر ٹھارا کی ملکیت ہے۔"

ای ۔ ڈلہوسٹ کے بعد 36-1835ء کے دوران جان ووڈ نامی سیاح نے سندھ کا دورہ کیا۔ انہوں نے اپنی یادداشتیں "جرنی ٹو دی سورس آف دی اوکسس" نامی کتاب میں لکھیں جو لندن میں 1872ء میں شائع ہوئی ۔ ان کے تاثرات ومشاہدات اس طرح ہیں:۔

"حیدرآباد کے شمال میں حکمران خاندان کے
مرحومین کے مقبرے ہیں۔ ان میں مرحوم
میر کرم علی خان جسمانی لحاظ سے اچھے اور توانا
تھے کلہوڑوں کے غلام شاہ کا مقبرہ جسے
ٹالپروں نے اُجاڑ دیا ہے دوسرے مقبروں
سے بڑھیا ہے کرم علی کا مقبرہ اس سے ملتا جلتا

ہے۔ حکمران خاندان کے مقبروں کی مرمت
ہوتی رہتی ہے۔

میں نے ولی محمد لغاری کی شہرت سُنی تھی سندھ میں اُسے یاد کیا جاتا ہے۔ اور امیر اور غریب دونوں اُسکی اچھائیاں بتاتے ہیں سندھ کے امیروں نے اس کی لیاقت اور قابلیت سے خاطر خواہ فائدہ اٹھایا ہے۔ لوگوں کے خیال میں وہ ایک انصاف دوست اور عالم وفاضل شخص تھا۔

سندھ کے امیروں نے اپنے کھیل ومشاغل کیلئے دریا کے کنارے بڑے بڑے زمینی قطعے مخصوص کئے ہیں۔ جن پر اپنا تصرف رکھنے کیلئے یقیناً ظلم روا رکھا ہوگا۔ ایسے معاشروں کے حکمران ہر ریاست میں ایسا ہی کرتے ہیں۔ خود انگلینڈ میں بقول ہیوم شاہ، نے 68 جنگلات ، 13 شکار گاہیں اور 781 باغات پر قبضہ کیا ہوا تھا۔ یہ قابل ذکر

بات ہے کہ سندھ کا حاکم لوگوں کے جان سے
نہیں کھیلتا ہے۔ سردار نور محمد خان نے ہمیں
دعوت دی تھی اور ہم جس شکار گاہ میں تھے وہ
ایک وسیع جنگل تھا۔ ایک ہرن نکلتے ہی نور محمد
کی بندوق سے ڈھیر ہوگیا۔ یہ نشانہ بہت اچھا
تھا۔ شکار میں ان کے ساتھ کتے، بھیڑیئے
اور دوسرے جانور بھی ہوتے ہیں۔ وہ متفقہ
طور پر منصوبہ بنا کر جاتے ہیں اور سمت پہلے
سے نہیں بتاتے۔

وہ گھوڑوں پر سوار ہو کر شکار نہیں
کھیلتے۔ البتہ اونٹوں پر کبھی کبھی ہرن کا شکار
کرتے ہیں۔ اُن کے علاوہ کسی اور کو بندوق
چلانے کی اجازت نہیں ہوتی۔"

1840ء میں سندھ کی سیاحت کرنے والا سیّاح ٹی۔ پوسٹن نے اپنی مشاہدات پر مبنی یادداشتیں "پرسنل آبزوریشنز آن سندھ" میں درج ذیل تبصرے کئے ہیں:

"سندھ میں خصوصاً کراچی میں
ہندوؤں کو کافی تحفظ حاصل ہے۔ اس کیلئے وہ

امیروں کو خراج دیتے ہیں۔ کاروباری ہندو تو مکمل طور پر امیروں پر انحصار کرتے ہیں۔ امیر ہندو آرام وسکون سے رہتے ہیں جبکہ غریبوں سے یہودیوں کا سا سلوک روا رکھا جاتا ہے۔

''امیران سندھ وعوام مذہبی تعلیمات سے نابلد ہونے کی بناء پر سیّدوں، پیروں اور مذہبی دعویداروں پر بڑا یقین رکھتے ہیں جسکی وجہ سے کابل سیّدوں نے بڑا مقام بنالیا ہے۔ ہر بلوچ سردار اور قبیلہ کا ایک مرشد ضرور ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ انہیں امیروں کے حرم میں جانیکی اجازت ہے۔ حالانکہ ان کے سرداروں کو وہاں جانیکا حق حاصل نہیں ہے۔''

''امیروں کے پاس غلام ہوتے ہیں جو زنجبار سے لاکر فروخت کئے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ اچھا سلوک ہوتا ہے ان میں بعض امیروں کے اعتمادی اور رازدار ہیں۔ انہوں

نے اپنے خاندان والوں کی جگہ ان پر اعتماد کیا ہے۔ ان کے ذاتی محافظ زیادہ تر یہی شیدی ہیں(11)

حیدرآباد کے مراد علی خان کا بیٹا سردار نصیر خان ایک پینتالیس سالہ خوبصورت شخص ہے لیکن وہ ایک تنگ نظر اور لالچی ہے جو اس شہزادے کیلئے ناکامی کا سبب ہے۔ ہمارے افسران جو اس سے ملے ہیں اسے پسند کرتے ہیں۔ نصیر خان اپنے بڑے بھائی نور محمد کی وفات کے بعد تالپوروں کا سردار بنا۔ اس کے بھتیجے باپ کا ترکہ ملنے کے بعد دربار میں اُس کے برابر بیٹھتے ہیں حالانکہ انہیں ایک سیڑھی نیچے بیٹھنا چاہیے۔ چھوٹے بھتیجے اس سے اختلاف رکھتے ہیں اور اُس کے خلاف اپنا گروہ بنالیا ہے لیکن نصیر خان نے ایسے معاملات کو نظرانداز کردیا ہے۔

نصیر خان کا چچا زاد بھائی میر نور محمد ولد غلام علی
ٹالپر، بانی حکومت میر فتح علی خان کے بیٹے
صفدر کے برابر درجہ پر تھا۔ اسکی موت کے بعد
نصیر خان نے اُسکی جائیداد پر قبضے کا منصوبہ
بنایا تھا۔ جبکہ میر صفدر ہمیشہ الجھنوں سے بچنے
کی کوشش کرتا تھا۔

مرحوم نور محمد کا بڑا بیٹا 29 سالہ
شاہداد خان اپنے باپ کی طرح صلاحیتوں کا
مالک اور دور رُخی حکمت عملی رکھتا ہے۔ اُس کے
اطوار اچھے مگر ملک سے مخلص نہیں ہے۔''

''خیر پور کے سردار میر رستم دربار کا سربراہ
ہے۔ دربار بلوچوں سے بھرا رہنے کی وجہ سے
قومیتی کردار کا رنگ نظر آتا ہے۔ جاگیروں کی
سرداروں کو تقسیم کی وجہ سے، مالی حالت زیادہ
اچھی نہیں ہے۔ ان کی رہائش شہر کے درمیان
اور مٹی کا چھوٹا سا قلعہ ہے۔ ٹالپروں کی اس
شاخ کے گھروں اور دربار میں ان کے آبائی

رسوم ورواج برقرار ہیں۔ میر رستم کو یہ جاگیر میر فتح علی نے دیا تھا۔ جوایک آزاد خیال اور بہت جلیل القدر شخص تھا۔ میر رستم کا خاندان بڑا ہے جسے اپنے دربار میں سازشوں کا سامنا رہتا ہے۔ پورے سندھ میں اس جیسا غیر جارح اور بامقصد شخص اور کوئی نہیں۔ حکومتی معاملات میں کم توجہ دینے کی وجہ سے مشکلات میں گھرا رہتا ہے۔ وہ بوڑھا ہونے کی بناء پر کردار ادا نہیں کرسکتا۔ فوت ہونے کی صورت میں اس کا چھوٹا بھائی ہی اس کا جانشین ہوسکتا ہے جو شیر کی طرح نظریں گاڑھے بیٹھا ہے"۔

"بڑے بھائی میر مبارک کے 1839ء میں انتقال کے نتیجے میں بڑے بیٹے نصیرخان نے باپ کی جائداد کا بڑا حصہ حاصل کیا ہے اور اپنے دیگر بھائیوں کا خرچہ مقرر کیا ہے۔ خیرپور کے خاندان کے علی مراد

ایک لائق اور باصلاحیت شخص ہے۔ وہ چالیس سال کا خوبصورت شخص ہے جسکی ماں مری بلوچ قبیلہ سے ہے۔ وہ تمام نشے کرتا ہے لیکن صحت منداور صاف ذہن رکھتا ہے۔

وہ حیدرآباد اور خیرپور کے حکمران بلوچ گھرانوں سے منفرد نظر آتا ہے اس کے تمام اہل کاراور ساتھی وغیرہ غیر ملکی ہیں۔اس کے فوجیوں کا تعلق ہندوستان، کابل، پنجاب اور بہاولپور سے ہے۔ بلوچی جاگیرداری طریقے اس پر حاوی نہیں ہیں۔ حیدرآباد وخیرپور کے دربار اُس کی فوجیوں کے حوالے سے ناخوش ہیں۔ اسی حوالے سے اُس کے منصوبوں کی کامیابی مشکل ہے۔ اُس نے کوٹ ڈیجی پر قبضہ کر کے اسکی نگرانی کروا رہا ہے۔ ہم سے قربت کے باوجوداس نے برطانویوں کوقلعہ میں داخل ہونے نہیں دیا اور اسنے فوجی مرکز اورخزانوں کے بارے میں کسی کو جاسوسی کا

موقعہ نہیں دیا۔ اس کا نظام متاثر کن ہے لیکن
نہ ہمارے حق میں ہے اور نہ خلاف ہے۔ وہ
اپنی آزادی کا محافظ ہے۔''

''امیروں کے خاندانوں کی رہائش
گاہوں میں جانا ممنوع ہے اگرچہ وہاں کوئی
خاص پہرہ داری کا خاص بندوبست نہیں
ہے۔ قانونی بیویوں کے علاوہ کنیزوں کی
خاصی تعداد بھی زنان خانے میں ہوتی ہے۔
نسب کو اعلیٰ اور خالص رکھنے کی خاطر ان سے
پیدا ہونے والی اولاد کو ماردیا جاتا ہے
(12) امیروں کی شادیاں اپنے بلوچوں میں
ہوتی ہیں جو ان کے برابر کے ہوں۔ جنہیں
دوسرے قبیلوں کی نسبت خاص مقام حاصل
ہے۔ بچوں کی تعلیم و تربیت حرم ہی میں ہوتی
ہے۔ جب وہ ایک خاص عمر میں پہنچ کر دربار
میں آنا جانا کریں تو پھر حرم سے انہیں الگ
رکھا جاتا ہے۔ یہ سردار اپنے آباؤاجداد کی

طرح ان پڑھ اور جاہل ہیں (13) اور اپنے
ملک کے بارے میں ان کی معلومات خاص
نہیں ہیں۔ حیدرآباد میں ان کا درشت رویہ
،ان کے آباواجداد سے انہیں منتقل ہوا ہے۔
وہ گھوڑے اور ہتھیار بارود اور تلواریں فارس
اور ترکی سے منگواتے ہیں، یہ چیزیں ان کے
پاس بہت ہیں۔''

سندھ کے حکمرانوں کے لباس
بلوچی پوشاک ہیں جو منفرد ہیں۔ عوام ان کے
خرید کی قوت نہیں رکھتا۔ ان کی ٹوپی بہت اہم
چیز ہے جسے وہ سونے اور چاندی کے کام سے
مزید خوبصورت بنا کر پہنتے ہیں (14) ان کی
تلواریں اور ڈھالیں بھی اہم ہیں۔ امیر
انگوٹھی کے علاوہ اور کوئی زیور نہیں پہنتے۔ جب
شکار کو جاتے ہیں تو جنگل کے سبزے کی
مناسبت سے سبز رنگ کی ٹوپیاں پہنتے ہیں۔
امیروں کے ہاں معیشیت کی اہمیت نظر نہیں

آتی۔ ہمارے ناشتے کے وقت یعنی سورج نکلنے سے تاوقت چاشت یہ ریاست کے معاملات نمٹاتے ہیں۔ دن کی گرمی میں گھروں میں ہوتے ہیں اور تین چار گھنٹے سوتے ہیں۔ مغرب کی نماز کے بعد دربار لگاتے ہیں اور عوام اور افسران وغیرہ چلے آتے ہیں۔ سات یا آٹھ بجے اٹھ کر گھروں میں جاتے ہیں یا پھر کبھی کبھی قصہ گوؤں اور شاعروں کو سنتے ہیں یا عورتوں کا ناچ دیکھتے ہیں۔ امیر اپنے قلعوں سے اُس وقت نکلتے ہیں جب شکار پر جانا ہو یا کسی مزار پر یا اپنے اجداد کے قبروں پر جانا چاہتے ہوں۔ ہر کوئی ان سے ہر وقت مل سکتا ہے۔ شکایتوں پر پوری تحقیق کے بعد کاروائی ہوتی ہے۔ وہ ذاتی طور پر تفتیش نہیں کرتے اور اپنے ملک کے دورے پر بھی نہیں نکلتے۔ اس طرح اپنے عوام کی حوصلہ افزائی نہیں کر پاتے۔''

امیروں سے ملاقات کیلئے پچاس کے قریب گھڑسوار اور پیدل سپاہیوں کا پیش خدمت نامی ایک گروپ ہوتا تھا جو ملاقات کیلئے آنیوالوں کا استقبال کرتا تھا۔ ہر امیر اپنا الگ دیوان لگاتا تھا۔ لیکن اگر کوئی قومی مسئلہ پیش آتا تو سارے امیر اکھٹے ہوتے اور اس پر غور کرتے تھے۔ اس مشترکہ دیوان میں ہر امیر اپنے علاقے کی نمائندگی کرتا تھا۔ جنگلی بلوچوں اور فوجی افسران اجنبیوں کی طرح کھڑے نظر آتے تھے۔ بلوچ اگرچہ امیروں کے وفادار تھے لیکن کسی ادب واحترام کا مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ دربار میں کسی ناچ ورقص کے موقعہ پر تو یہ بدمزگی پیدا کرتے تھے۔''

''سردار احمد خان لغاری ایک اچھا اور قابل شخص تھا۔ وہ میر محمد کی وفات تک اس کا وزیر اعظم تھا اور ہندوستان کے سب سے زیادہ شان وشوکت رکھنے والے دربار کا ہیرا

مشہور تھا۔ اس کا باپ ولی محمد کی پورے سندھ میں بڑی شہرت تھی۔ لیکن شہزادہ حسین علی کا رویہ اس بوڑھے شخص کے ساتھ جارحانہ تھا۔ جو اُس کے امیر والد کا اچھا دوست ہوتا تھا"

"سندھ کی حکومت جاگیرداری بنیاد پر ایک فوجی رجعتی حکومت کہا جاسکتا ہے۔ جاگیروں کے مالک امیر نظام کے سربراہ ہوتے ہیں۔ خدمات کے عوض ہر بلوچ یا فوجی کو اراضی ملی ہوئی ہے۔ وہ بوقت ضرورت ریاست کو مسلح فوجی مہیا کرتے ہیں۔ اور فوجی جاگیردار ہی باعث ترجیح ہوتے ہیں۔ امیر اپنے سردار بھائیوں کی رضامندی سے اختیارات استعمال کرتے ہیں۔ ٹالپر بحیثیت فاتح بڑے علاقے پر قبضہ رکھتے ہیں۔ وہ اپنے امداد دینے والوں کو حقوق کا تحفظ یقینی بناتے ہیں۔ اوران کا زیادہ انحصار آپس کے اتفاق واتحاد پر ہے۔"

امیروں کے ذرائع آمدن وہ
اراضیات ہیں جو دریا سے قریب، قدرے
دریا سے پرے اور غیر آباد جنگلات ہیں۔
جنہیں زمینداروں اور کاشتکاروں کو پٹے
پر دیا جاتا ہے اور محنت اور پیداوار کی مقدار
کے مناسبت سے ان سے مالیہ وصول کیا جاتا
ہے۔ اس کے علاوہ باغات، کھجور کے نخل
،تجارت وصنعت اور دیگر محاصل ہیں۔ کراچی
بندرگاہ پر درآمدات کا 5 فیصد اور برآمدات کا
ڈھائی فیصد حصّہ وصول کیا جاتا ہے اور گندم
اور دیگر عام خرید وفروخت کی اشیاء پر بھی ٹیکس
لیا جاتا ہے۔ منشیات وغیرہ پرمٹ پر فروخت
ہوتی تھیں۔ دکانوں، کرایہ کی کشتیوں اور
مچھیروں پر ٹیکس عائد تھا۔ مچھیرے اپنے شکار
کا تیسرا حصّہ دیتے تھے۔ اور لٹیروں سے
برآمد ہونے والی چوری کی ہوئی اشیاء میں
سے حصّہ لیا جاتا تھا۔''

عدالتی فیصلے قرآن پاک کے احکام اور مفتیوں کے فتوؤں پر بنائے گئے قوانین کے مطابق ہوتے ہیں۔ لوگوں میں انصاف کے بارے میں خوف پائی جاتی ہے۔ اور سزا دینے میں جلدی نہیں کرتے اور سخت سزائیں دینے سے نفرت کرتے ہیں۔ اکثر سخت ترین سزاؤں کو عمر قید میں بدل دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ٹالپر حکمران ظلم کے الزام سے بَری الذّمہ ہیں۔ وہ عوام پر حاکم اور غیر مہذب ہونے کے باوجود تعریف کے حقدار ہیں۔ قرابت داری کی ان کے ہاں اہمیت ہے۔ ان کے دبدبے کی وجہ سے سندھ میں جرائم کم ہیں حالانکہ نہ پولیس کا کوئی دبدبہ ہے اور نہ قانون کی بالادستی۔ حاکم بھی غافل قسم کے ہیں ہر شخص مسلح اور مزاحمت پر تیار رہے۔ میر غلام علی تالپور اپنے خاندان کا واحد شخص ہے جو انصاف دلانے کیلئے مشہور ہے اور اس شعبے میں بہترین انتظام کرتا ہے۔''

1842ء میں سندھ کا دورہ کرنے والا ایک اور یوروپی سیّاح لیوپولڈ یوں اور لیچ اپنے سفرنامہ ''ٹریولز اِن انڈیا'' مطبوعہ لندن 1845ء میں سندھ کے ٹالپر بلوچوں اور ان کی حکمرانی کے بارے اِن تاثرات کا اظہار کرتے ہیں:۔

''سندھ کے امیر تین جگہوں حیدرآباد، خیرپور اور میرپور سے مُلک پر حکمرانی کرتے ہیں۔ ان کے ہر گھرانے کا سینئر شخص امیر کہلاتا ہے۔ مذہباً میر فتح علی اور اس کے دو بھائی سُنّی عقیدہ کے تھے جبکہ ان کا بھائی میر مراد علی شیعہ تھا جو 1834ء میں فوت ہوگیا۔ جس کے بعد ایک تین رکنی ٹولی میر نور محمد، نصیر خان اور میر صفدر نے حکومت ہاتھ میں لی۔ میر نور محمد کی وفات کے بعد میر نصیر خان کو خاندان کا بڑا منتخب کیا گیا۔''

''امیر نے مجھ سے ملاقات کیلئے سونے چاندی سے مزّین زینوں والے چار گھوڑے بھیجے تھے جن پر ہم حیدرآباد گئے۔ قلعہ خستہ حال، چھوٹا اور مٹی سے چوکور بنا

ہواتھا۔ اس کے گرد آٹھ فٹ چوڑی خندق تھی۔ امیروں کے منشی میر نصیر خان نے ہمارا استقبال کیا۔ اور بڑے سولہ سردار اپنے روایتی لباس میں ملبوس موجود تھے۔ سب کے سب خوبصورت تھے۔ پستولوں ، بندوقوں اور ڈھالوں سے مسلح بھی تھے۔ وہ مجھے قلعہ کے اندر امیر میر نصیر خان کے محل میں لے گئے جو چوکور اینٹوں سے بنی تھی اور رنگین ٹائلوں سے مزّین تھی۔

میر نصیر خان جسے بلوچ ملک کا خوبصورت ترین شخص کہتے تھے انتہائی فربہ اندام تھا وہاں عمر رسیدہ میر محمد بھی تھا جو انگریزوں کا دوست ہونے پر فخر کرتا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ہیروں سے جڑا ہوا ایک شاندار تلوار تھی۔ اس کے بعد ہماری ملاقات پچاس سالہ میر صفدر سے اس کے محل میں ہوئی وہ ایک فوجی مزاج شخص تھا اور خوش اطوار ہے

اس کا بڑا لڑکا فتح علی بہت دلکش جوان تھا۔
جونہی ہم اپنی رہائش گاہ پہنچے تو امیروں کی
جانب سے کھانے کی کئی ڈشیں ، کشمیری
شالیں اور سوتی کپڑے وغیرہ کے تحفے پہنچے۔
ہمیں تحفے لینے کی ممانعت تھی لیکن امیر کا منشی
تحفے میرے قدموں میں ڈال کر چلا گیا۔"

ایڈورڈ آرچر لانگلے دو جلدوں پر مشتمل تصنیف "نیریسٹیو آف اے ریذیڈنٹ ایٹ دی کورٹ، آف میر علی مراد، مطبوعہ 1860ء میں لکھتا ہے کہ:۔

"معزز میر علی مراد کسی سندھی اور کسی بلوچ پر
اعتبار نہیں کرتا۔ اُس کی فوج غیر ملکی پٹھانوں،
خراسانی، روہیلے اور ملتانیوں پر مشتمل ہے"
"خیر پور کے پورے گھرانہ کا فرنیچر فقط
"چارپائی" ہے۔ امیر کے پاس نہ میز ہے نہ
کُرسی۔ میر مراد علی کبھی تین روز بھی خیر پور میں
نہیں رہتے۔ ان کے ملازمین کی کم تنخواہوں
کے باعث انہیں اُدھار نہیں دیا جاتا۔ میر
منشیوں کی تنخواہ فقط ہے اور وہ خیر پور ہی میں

رہتے ہیں۔ پانی بہت خراب ہے لیکن امیر
ہمیشہ دریائے سندھ سے پانی منگواتے ہیں۔''
میر اپنے عوام کی طرح جاہل ہیں۔
اور زیادہ وقت شکار کھیلنے میں گذارتے ہیں۔
میر فتح علی نے حیدرآباد کے قریب بڑے
زرخیز علاقے سے لوگوں کو بیدخل کیا۔ اس
طرح میر مراد علی نے ایک بڑے دیہات کو
خالی کرایا اور انہیں شکار گاہ بنایا گیا۔ میر فتح علی
کو اُس علاقے سے دو لاکھ کا مالیہ ملتا تھا۔
جب لارڈ کین اپنی فوج کے ساتھ اس علاقے
میں داخل ہوا تو درختوں میں گھری ایک
عمارت پر قبضہ کیا اور صحیح شکار سے لطف اندوز
ہونے کا پروگرام بنایا۔ رات کو غالباً منصوبہ
سے اسکی خشک لکڑیوں کو نذر آتش کیا گیا وہ
بمعہ دو ساتھیوں کے جل کر راکھ ہو گیا۔''
''امیر اپنے شکار گاہوں کا دورہ کرتے رہتے
ہیں۔ اور اپنے ہمراہ اور ملازمین کے علاوہ

کُتے اور عقاب بھی لیجاتے ہیں۔ وہ ہیروں اور جواہرات سے مزّین لمبی بنادیق سے اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار ہو کر شکار کھیلتے ہیں۔ بعض اوقات دوران شکار لوگ گولیوں کا نشانہ بنتے ہیں یا پھر درندوں کا شکار بنتے ہیں۔''

''عزت مآب میر علی مراد خان بہادر ٹالپر قبیلہ کا سردار ہے۔ اسکی چار شادیاں ہوئی ہیں ایک مری بلوچوں سے جس سے میر شاہنواز خان اور میر فیض محمد خان ہیں۔ دوسری بیوی رقاصہ تھی جس کے بعد اُس کی بہن سے انہوں نے شادی کی۔ جس سے 18 اور 16 سال کے دو لڑکے ہیں۔ ایک چوتھی بیوی بھی تھی۔ چھوٹے شہزادے صرف شکار میں اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جنہیں خیمے کھڑا کرنے کا تجربہ ہے۔''

''میر کی اپنی اور بیٹوں کی بیویاں، بیٹیاں کبھی امیر کے ساتھ باہر نہیں نکلتیں بلکہ وہ عورتوں

کیلئے الگ انتظام کرتے ہیں۔ مجھے غلام کی بیوی کے ذریعہ معلوم ہوا کہ تینوں بہنیں صورت کی زیادہ اچھی نہیں ہیں لیکن اچھی فطرت کی مالک ہیں۔"

"خیر پور کی پولیس کافی تیز ہے۔ ہر شہر کسی کوتوال کے حوالے ہے جس کے ساتھ بیس چوکیدار اور دو منشی ہوتے ہیں۔ انہیں تنخواہ معمولی مگر اناج کافی ملتی ہے۔ قانونی آمدن کے ذرائع سے میر علی مراد کا لارڈ میر کافی فائدے میں ہے۔" "خورد بُرد کردہ رقم اگلوانے کیلئے تکلیف دہ سزائیں دی جاتی ہیں اور بربریت دیکھنے میں آئی ہے۔ ملزم کو چارپائی پر چت لٹا کر اس کے پیر نیچے کی جانب رسی سے باندھے جاتے ہیں اور رسیوں پر پانی چھڑکا کر انہیں سخت کر دیا جاتا ہے جس سے رسّی ملزم کی ہڈیوں تک کاٹتا چلا جاتا ہے جس سے وہ جائز ناجائز اپنی جمع پونجی نکال کر دیتا ہے اور دوسرا طریقہ ملزم کی

رانوں کے بیچ میں سُرخ کیا ہوا لوہا رکھا جاتا ہے اور اُس کے ہاتھ کسی اونچی جگہ باندھ کر رکھے جاتے ہیں۔ ایک اور طریقہ یہ رہا ہے کہ کسی پیالی میں کچھ خاص قسم کے بھنوروں کو ڈال کر ملزم کی ناف پر الٹا رکھ کر پیالی کو جسم سے باندھا جاتا تھا۔ بھنورے راہ نہ پا کر ناف میں گھسنے کی کوشش کرتے تھے۔ اُس دہشت سے ملزم اقرار جرم کر لیتا تھا۔ ایک صبح میں نے ایک شریف ہندو ہوتا سنگھ کو ٹانگ پر لٹکا ہوا دیکھا جس کے جسم کا سارا بوجھ اس پر تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ تین دیگر لوگوں کے ساتھ بھی ایسا کیا گیا تھا جنہوں نے پھر رقم ادا کر دی۔"

"کڑی آزمائشوں میں انگاروں پر چلنے، پانی میں ڈبونے اور سُرخ کھولتے ہوئے لوہے کو اٹھوانا شامل ہیں۔ ہم جنس پرستی کی سزا میں مجرم کے بالوں کو صاف کر کے اسے گدھے پر ایسا بٹھا کر گھمایا جاتا ہے کہ اس کا منہ گدھے کی دُم کی طرف ہو۔"

حواشی:

1۔ لاہری بندر کا صحیح نام ''لاہیری'' بندر رہا ہے جو اپنے زمانے میں ایک نہایت ہی اہم بندرگاہ تھا۔ بندر دیبل کی تباہی اور گمنامی کے بعد واحد بندرگاہ لاہیری مشرق و مغرب کی تجارتی منڈی کا کردار ادا کرتا تھا۔ 1333ء میں ابن بطوطہ نے لاہیری بندر کو ایک بڑی اور معروف تجارتی شہر کے پایا ایک عرصہ کے بعد یہ تاریخی بندر بھی گوشہ گمنامی میں چلا گیا شاید بار بار کی تباہ کن طوفانوں نے اسے برباد کر دیا جو روبہ زوال ہوتا چلا گیا۔ لیکن یہ مچھیروں کی چھوٹی سی بستی کے طور پر موجود رہا اور چھوٹی کشتیوں کے ذریعہ غریب مچھیروں کا پیٹ پالتا رہا۔ مذکورہ تاریخی بندر اپنے قدیم نام سے آج بھی موجود ہے لیکن سندھی لہجے اور جتوں کی کرخت بولی نے اسے لاہیری سے مسخ کر کے ''ریہیڑی'' بنا دیا ہے۔ سندھی اکثر ''ل'' کو ''ڑ'' سے بدل کر ادا کرتے ہیں۔ ''لاہیری'' راہیڑی سے ہوتے ہوئے اب ''ریہیڑی گوٹھ'' بن گیا ہے۔ دریائے سندھ اسی مقام پر سمندر میں اترتا ہے سمندر کا یہ ساحلی مقام میلوں تک سمندر کے اندر جنگلات سے بھرپور ہے۔ جنگلات کی وجہ سے سمندر کئی تنگ گذرگاہوں میں تقسیم نظر آتا ہے۔ یہ گذرگاہیں کشتیوں کی آبی سڑکیں ہیں جو بڑے نہروں کی شکل میں حدِ نگاہ تک چلی جاتی ہیں جن کے دونوں کناروں پر طویل جنگلات ہیں۔ جنہوں نے اس قدیم بندر کو بہت دلکش بنایا ہے۔ یہاں کلمتی بلوچ، جت اور کچھ دیگر سندھی گھر آباد ہیں۔ یہاں سردار کو جاموٹ بولتے ہیں۔

2۔ گفت وشنید کیلئے جو وفد شکار پور بھیجا گیا تھا وہ حکمرانوں کا لائق وزیر سردار ولی محمد خان لغاری تھے جو نہ صرف ایک طاقتور سردار، رعب ودبدبہ رکھنے والا مگر انتہائی متحمل مزاج اور سنجیدہ شخصیت تھے بلکہ ایک کامیاب سفارتکار اور ایک اکنامسٹ بھی تھے۔ اُس نے اپنے ساتھ اپنی مزاج کے قابل شخصیتوں کو ساتھ لیا تھا۔ دوسری طرف سے افغان وفد میں صرف چیخ وپکار کرنے والے نیم ملاّ قسم کے جاہلوں کی اکثریت تھی جو صرف پیسہ بٹورنا اور فرمائش کرنا جانتے تھے۔ خود آپس میں معمولی باتوں پر دن میں کئی کئی مرتبہ ایک دوسرے کا سر پھوڑتے اور ماں بہن کی گالیاں نکالتے تھے۔ ولی محمد لغاری ان کی تمام اخلاقیات اور بیہودہ پن سے واقف تھا۔ انہوں نے جاتے ہی امیروں کو فیصلہ کن انداز میں کہا تھا کہ آدھ خراج پر بھی راضی کرانا اپنی جگہ میں انہیں ایک کوڑی بھی نصیب ہونے نہیں دوں گا۔ حالانکہ امیروں نے کہا تھا کہ خراج کی آدھی رقم تک ان کے منہ میں ڈال دو۔ سردار لغاری نے پورا دن اُن کے ساتھ گفت وشنید کیا اور انہیں خالی ہاتھ لوٹا کر تیسرے دن اپنے مستقر پہنچا۔

3۔ مصنّف کی مراد سندھ اور بلوچستان کے بلوچوں سے ہے نہ کہ ہندو نسل کے جاٹوں سے جو سندھ کے قدیم باشندے ہیں۔ زیر مطالعہ مصنّفین نے اپنی تحریروں میں اس کی وضاحت کی ہے جیسے کہ ہنری پوٹنگر نے اپنی تصنیف ''ٹریولز اِن سندھ اینڈ بلوچستان میں لکھا ہے کہ

''سندھ کی مجموعی آبادی کی تشکیل جاٹ،
بلوچ اور ہندو کرتے ہیں۔ جاٹ ہندوؤں کی
نسل ہے جو سندھ کے اصل قابض تھے۔
جاٹوں نے اسلام لانے کے بعد اپنے املاک
کے تحفظ کیلئے بلوچوں کو اپنالیا۔''

4۔ میر بھاگہ تالپور خاندان میں ایک رنگین اور عاشق مزاج، سیر وشکار کا شوقین، دولت واقتدار کے ہوس سے بے نیاز شخص تھا۔ وہ موسیقی کا دلدادہ تھا۔ جو اکثر اپنے ہمراہ موسیقاروں اور سازندوں کا گروپ ساتھ لیکر علاقہ بدین کے شکارگاہوں کی طرف چلا جاتا تھا اور خوب سیر سپاٹے کرنے کے بعد واپس گاؤں آتا تھا۔ بدین کے گاؤں ٹھری میں اوڑیجہ ذات کے ایک زمیندار کی لڑکی کی خوبصورتی کے چرچے زبان زدعام تھا۔ جس کا نام مریم تھا۔ حکمرانوں اور بڑے بڑے زمینداروں کے نوجوان اس کو ایک جھلک دیکھنے کیلئے دور دور سے آتے اور ٹھری کی گلی کوچوں کی طواف کرتے رہتے تھے۔ اسی دوران اوڑیجہ قبیلہ کے سردار نے مریم کے باپ سے اس کا رشتہ مانگا لیکن مریم کی کمسنی کی بناپر اُس کے باپ نے رشتہ دینے سے انکار کیا۔ اوڑیجہ سردار نے اس انکار کا بُرا مانا اور کلہوڑہ حاکم میاں سرفراز خان سے اپنی بے عزتی کی شکایت کی۔ میاں سرفراز اپنے والد غلام شاہ کلہوڑہ کی موت کے بعد نیا نیا جوانی کے عالم میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھا تھا۔ جب میاں سرفراز خان کلہوڑہ نے اوڑیجہ سردار کی زبانی مریم کی خوبصورتی کے تذکرے سُنے تو

اُس نے دل ہی دل میں مریم کواپنانے کا ارادہ کیااور بنا دیکھے مریم کی محبت نے کلہوڑہ حاکم کے دل میں جگہ بنالی۔

ایک دن اوڑیجہ سردار کو ساتھ لیکر ٹھری میں شکار کھیلنے کے بہانے چلا گیا۔مریم کی ایک جھلک دیکھنے کی نیت سے دوتین روز وہیں قیام کیا آخرایک دن اُسے دیکھنے میں کامیاب ہوا۔اور جتنا اُس نے مریم کے حسن کے تذکرے سنے تھے اُسے کئی گنا زیادہ پایا۔اوراُسے ہرحال میں اپنانے کا فیصلہ کیا۔اگلے دن وہ اپنے مستقر پہنچا اور اوڑیجہ زمیندار کو منگنی کا پیغام بھیجا۔مریم کے باپ نے اوڑیجہ سردار سے اپنی جان چُھڑانے کیلئے کلہوڑہ حاکم کو منگنی کی رضامندی دیدی اور شرط لگادی کہ مریم کی کمسنی کے پیش نظر نکاح کے بعد چندعرصے تک رخصتی نہیں ہوگی اور مریم اپنے والدین کے پاس ہی رہیگی۔میاں سرفراز خان نے شرط مان لی اور نکاح پڑھوائی۔یہ 1762ء کا سال تھا۔اب مریم ایک حکمران کی بیوی تھی۔اور''سندھ رانی'' کے نام سے شہرت پالی۔

جب اوڑیجہ سردار مریم کو حاصل کرنے کی تگ ودو میں تھا تو اس دوران تالپور نوجوان میر باگہ بھی مریم کے فدائیوں میں شامل تھا۔لیکن اُسے حاصل نہ کرسکا۔اس کے باوجود کہ اب مریم ''سندھ رانی''بن چکی تھی میر باگہ کے عشق کا جنون کم نہیں ہوا تھا۔لیکن اب وہ بدین کے چکر لگاتا نہیں تھا۔حکمرانوں کے محلوں کی غلام گردشوں میں تقدیر ہر وقت کوئی نہ کوئی کھیل کھیلتی رہتی ہے۔کلہوڑوں کی محلاتی سازشوں نے جلد ہی اپنا رنگ دکھا دیا۔میاں سرفراز خان کے چچا میاں عبدالنبی کلہوڑہ نے سرفراز خان کا تختہ کردیا

اور اُسے گرفتار کر کے جیل کوٹھری میں پھینک دیا۔ جہاں اُسے قتل کر دیا گیا۔ اور میاں عبدالنبی کلہوڑہ سندھ کی حکومت پر قابض ہوگیا۔ حسن کی دیوی ''سندھ رانی'' ویسے بھی سندھ رانی یعنی ملکہ تھی اس لئے کلہوڑہ محل کی تاحال مالکہ تھی جسے پھر ملکہ بنانے کی خاطر میاں عبدالنبی نے مریم کے والد کو شادی کا پیغام بھیجا اور کہلوایا کہ مریم ویسے بھی اس محل کی سندھ رانی ہے وہ یہاں سے ویسے بھی جا نہیں سکتی بہتر یہی ہے کہ آپ میرے ساتھ اُسکی شادی منظور کریں۔ اور اسے شادی کا روایتی پیغام نہ سمجھیں بلکہ طے شدہ فیصلہ سمجھ کر قبول کریں۔

ایسے جبر ناک پیغام سے مریم کے والد نے اپنی سُبکی محسوس کی اور اس شادی کو نامنظور کیا۔ نتیجتاً کلہوڑہ حاکم نے مریم کو اپنی خاندانی میراث سمجھ کر اُس کے راستے میں آنے والی اس رکاوٹ کو ہمیشہ کیلئے دُور کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اپنے خاندان میں موجود خونی رشتے کے رقیبوں کو بھی موت کے گھاٹ اتارتا رہا اور دیر نہیں گذرا کہ تخت وتاج سے بے نصیب ہو کر جودھ پور کی ریاست میں پناہ گزین ہوا۔ اب اقتدار تالپور بلوچوں کے میر فتح علی خان کے ہاتھ آ گیا تھا جنہوں نے اپنے بلوچ جنگجوؤں کے ساتھ ہالانی کے میدان میں کلہوڑوں کو شکست دی تھی۔ یہ سال 1783ء تھا۔ میر فتح علی خان ٹالپر نے سندھ کی حکومت کو اپنے بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔ اس دانا شخص کو ''سندھ رانی'' کی شاہی ملکیت ہونے کا بھرپور احساس تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ ایک عورت کے مسئلہ پر خاندان میں رقابتیں پیدا ہوں۔ لہٰذا انہوں نے سمجھداری اور دور اندیشی کا ثبوت دیتے ہوئے سندھ

اقتدار کے تین حصے کیۓ اور چوتھا حصہ ''سندھ رانی مریم بی بی'' کو مع ایک سالانہ مقرر رقم'' کے بنادیا۔ اور بھائیوں کو اختیار دیا کہ جو جس حصہ کو پسند کرے۔ میر باگہ نے اعلان کیا کہ اُسے سندھ کے کسی حصے کے اقتدار سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ وہ ''سندھ رانی'' والے حصے پر راضی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ شاہی محل کا کُتا ''پونی'' اور گھوڑی ''دُردانہ'' بھی اُسے دیئے جائیں۔ یہ شرط منظور کی گئی اور بھائیوں نے بڑے شاہانہ انداز سے میر بھاگہ کی شادی کے رسوم ادا کیئے جس میں میر فتح علی خان کا کردار سب سے اعلیٰ رہا۔ میر بھاگہ نے جس کُتے اور گھوڑی کی فرمائش کی تھی دراصل وہ بی بی مریم کے پسندیدہ ہوتے تھے۔ شادی کے بعد میر بھاگہ نے ''گونی'' نامی گاؤں میں گھر بنایا اور وہیں رہائش اختیار کی۔ وہ مقام پھر اُسی کے نام سے ٹنڈو بھاگو مشہور ہوا جو آج تک اُسی نام سے ہے۔

5۔ دیکھئے حاشیہ نمبر 1۔

6۔ ممکن ہے اُن میں سے کچھ لوگ ایسا سمجھتے ہوں لیکن یہ حقیقت نہیں ہے۔ بنیادی طور پر ٹالپر کوئی ایک نسلی قبیلہ نہیں رہا ہے بلکہ یہ ایک خدمتگار گروہ تھا۔ جو لشکر کشیوں میں بار برداری اور دیگر جانوروں کیلیۓ درختوں کی نازک شاخیں کاٹ لاتے تھے۔ اسی نسبت سے ''ٹال بُر'' یعنی شاخیں کاٹنے والے کہلاتے تھے۔ البتہ ان کا مرکزہ ''ہوت'' قبیلہ سے متعلق ہوتا تھا۔

سندھ میں ان کا ورود ''رند اکثریت'' کے ساتھ ہوا ہے۔ ان کی کئی بے نام شاخیں یا گروہ منتشر صورت میں کئی قبیلوں میں موجود رہے ہیں، خاران کے لوڑیوں میں

بھی ان کی ایک شاخ ''ٹالپر'' نام سے اب بھی موجود رہے ہیں۔ (ملاحظہ کیجئے خاران گزیٹر) جوشاید بہ سبب غربت لوڑیوں کا پیشہ اپنانے کی وجہ سے اُن کا حصہ شمار ہوئے۔

سندھ میں پہلی بار یہ ڈیرہ اسماعیل خان سے براستہ ڈیرہ غازی خان وارد ہوئے۔

''بلوچ قوم اور اُس کی تاریخ'' کے مؤلف سرائیکی بولنے والے رند بلوچ مولانا نوراحمد خان فریدی نے اپنی سرائیکی زبان سے جذباتی وابستگی کو کام میں لاتے ہوئے اس قدیم گروہ کے بارے میں لکھا ہے کہ چونکہ ڈیرہ غازی خان میں وارد ہوتے وقت وہ ٹالہی (شیشم) درخت کے سائے میں دیوان لگاتے تھے اس وجہ سے ٹالپور کہلائے، ملاحظہ ہو:۔

> ''میران سندھ حسب ونسب کے اعتبار سے ہوت بلوچ ہیں اور میر اسماعیل خان فرمانروائے ڈیرہ اسماعیل خان کی اولاد ہیں۔ میران سندھ تالپور کہلاتے ہیں۔ وجہ تسمیہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ جب میر اسماعیل خان کا انتقال ہوا تو جانشینی کے مسئلہ پر اس کے دو شاہزادوں، میر ابراہیم خان اور میر غلام حسین خان میں خوب رسہ کشی ہوئی۔ انجام کار میر ابراہیم خان کامیاب ہوکر حکمران قرار پائے

اور میر حسن خان آزردہ ہو کر مع اعزا واقربا میرانی حکومت کی پناہ میں ڈیرہ غازی خان منتقل ہوئے اور بمقام چوٹی بالا آباد ہو گئے چونکہ ابتدأ مکانات کی کمی تھی اس لئے میر غلام حسین شیشم کے ایک گنجان درخت کے نیچے کچہری لگایا کرتے تھے۔ سرائیکی زبان میں شیشم کو ٹالھی کہتے ہیں اور مجمع کو ''پور'' سے موسوم کرتے ہیں اس لئے ٹالھی کی نسبت سے چوٹی بالا کے گردوپیش کے لوگ ان سرداروں کو ٹالھی پور کہنے لگے۔ یہی لفظ کثرت استعمال سے ''تالپور'' بن گیا۔ (صفحہ 12)۔

لوگ زبان سے اس حد تک مغلوب ہو جاتے ہیں کہ نسل کو بھی غلط نام دیتے اور تاریخ میں ہیرا پھیری کرتے ہیں۔ جناب فریدی صاحب شاید بھول گئے تھے کہ یہ مکران کا جنم لیا گیا ایک گروہ رہا ہے۔ جس کا نام سرائیکی میں نہیں بلوچی میں ہے اور صدیوں پرانا نام ہے۔ ایسی ہی ایک لسانی حرکت خاران کے نام کے ساتھ خاران پر لکھی گئی کتاب میں جناب عبدالقادر شاہوانی نے بھی کی کہ اس کے عربی ماخذ نام کو براہوئی زبان کا

''خار'' بنادیا جس کے معنی غصہ کرنا اور غصہ دلانے کے ہیں۔ اسی طرح چند لسانی ہیرا پھیریاں مرحوم گل خان نصیر نے بھی کیں کہ قدیم ہندی اور سنسکرتی کُتباتی جملوں کو محض ایک آدھ لفظ کی مشابہت کی بنیاد پر براہوئی زبان کا لکھا جو مورخ ہونے کے دعویداروں کی قلمی بددیانتی کے زمرے میں آتی ہے۔

7۔ یہی وہ بلوچی کردار ہوتا تھا جس کی بدولت قدماء کے بلوچ ہمعصر قوموں میں نمایاں نظر آتے تھے اور ان کا ہر شخص اپنی بلوچیت پر نازاں ہوتا تھا۔ اور دشمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ان پر غضبناک ہوتے تھے۔ جب دولت واقتدار کے مزے میں پڑے تو پھر میر نصیر خان ٹالپر کے پست مرتبے تک پہنچے اور دشمن کے کھلونے بنے۔ ایک بلوچ شاعر نے نصیر خان جیسے لوگوں کو دیکھ کر تو کہا تھا۔

دوّراں بلوچ دھلیگنگ انت

(خوشحالیوں نے بلوچ کو ہلا کر رکھ دیا ہے)

8۔ یہ بلوچ مہمانداری کی ایک جھلک ہے جس کا اظہار مصنف انگریزی سفیر نے کیا

ہے۔

9۔ جب بھی بلوچ حکمرانوں نے اپنے خونی رشتہ کے بھائیوں کو چھوڑ کر غیروں کی چرب زبانی اور چاپلوسیوں میں آ کر ان کی سرپرستی کی اور اپنی کمزوریاں ان کے ہاتھ میں دیں۔ تو پھر انہی کی اندرونی سازشوں کے گھیرے میں آ کر دشمنوں کے ہاتھوں مغلوب ہوئے۔ قلات کے بلوچی دربار میں بھی بعض خوانین نے غوری جیسے چاپلوسوں پر پہلے دست

شفقت رکھی، اور جب ان کی کمزوریوں سے فائدہ اٹھا اٹھا کر اپنے کو توانا کیا تو پھر غیروں سے مل کر اُن کے خلاف سازشوں کا جال پھیلاتے رہے۔ایسے بدفطرت چرب زبانوں میں داؤد خان نامی غلزئی، سید محمد شریف، وزیراعظم کے عہدے تک پہنچنے والا پنجابی شمس شاہ جس کی بدمعاشیوں کے خلاف معروف قوم پرست صحافی غلام محمد شاہوانی نے ''شمس گردی'' نامی مشہور پمفلٹ چھاپ کر اُسکی کمینگیوں کو طشت از بام کیا۔ان سے پہلے دربار میں گھسنے والے آخوند محمد حیات، آخوند فتح محمد اور آخوند محمد صدیق وغیرہ شامل تھے۔جو ہر وقت قلات کی حکمرانی پر قبضہ کرنے کے چکر میں تھے اور غیر ملکی حکمرانوں کیلئے جاسوسی کرتے رہے اور انہیں قلات پر قبضہ کرنے کیلئے اُکساتے رہتے تھے۔انہی نمک حراموں کی سازشوں اور فریب کاریوں نے انگریزی حکومت کو قلات پر حملہ کرایا اور خان میر محراب خان جیسے سپوت کو کئی بہادروں اور جان نثاروں کے ساتھ شہید کروایا۔بعد میں جس کی حقیقت انگریزی حکومت پر آشکار ہوئی اور انہیں میر محراب خان کی بے گناہی پر یقین آ گیا اور اس واقعہ پر افسوس کیا۔

سندھ کے بلوچی دربار میں موجود اس مارواڑی غوری نے میر نصیر خان کو بھائیوں کے بیچ سے ورغلا ورغلا کر اُسے انگریزی جاسوس اور ایجنٹ بنادیا اور خاندان میں ناچاقیوں کا بیج بو دیا تھا۔

10۔حکمرانوں کا اپنی رعیت پر رعب و دبدبہ وہاں ہوتا ہے کہ دونوں میں خونی ونسلی، علاقائی اور معاشرتی وتہذیبی بعد ہو۔حکمران غیر اور اجنبی ہوں اور غارتگری وکشت خون

کے نتیجے میں غالب آئے ہوں اور رعیت کے لئے اجنبی اور ظالم وخونخوار واقع ہوئے ہوں۔ جہاں حاکم ومحکوم ایک خون ونسل اور ایک ہی معاشرہ اور قوم سے ہوں اور ان کا آپس میں میل جول صدیوں سے ایک خاندان جیسی حیثیت کا رہا ہو۔ اور ایک دوسرے کو نسل در نسل اور آباواجداد سے جانتے پہچانتے اور ان میں ہر معاملہ اور اونچ نیچ مشترک ہو وہاں صورت مختلف ہوتی ہے اور حاکم، غیروں اور قابضوں کی طرح کا کردار ادا نہیں کر سکتے اور ان کی رعیّت جو کہ انہی کا اٹوٹ حصّہ ہے کسی بیجا دبدبے میں نہیں آتا۔ ان میں کا رشتہ قدرے فاصلہ دار ضرور ہوتا ہے لیکن زہریلا اور ناقابل برداشت نہیں ہوتا ہے۔ اس بنا پر مسٹر ڈلہوسٹ کے ذہن میں جو استعماری عسکری تصور ہوتا تھا اُسے اُس کی تعبیر تالپور بلوچی دربار میں نہیں مل سکی اور مل بھی نہیں سکتی تھی۔

11۔ شیدی غلاموں کے علاوہ ان کے دیگر خدمتگار بھی ہوتے تھے جو مکرانیوں اور بلوچستان کے علاقہ سرِ مکران (موجودہ ضلع آواران) کے قبیلہ کوروا ہ سے خصوصی طور پر لائے جاتے تھے۔ جو ان کے خاص اعتمادی ہوتے تھے جو اُن کے گھروں، اصطبلوں میں گھوڑوں اور اونٹوں کی نگہبانی اور پرورش کے کاموں کے علاوہ شکارگاہوں میں خدمات سرانجام دیتے تھے۔ یہ مع گھربار کے بلائے جاتے تھے۔ یہ خادم گروہ پھر حکمرانوں کی نسبت سے ''خاص خیلی'' کہلائے۔ یعنی خواص خانوادوں کے خادمین۔ اب یہ خاص خیلی ایک قبیلہ کی شکل میں موجود ہیں۔

12۔ یہ روایت بلوچستان میں بھی بعض رند قبائل کے خاندانوں کے بارے میں بھی بیان کی گئی ہے خصوصاً جھلاوان میں زہری رندوں کے چند سردار گھرانوں کے بارے میں ماضی میں اس عمل پر کار بند رہنا بتایا گیا ہے۔

13۔ ان پڑھ ہونا ایک الگ مسئلہ ہے اور جاہل ہونا ایک الگ خامی ہے۔ اگر وہ ان پڑھ بلوچ ''جاہل'' ہوتے تو انہیں اپنے حرم کا تقدس ،اولاد کی اچھی تربیت اور اخلاق آموزی، تہذیب و مرتبہ شناسی، آداب حکمرانی، اپنوں اور غیروں کے ساتھ مراتب کے لحاظ سے سلوک کے اطوار نہیں آتے تھے۔ معلوم نہیں مذکورہ افلاطون نے ''جاہل'' سے کیا مراد لیا ہے۔ اُس کا اپنا نقطہ نظر ''بالغ نظری'' کے اعزاز سے محروم نظر آتا ہے۔

14۔ یہ ٹوپی بلوچی کلچر کا ایک ایک اہم حصّہ رہا ہے اور ہے۔ بلوچ مرد اور عورتیں اپنے لباس اور ٹوپی کی خوبصورت کشیدہ کاری کی وجہ سے تمام ہمسایہ اور ہمعصر اقوام میں نمایاں رہے ہیں۔ آج بھی بلوچ عورتیں اپنی اسی روایتی پوشاک میں اور بلوچ مرد اِسی ٹوپی کی بدولت سینکڑوں میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ لیکن اب ایسا نظر آرہا ہے کہ بلوچ مرد اپنے کو بڑی تیزی سے اپنی اس ہزاروں سالوں کی بلوچی شناخت کی علامت سے بیگانہ کر رہے ہیں۔ یہ ٹوپی اب بن تو بلوچ گھروں میں رہی ہے لیکن فروخت ہو کر غیر بلوچوں کے سروں کی زینت بن رہی ہے۔

بلوچی دستکاری کا یہ پورے عالم میں بے مثال شاہکار ٹوپی جو عمومی نام ''بلوچی ٹوپی'' یا ''بلوچی کلاہ'' لئے ہوئے ہے تاریخ میں ''گوشو'' کے نام سے مشہور رہی ہے۔ اور

ہزاروں سالوں سے بلوچ بچوں اور نوجوانوں کے سروں کی زینت رہی ہے۔ ابتداء میں اسے صرف بچوں کیلئے بنایا جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ اس میں تبدیلیاں اور مزید جاذبیت لائی گئی اور اسے بلوچ نوجوان بھی پہنے لگے۔ لیکن چالیس سال کی عمر کے بعد کے مردوں نے یا تو اس کا استعمال نہیں کیا یا پھر اسے اپنی پگڑی کے نیچے پہن لیتے تھے۔ یاد رہے کہ بلوچ بچے اور نوجوان، ترکوں اور افغانوں کی طرح پگڑی کا استعمال نہیں کرتے تھے۔ بلوچوں میں پگڑی چالیس سال کی عمر کے بعد باندھا جاتا تھا ماسوائے سرداری دستار بندی کے۔ جس میں ٹوپی استعمال نہیں ہوتی تھی اور اگر کہیں کسی نوجوان کی سرداری کی دستار بندی کا مرحلہ آتا تو وہ یہ ٹوپی پگڑی کے نیچے پہن لیتا تھا۔ البتہ شوقیہ طور پر کبھی کبھی نوجوان بھی دستار باندھتے تھے اور اس طرح باندھتے تھے کہ سر کی چوٹی پر منقش ٹوپی نظر آجائے۔

بلوچ قبیلے جہاں جہاں نقل مکانی کر جاتے تھے اس ٹوپی کی دستکاری کے ہنر اور پہننے کے رواج کو بھی ساتھ لیجاتے تھے جو ان کی تہذیبی شناخت ہوتی تھی۔ جہلاوان وسراوان کی جاٹ آبادیوں سے لے کر انتہائے سرحدات سندھ تک بلوچوں نے اپنے اس تہذیبی علامت کو پھیلا دیا۔ جسے بہت جاٹ قبیلوں نے بھی اپنا لیا۔ سندھی جاٹوں نے تو بلوچ قبائل کی اپنی تاریخی شناخت سے عدم دلچسپی اور بے اعتنائی کے پیش نظر اسے شعوری پروپیگنڈے کے ذریعہ سندھی ٹوپی کا نام دیا۔ نتیجتاً اب یہ بلوچی شناخت سے منتقل ہو کر سندھی شناخت بن گیا ہے۔ جبکہ سندھ میں اب بھی اس کے بنانیوالے اور فروخت کرنے والے بلوچ ہی ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ سندھی اور پنجابی اصل قدیم آبادی ہندو جاٹوں پر

مشتمل ہے اور ان کے پاس نہ کوئی روایتی ٹوپی ہوتی تھی اور نہ شلوار۔ وہ ہندوؤں کی مختصر پگڑی بے ڈھنگے طریقے سے باندھتے تھے اور تہبند میں ہوتے تھے۔ حیرت اور افسوس کی بات تو یہ ہے کہ اس تاریخی بلوچی میراث کو ''بلوچی ٹوپی'' کی بجائے ''سندھی ٹوپی'' کا نام دینے پر کسی بلوچ کی رگ قومیت نہ پھڑکی، احتجاج تو دور کی بات ہے یہی صورت حال اب بلوچستان میں بھی پیدا ہو چکی ہے۔ اس حسین میراث کے قدیم ترین وارث مکران کے بلوچوں نے تو اسے کافی عرصے سے الوداع کہہ کر تہذیبی لحاظ سے اپنے کو مُردہ ثابت کر دیا ہے، اب جھلاوان و سراوان میں بھی صرف اس کی تجارتی بنائی پر اکتفا کیا جا رہا ہے۔ اس طرف یہ بلوچی میراث شمال کی طرف پٹھانوں کو منتقل ہو رہی ہے۔ ظاہر بات ہے جو جس تہذیبی میراث کا استعمال کرتا ہے وہ شناخت بھی اُس کی بن جاتی ہے۔ مکران کی اپنے اس میراث سے دستبرداری کے بعد سندھ کے بلوچ بھی اس سے دستبردار ہو گئے ہیں اور اب یہ ہزاروں سالوں سے بلوچوں کی امتیازی شناخت ہونے کے مرتبے سے اخراج کے آخری منزل پر پہنچ گئی ہے اور چند عرصہ بعد یہ افغان یا پشتون ٹوپی کا نام پائے گی اور اپنی تاریخ اور تہذیبی و قومی شناخت کی بھڑ مارنے والے بے حس اور خوابیدہ بلوچ اسی بے اعتنائی اور غیر ذمہ داری سے صرف دیکھتے ہی رہیں گے۔

ٹالپر حکمرانی کا عرصہ 1782ء تا 1843ء

الف۔ حیدرآباد کے حکمران:

1۔ میر فتح علی خان بانی ٹالپر بلوچ اقتدار	1782ء تا 1802ء
2۔ میر غلام علی خان ٹالپر	1802ء تا 1811
3۔ میر کرم علی خان ٹالپر	1812ء تا 1828
4۔ میر مراد علی خان ٹالپر	1828ء تا 1833
5۔ میر نور محمد خان ٹالپر	1833ء تا 1840
6۔ میر نصیر خان ٹالپر	1840ء تا 1843

ب: خیر پور کے حکمران:

1۔ میر سُہراب خان ٹالپر	1784ء تا 1830
2۔ میر رُستم خان ٹالپر	1830ء تا 1842
3۔ میر مراد علی خان ٹالپر (اوّل)	1843ء تا 1894

ج: میر پور کے حکمران:

1۔ میر ٹھارہ خان ٹالپر	1782ء تا 1829
2۔ میر علی مراد خان ٹالپر	1829ء تا 1837
3۔ میر شیر محمد خان ٹالپر	1837ء تا 1843

خوانین بلوچ، قلات

انگریزی دور کے ایسٹ انڈیا کمپنی کے یوروپی ملازم لیفٹننٹ ہنری پوٹنگر نے ایک جاسوس اور سروئیر کی حیثیت سے سندھ اور بلوچستان کا مطالعاتی سفر کیا۔ یہ سفر انہوں نے 2 جنوری 1810ء سے شروع کیا اور 6 فروری 1811 کو اختتام پذیر کیا۔ وہ سونمیانی سے ہوتا ہوا اندرون بلوچستان سے مغربی بلوچستان کے بمپور اور بسمان تک گیا۔ یہ سفری فاصلہ تقریباً ڈھائی ہزار میل بنتا ہے۔ اس مطالعاتی دورے کی روداد کتاب ”سفرنامہ سندھ و بلوچستان“ کی شکل میں 1816ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں قلات اور خوانین بلوچ کے بارے میں اُس کے بیانات کا ہم مطالعہ کریں گے۔

> ”شہر قلات ادوار سابقہ کی طرح بلوچستان کے کئی صوبوں کا دارالحکومت ہے۔ یہ کسی وقت بلوچستان پر حاوی تھا اور بلوچوں میں واحد منظم حکومت کا مرکز ہونے کی وجہ سے اس کی موجودہ تاریخ دوسرے خطوں کی تاریخ سے متعلق اور اہم ہے۔

موجودہ برسر اقتدار خاندان سے

پہلے صدیوں سے ایک ہندو خاندان حکومت کرتا تھا اور آخری راجہ کا نام سیوا تھا یا اس خاندان کے لوگ برسر اقتدار آنے کے بعد یہ لقب اختیار کرتے تھے۔ موخرالذکر زیادہ قرین قیاس ہے اس لئے کہ قلات اب بھی اکثر قلات سیوا کہلاتا ہے جس کی اغلب وجہ فرد کی بجائے حکمرانوں کا ایک سلسلہ ہے (1)"۔"سیوا خود زیادہ تر قلات میں رہتا تھا اور اس کا اکلوتا بیٹا "سنگین" بطور نائب زہری میں قیام پذیر تھا ان دونوں کی حکومت عادلانہ تھی اور وہ اپنی مملکت میں سوداگروں اور دیگر نوواردوں کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ ملتان، شکارپور اور بالائی سندھ کے مغربی حصوں کے قزاقوں کا ایک گروہ ایک افغان سرغنہ کے تحت اور ایک رند بلوچ قبیلہ مزاری جواب بھی تاخت وتاراج کیلئے مشہور ہے، کی

حمایت کے ساتھ سارے علاقے میں بار بار
یورشیں کرتا رہتا تھا بلکہ اب تو قلات بھی ان
کے نرغے میں آ گیا تھا۔ لہذا سیوا کو مجبوراً
پہاڑی چرواہوں اور ان کے سردار کو مدد کیلئے
بلانا پڑا۔ یہ سردار کمبر تھا جو شجرہ نسب میں
سرفہرست ہے (2) اس کے آباواجداد حبشی
بتائے جاتے تھے اور وہ خود ایک مشہور پیر کی
اولاد سمجھا جاتا تھا جس نے اپنے دور میں کئی
کرامات دکھائی تھیں۔ اس سے کمبر اور اس
کے حامیوں کو ملک میں ایک خاص وقار اور
افتخار حاصل ہوگیا جو حامیوں کی مختصر تعداد اور
خود کمبر کی حقیر موروثی جائداد جو پنجگور مکران
میں تھی، کیلئے حاصل کرنا ناممکن تھا (3)
جھالاوان اور سراوان کے پہاڑوں پر پہلی
دفعہ چڑھنے کے بعد سیوا نے اپنے ان
مددگاروں کو حقیر سا وظیفہ دیا جو بمشکل ان کی
گذراوقات کیلئے کافی ہوتا تھا لیکن چند

سالوں میں ڈاکوؤں کی سرکوبی یا ان کا قلع قمع
کرکے یہ لوگ ملک کا فوجی قبیلہ بن گئے اور
پھر اس کے مالک بن بیٹھے۔ کمبر نے راجہ کو
تخت سے اُتار دیا اور سربراہ مملکت بن کر
ہندوؤں کو مسلمان بننے پر مجبور کردیا یا مذہبی
جذبے کے تحت موت کے گھاٹ اُتار دیا
"(4)

"سیوا چند لوگوں کے ساتھ زہری چلا گیا
جہاں اس کا بیٹا سنگین (5) ابھی برسر اقتدار تھا
لیکن ان کے نئے دشمن دیگر قبائل کو حلیف بنا
کر یوماً فیوماً زور پکڑتے گئے اور بالآخر انہیں
اس پناہ گاہ سے بھی نکال دیا اور وہ شکار پور،
بھکر اور ملتان چلے گئے اور اپنے ہم مذہبوں
میں جذب ہوگئے۔ بتایا جاتا ہے کہ سیوا اس
بغاوت کے آخر میں مرگیا اور سنگین نے قیدی
ہوکر اپنا مذہب ترک کرکے اسلام قبول
کرلیا۔"

''کمبر کے مسند نشین ہونے کے بعد اُس کے
جانشینوں نے حوصلہ افزائی کے ذریعہ بہت
سوں کو اپنے زیر سایہ رہنے اور تجارت کرنے
پر آمادہ کرلیا۔ ساتھ ہی انہوں نے پوری
کوشش کی کہ خانہ بدوش گڈریوں کو قبائل میں
منظم کردیں اور اُس کیلئے انہوں نے زمین
کے بڑے بڑے قطعات انہیں دیئے جو
محصول معاف اور غیر مشروط تھیں سوائے اس
کے کہ وہ کمبرانیوں کو حاکم اعلیٰ تسلیم کرلیں اور
بوقت ضرورت انہیں حسب استطاعت مقررہ
تعداد میں سپاہی مہیا کردیں یہ امن پسندانہ
نظام تمام زبانی روایات کے مطابق (کیوں
کہ اور کوئی ماخذ ہے ہی نہیں) کمبر کے چوتھے
جانشین عبداللہ خان تک قائم رہا (6) جو ایک
بیباک اور پُر امنگ سپاہی تھا۔ اُس نے کچھ
گنداوہ فتح کرنے کا سوچا جس پر ملوک
الطوائف حکومت کرتے تھے۔ چنانچہ ایک

بڑی فوج تیار کی گئی، جنگ کے پانسے پلٹے رہے اور بالآخر کمبرانی اِس زرخیز میدان اور اس کے صدر مقام گنداوہ پر ہمیشہ ہمیشہ کیلئے قابض ہو گئے۔"

"عبداللہ خان کی موت کے بعد اُس کا بڑا بیٹا حاجی محمد خان (6-A) (جو چادر نادر شاہی میں یرغمال تھا) خلعت وغیرہ لے کر قلات آیا اور مُلک کی باگ ڈور سنبھالی۔ لیکن وہ اپنے والد کا وقار قائم نہ رکھ سکا۔ یہ دیکھ کر سندھیوں نے گنداوہ میں فوج داخل کر دی لیکن بلوچ اور اُن کے ظلم وستم کے ستائے ہوئے دیگر لوگوں نے متحدہ قوت سے انہیں سندھ کے پار بھگا دیا۔

"دریں اثنا حاجی محمد خان نے اپنے آپ کو ظلم وعیش کی نذر کر دیا۔ اُس نے اپنے والد کے دور کے ہلکے محصولات بازار کو تین گنا کر دیا اور حکم دیا کہ کوئی بھی ہندو محل کے آس پاس نہ

رہے۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب اپنی دکانوں سے نکال دیئے گئے اور جب انہوں نے احتجاج کیا یا فرار ہو گئے تو ان کی جائیداد ضبط کر لی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اُس نے غیر انسانی اور متروک رسم کی تجدید کر دی جس کے تحت خان کو بحیثیت حاکم اعلیٰ یہ اختیار تھا کہ وہ شادی کی پہلی رات ہندو دلہن سے ہم بستری کرے بلکہ وہ تو اِس قانون کو مسلمان رعیّت پر بھی لاگو کرنا چاہتا تھا۔"

حاشیہ: "یہ قانون کمبر نے قلات پر قبضہ کے فوراً بعد نافذ کیا تھا تاکہ ہندوؤں کو ڈرایا دھمکایا جائے ورنہ کوئی اور مقصد نہ تھا۔"

(مصنف مذکورہ کتاب صفحہ 7)

"لوگ دو سال سے زیادہ اِس جور و جفا کو سہتے رہے اور اس عرصہ میں قلات خالی ہو گیا اور سرداروں نے درباروں میں آنا بند کر دیا اور حاجی محمد خان کے احکامات کو بھی نظر انداز کرنا

شروع کردیا۔ اتنے میں نادر شاہ سندھ سے ہوتا ہوا قلات سے کوئی ستر میل کے فاصلے سے گذرا اور عبداللہ خان کے دوسرے بیٹے نصیر خان کو خلعت اور دیگر نشانات شاہی کے ساتھ قلات روانہ کیا۔"(8)

"نصیر خان نے اپنے دور کا آغاز ایسے کاموں سے کیا کہ لوگ اُس کے عقیدتمند اور وفادار ہوگئے۔ اُس نے محصولات کا زیادہ حصّہ منسوخ کردیا جو اُس کے بھائی نے عائد کئے ہوئے تھے۔ جانور ہر قسم کے محصول سے مستثنٰی قرار دیئے گئے۔ انہوں نے ہندوؤں کو شکار پور اور دوسرے قصبوں سے بلایا اور ان کی سرپرستی کی تاکہ حکومت کو فائدہ ہو۔ اُس نے قلات میں انہیں مذہبی آزادی کے ساتھ ساتھ اُن کا پُرانا حق دیدیا تاکہ وہ اپنے برہمنوں کے رکھ رکھاؤ اور مندر کی دیکھ بھال کیلئے ایک چونی بازار میں آنے والے

بار بردار اونٹ سے وصول کر سکتے تھے''

''اُس نے سرداروں کو اپنی اپنی فوجی دستے کو ایک مقررہ تعداد میں لانے کا حکم دیا۔ جب لشکر جمع ہوگیا تو اُس نے قلات سے خضدار، پنجگور رہوتا ہوا کیچ کا سفر کیا۔ کچھ عرصہ ٹھہر کر پھر مغربی ترین سرحد کسر قند گیا۔ وہاں سے دڑک اور پھر خاران سے ہوتے ہوئے واپس قلات آیا۔ اس سفر میں انہوں نے اندرونی انتظام کو دیکھا اور اسے مستحکم کیا۔ واپسی پر انہوں نے قلات شہر کو مستحکم کیا اور موجودہ قلعہ بندیاں بنوائیں۔ کابل وغیرہ سے پودے اور پھول منگوا کر مستحق زمینداروں میں تقسیم کئے اور باغات لگوائے۔ بہترین زمینداری اور باغبانی پر انعامات تقسیم کئے۔ پھر کچ گنداوہ جا کر بلوچ سرداروں سے وفاداری کا حلف لیا۔''

''1747ء میں نصیر خان نے احمد شاہ ابدالی کو

اپنا حاکم اعلیٰ تسلیم کیا جس کا مقصد یہ تھا کہ ہمسا یگی کے پیش نظر جنگ کا خطرہ نہیں رہے گا کیونکہ وہ اپنے آپ کو اُس کا باجگزار نہ سمجھتا تھا بلکہ نادر شاہ کی وراثت میں ثانوی حصہ دار گردانتا تھا۔

1758ء میں اُس نے اپنی آزادی کا اعلان کیا تو احمد شاہ نے اپنے وزیر کے تحت ایک لشکر اُسے سزا دینے کیلئے بھیجا۔ خان نے اپنے قبائلی لشکر سے قلات سے ستر میل شمال میں پڑنگ آباد میں اُسے شکست فاش دیدی۔ پھر شاہ کابل خود لشکر لے کر اُس کے پیچھے آیا۔ خان نے پرزور مزاحمت کی تیاری کی ہوئی تھی۔ بادشاہ نے اپنی ساری فوج کے ساتھ اس کا محاصرہ کیا اور شبخوں کی تین کوششیں کیں جو ناکام ہوئیں۔ تب شاہ نے اُس کو مصالحت کی پیش کش کی جو اس معاہدہ پر منتج ہوا: (9)

☆ خان کسی صورت خراج نہیں دے گا۔

صرف بوقت ضرورت فوجی مدد کرے گا اپنے خرچے پر۔

☆اور اس کے بدلے میں اُسے اخراجات کے نصف کے مساوی نقد الاؤنس ملے گا۔

☆ وہ اور اس کے جانشین کابل کی کسی خانہ جنگی میں ملوث نہیں ہوں گے۔

مذکورہ معاہدے کے بعد شاہ کابل واپس ہوا۔"

"1769ء میں سب ایرانی سرداروں نے افغانوں کے مغربی مقبوضات پر حملے کا پروگرام بنایا تو نصیر خان نے پھر احمد شاہ کا ساتھ دیا۔ شہزادہ تیمور اور کچھ تجربہ کار جرنیلوں کو شاہ نے مشہد کے نزدیک ایرانیوں سے لڑنے کو بھیجا۔ ایرانی، افغانیوں پر بھاری ہو رہے تھے کہ نصیر خان نے اپنے تین ہزار بلوچ سوار لے کر اس جوش سے حملہ آور ہوا کہ ایرانی پسپا ہوئے۔"

''اگر ہم نصیر خان کے کردار کا بحثیت
سپاہی، مدبر اور حکمران جائزہ لیں اور ذہن
میں ان لوگوں کو رکھیں جن کے درمیان وہ
مصروف کار رہا تو ہم اس میں ان مراتب
وفرائض کے مطابق خوبیوں کا ایک غیر معمولی
امتزاج پاتے ہیں۔ اُسے دولت کی کوئی حرص
نہ تھی کیوں کہ وہ میدان جنگ میں اپنے
خادموں سے بہتر طرز زندگی کا مالک نہ تھا اور
دولت کو خاطر میں نہ لاتا تھا سوائے اس کے
کہ اسے وہ جوہر قابل کی پرورش اور اپنی رعایا
کی فلاح کا ذریعہ سمجھتا تھا وہ شاذونادر نقدی
بطور تحفہ دیتا تھا کیوں کہ اس کے خیال میں یہ
انسان کو کاہل اور مفت خور بناتی ہے لیکن جب
کوئی کاریگر اپنی صناعی کا کوئی نمونہ اسے پیش
کرتا تو اُسے اُس کی دس یا بارہ گنا قیمت کے
پارچہ جات اور دیگر اشیاءِ ضرورت دینے کا حکم
دیتا۔

ایک مدبر کی حیثیت سے اُس نے
ایک وسیع سلطنت کو چند ماہ میں اپنے اقتدار
کے لئے سازگار بنالیا۔اس کی ہمہ گیر گرفت کا
اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ دور افتادہ
ترین اضلاع بھی اس کے احکامات پر عمل
کرنے پر مستعد رہتے تھے جیسے کہ قریبی
اضلاع۔ ایک حکمران کی حیثیت سے اُس کا
انصاف اور فرض شناسی اتنے نمایاں تھے کہ
اُس کا نام ملک کے طول وعرض میں ایک
ضرب المثل بنارہا اور بنا ہوا ہے۔ القصہ نصیر
خان اگر کسی بہتر قوم پر حکمران ہوتا یا کسی ایسی
قوم پر جس سے اہل یورپ زیادہ آشنا ہوتے
تو وہ اپنی زندگی میں ایشیائی حکمرانوں کے
درمیان ایک مظہر فطرت سمجھا جاتا۔ وہ وسیع
المشرب ، بہادر، عدل پسند اور عفو پرور تھا۔
کلفت وصعوبت میں صابر وشاکر تھا اور اپنے
قول کا اتنا دھنی تھا کہ اُس نے کبھی اپنے

معمولی سے معمولی وعدے سے بھی انحراف نہ
کیا۔"
"اس جلیل القدر حکمران کی وفات پر اُس کے
عمزاد بہرام نے حکومت پر قبضہ کرنیکی کوشش
کی اور کمسن محمود خان کو ایک معاہدے کے
ذریعہ کچ گنداوہ کا صوبہ اُس کے حوالہ کرنا
پڑا۔ اس نے وعدہ کیا تھا کہ حصّے ملنے کے بعد
وہ باقی ماندہ حصّوں میں مداخلت نہیں کرے
گا۔ لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد اُس نے ایک
سندھی لشکر جمع کر لی تا کہ حکومت پر قبضہ
کر لے۔ محمود خان نے شاہ کابل کو مدد کیلئے
لکھا تو اُس نے خان کی بھرپور مدد کی اور
دونوں لشکر ڈھاڈر کے مقام پر آمنے سامنے
ہوئے۔ بہرام خان کو شکست ہوئی اور زخمی
ہو کر حیدر آباد بھاگ گیا۔ سندھ کے امیروں
نے اُسے پناہ نہ دی چنانچہ وہ بہاولپور کی
طرف چلا گیا لیکن اس شہر سے ایک بیس میل

دور ایک گاؤں ٹانڈہ قلندر شاہ میں تھکاوٹ کی
وجہ سے چل بسا۔''

''بہرام خان کی موت کا سنتے ہی اُس کی
سوتیلی بہن نے لاڑکانہ جا کر میر غلام علی تالپور
سے محمود خان کے خلاف مدد مانگی اور اس کے
بدلے بہرام خان کی اکلوتی بیٹی کا رشتہ اُسے
دیدیا۔ تالپور میر نے شادی رچانے کے بعد
قلات کے خلاف مدد دینے سے انکار کیا اور کہا
کہ وہ قلات کے اندرونی معاملات میں
مداخلت نہیں کرے گا۔ امیران سندھ نے
قلات کے ان باہمی جھگڑوں سے فائدہ اٹھا
کر کراچی بندرگاہ پر قبضہ کرلیا جو نصیر خان کے
دور سے بلوچی حکومت کے قبضہ میں تھی
(10)۔ دوسرے صوبوں اور ضلعوں کے گورنر
اور حاکم بھی اپنے خان کی کمزوری بھانت
گئے، خراج دینا بند کر دیا اور اسے صرف برائے
نام حاکم سمجھنے لگے اس وقت سے خان قلات

کی حکومت صرف پہلے خطّے

(سراوان، جھلاوان اور قلات) اور تیسرے

خطّے (کچھ گنداوہ، ہڑند وداجل) تک محدود

ہوکررہ گئی ہے۔"

"محمود خان ایک نرم مزاج اور کاہل الوجود

انسان ہے۔ وہ اپنے والد کی سلطنت کے

احیا کی فکر میں ہے لیکن اس کی سستی و بے

فیصلگی کے پیشِ نظر میرے خیال میں اُس کا

کامیاب ہونا محال ہے اور اگر مغربی بلوچ اُس

کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں تو وہ اپنی موجودہ

مختصرسی سلطنت سے بھی ہاتھ دھو بیٹھے گا۔"

"خوانین قلات کے ایک درباری شخص آخوند محمد صدیق نے خوانین اور خانی قلات پر ایک چھوٹی سی کتاب فارسی میں "اخبارالابرار" کے نام سے 1276ھ میں لکھی جسے انگریزی حکومت کے چیف نیٹیو اسٹنٹ اور تاریخ بلوچستان کے مصنف رائے ہتورام نے اپنی تصنیف میں من وعن شائع کیا۔ اس کا اُردو ترجمہ میر گل خان نصیر نے 1982ء میں کر کے شائع کرایا اور اس کا نام "تاریخ خوانین قلات" رکھا۔ یہاں ہم زیرِ نظر موضوع پر آخوندی بیانات کا مطالعہ کریں گے(11)

''قلات ایک ہندو بادشاہ کے قبضے میں تھا (12) سیوا کے بعد قلات پر مغلوں نے قبضہ کیا چونکہ مغلوں کو اپنے علاقہ خراسان میں لڑائی جھگڑے پیش آئے۔ ان کے بعد قلات پر میر وانیوں نے قبضہ کرلیا اور میر عمر میر وانی قلات کا حاکم بن بیٹھا (13)''

''چاکر، سردار رند اور گواہرام لاشاری نے مکران سے قلات کا رُخ کیا۔ تب میر وانیوں اور چاکر بلوچ کے والد شہیک کے درمیان لڑائی ہوئی، بلوچوں کا لشکر غالب آ گیا۔ میر عمر لڑائی میں مارا گیا۔ قلات کو میر وانیوں سے لے لیا گیا۔''(14)

''اب شیہک، چاکر رند اور گواہرام لاشاری نے کچھی پر قبضہ کرنے کے لئے آپس میں مشورہ کیا۔ چاکر رند اور اس کے والد شیہک درّہ بولان سے ہوکر ڈھاڈر میں اُترے، گواہرام سردار لاشاری درّہ مُولا سے گنجابہ

(گنداوہ) پہنچے۔ وہ مندو بلوچ کو جو رندوں میں پھُرز کہلاتے ہیں، قلات کا حاکم مقرر کر کے گئے۔"(15)

"میر عمر میروانی کے قتل کے وقت اُس کا بیٹا کمسن تھا۔ اُس کا نام بجّار تھا۔ اُس کی والدہ اُسے ساتھ لے کر مستنگ چلی گئی (16)۔ وہاں پر بجّار کی والدہ نے خواجہ خیل قبیلہ کے کسی فرد سے شادی کی (17)۔

"میر بجّار جب بڑا ہوا انتقام کا جذبہ اُس کے سر چڑا۔ خواجہ خیلوں سے اُس نے جانے کی اجازت طلب کی۔ خواجہ خیل چونکہ کمزور لوگ تھے اُسے امداد دینے اور اُس کی حمایت کرنے کی طاقت نہیں رکھتے تھے، اُسے جانے کی اجازت دیدی۔ ایک گھوڑا، اسلحہ اور کچھ نقد رقم بھی انہوں نے دی۔(18)۔

"میر بجّار انتقام لینے کے ارادے سے جب منگچر پہنچا تو وہاں پر کچھ زمیندار اپنے کھیتوں

میں پانی دے رہے تھے میر بجار نے اُن سے مندو حاکم قلات کا حال پوچھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ زمینداروں نے بتلایا کہ مندو قلات پر حکومت کر رہا ہے، میر عمر مارا گیا اور دوسرے تمام میروانی دربدر اور خوار و خراب ہو گئے ہیں۔ میر عمر کا بیٹا بجار مستنگ میں خواجہ خیلوں کے پاس پڑا ہوا ہے۔ اُن سے روٹی کے ٹکڑے لے کر کھاتا ہے۔ تب میر عمر کے بیٹے بجار نے کہا کہ بجار میں ہوں اور اپنے باپ کے خون کا انتقام لینے کیلئے آیا ہوں زمینداروں نے بجار سے کہا کہ اس تمام علاقے میں بلوچ پھیلے ہوئے ہیں۔(19) اپنا نام ظاہر نہ کرو کہ مارے جاؤ گے(20)۔

''اُس نے زمینداروں سے کہا کہ تم لوگ کیا مشورہ دیتے ہو انہوں نے بجار سے کہا کہ سپاہی اور اُس کے بیٹے قلات کے قریب چھپر

میں رہتے ہیں۔ سیاہی، رئیس کا بیٹا ہے اس لئے ان کو رئیسانی کہتے ہیں۔ تم اُس کے پاس جاکر اپنے کام کیلئے اُس سے مشورہ کرو (21)

"منگچر سے میر بجّار سیاہی خاندان کے پاس گیا۔ جب وہاں پہنچا تو ظاہر کیا کہ میں ہی میر عمر کا بیٹا ہوں اور میرا نام بجار ہے۔ تمہارے پاس اس لئے آیا ہوں کہ میری مدد کرو اور قلات پر قبضہ کرکے اسے میرے سپرد کردو۔ سیاہی نے بجّار کے جواب میں کہا کہ قلات کے حاکم کے خلاف سیالداری کی لڑائی میں نہیں لڑسکتا لیکن آپ کو بھی اپنے گھر سے نہیں نکال سکتا اور نہ ہی لشکر جمع کرکے قلات پر حملہ کرنے کو آپ کے ساتھ آسکتا ہوں البتہ اگر کبھی قلات کا حاکم لشکر لے کر آپ کو گرفتار کرنے اور مار ڈالنے کو آئے تب میں اپنا سر کٹوادوں گا لیکن آپ کو گرفتار کرنے اور

مارنے نہیں دوں گا۔

بعدازاں میر بجّار، سیاہی اور اس کے بیٹوں نے آپس میں خفیہ سازباز کی۔ایک لشکر ساتھ لے کر منگچر سے مندو کے اونٹوں کے گلے کو ہانک لائے۔مندوانیوں کے لشکر نے راستے میں ان کو آن لیا اور لڑائی واقع ہوئی۔مندو کے لشکر کے چند نفر مارے گئے باقی لشکر شکست کھا کر پسپا ہوا۔(22)"

"سیاہی کے بیٹوں کی طرف سے چار گھوڑے مارے گئے۔سیاہی نے اپنے گھوڑوں کیلئے بہت افسوس کیا۔ یہاں تک کہ اپنے بیٹوں سے کہا کہ کاش تم میں سے بھی ایک میرے گھوڑوں کے ساتھ مارا جاتا(23)۔بجّار نے سیاہی سے کہا اگر حق تعالیٰ نے قلات مجھے دلایا تو انشاءاللہ تمہارے گھوڑوں کا عوض تم کو دیا جائے گا پھر ایسا ہوا کہ براہوئی قبائل (24) جو پہاڑوں میں منتشر ہو چکے تھے، میر

بجار اور رئیس سیاہی کے پاس جمع ہوئے۔
بلوچ قبائل ، مندو کے پاس جمع ہو چکے
تھے(25)

میر بجار اور سیاہی نے دھوم دھام سے لڑائی
کیلئے قلات کارخ کیا۔ ان کے درمیان شہر
سے باہر لڑائی ہوئی۔ مندو مارا گیا اور بلوچوں
کے لشکر کو شکست ہوئی۔ مندو کی قبر قلات کے
قلعہ کے اُس دروازے کے سامنے جو مستونگی
دروازہ کہلاتا ہے موجود ہے"(26)

"مندو کو موت کے گھاٹ اُتار کر میر بجار نے
قلات پر قبضہ کرلیا لیکن بعد میں بادیہ نشینی
اختیار کرلی۔ یہاں تک کہ بادیہ نشینی کی حالت
میں ہی فوت ہوا قلات بغیر حاکم کے رہ
گیا۔(27)

آخوند صاحب قلات پر مفروضہ میروانی حکمرانی، رند، میروانی لڑائی اور مندو رند اور میر بجار کو اپنے طور پر مروانے کی بے بنیاد کہانی کے بعد اب قلات پر ایک اور مفروضہ مغل حکمرانی کی کہانی سناتا ہے:

''میر بجار کی وفات کے بعد مغلوں نے آ کر قلات پر قبضہ کرلیا (28) ایک عرصے کے بعد مغلوں نے قلات کے دہواروں کے ساتھ قسم واقسام کیا کہ ایک دوسرے کو تلوار، بندوق، نیزہ، چھُرا، زہر، پتھر، روڑا، لکڑی اور جوتے سے نہیں ماریں گے (29) تاکہ ہمارے درمیان دوستی قائم رہے۔ چونکہ مغلوں کا شعار ہی ظلم کرنا تھا، دست تظلّم دراز کرنا شروع کیا۔ قلات کے دہواروں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہر قسم کے ہتھیار وزہر وغیرہ سے نہ لڑنے کی ہم نے قسم کھائی ہے اگر ان سے ہم مغلوں کو ماریں گے تو حق تعالیٰ کے ہاں ماخوذ ہوں گے۔ پس اتفاق اس پر ہوا اور انہوں نے باجرے کی موٹی اور سخت روٹیاں پکائی۔ ان روٹیوں کو کچھ دنوں تک سورج کی گرمی میں رکھ کر خشک کیا پھر ان میں سے ہر ایک نے ایک ایک روٹی بغل میں

چھپائی اور مغل حاکم کے سلام کو گئے۔ اور ایک ساتھ انہوں نے مغل پر حملہ کر دیا۔ ان میں سے ہر ایک نے بغل سے روٹی نکال کر مغل کو مارا بالآخر مارتے مارتے اُسے ہلاک کر دیا۔ چنانچہ اب ان دہواروں کو ڈوڈ کی کہتے ہیں۔"(30)

"مغل کو مار ڈالنے کے بعد دہوار معتبرین میر ابراہیم خان کے پاس گئے جو کہ قمبرانیوں اور احمد زئیوں کا جدّ ہے (31)۔ انہوں نے میر ابراہیم خان سے کہا کہ مغل دہواروں پر ظلم کیا کرتا تھا۔ ہم نے اُسے قتل کر دیا ہے۔ اب آپ کے پاس آئے ہیں کہ اپنے بیٹوں میں سے ایک کو ہم دہواروں کے ساتھ کر دیں کہ اُسے لیجا کر ہم حاکم قلات کا حاکم بنائیں (32) میر ابراہیم خان نے اپنے نواسے میر حسن خان کو دہواروں کے ساتھ بھیج دیا۔ دہواروں نے اُسے قلات لا کر حاکم بنا دیا"(33)

''میر حسن کے عہد سے میر احمد (اوّل)، جس
نے باروزئیوں سے کئی لڑائیاں لڑیں، کے
عہد تک مُلک کا یہ حصہ یعنی قلات، سوراب،
وڈھ اور منگچر احمدزئیوں کے زیر تصرف تھا
(34) جب میر احمد خان کی نوبت آئی تو اُس
نے مستنگ کے علاقے کو مغلوں سے چھین
لیا۔ آغا جعفر مغل لشکر جمع کر کے قلات آیا،
میر احمد اور آغا جعفر کے درمیان لڑائی ہوئی،
مغلوں کے لشکر کو شکست ہوئی۔ میر احمد خان
نے باغبانہ، خضدار، کرخ اور چکو کے علاقے
جدگال سے بزور شمشیر حاصل کیے (35)''

خوانین قلات کے آخری تاجدار خان میر احمد یار خان بلوچ نے بلوچ وبلوچستان تاریخ پر دو کتابیں تحریر وشائع کیں۔ ایک انگریزی میں ''انسائیڈ بلوچستان'' کے نام سے اور دوسری ''مختصر تاریخ قوم بلوچ وخوانین بلوچ'' کے نام سے۔ مذکورہ کتابوں میں تحقیق کم اور تقلید اور مفروضے زیادہ نظر آتے ہیں۔ زیر مطالعہ موضوع پر خان صاحب لکھتے ہیں:

''قلات کی بلوچی مرکزیت کی بنیاد ڈالنے کا
سہرا بلوچوں کے میروانی قبیلے کے سر بندھتا
ہے۔ جس کے سردار میر میرو خان نے قلات
اور اس کے مضافات میں آباد بلوچ قبائل
میں اثر ونفوذ کیا۔ یہ عہد طوران میں سیوائی
ہندوؤں کی حکمرانی کے زوال کا عہد تھا۔
(36) چونکہ میروانی سردار نے ہندوؤں کے
مقابلے میں مغلوں کا ڈٹ کر ساتھ دیا اس
لئے مغلوں کے غلبے کے دوران بلوچوں نے
دراوڑوں ، جاموٹوں اور جدگالوں کی جگہ
پاؤں جمالئے (37) اور رفتہ رفتہ طاقتور
ہوتے گئے۔ سردار میرو نے بلوچوں کو خانہ
بدوشانہ اور دربدری کی زندگی سے نکال کر
مستقل بودوباش اور متحدہ افرادی قوت کی
صورت دے کر ایک آزاد مملکت کے تصور کو
ان کے ذہنوں میں اُجاگر کردیا۔ وہ بیحد
مقبول اور محترم المقام تھا۔ بلوچ قبائل ان

سے بے پناہ محبت کرنے کے علاوہ زبردست
احترام بھی کرتے تھے۔ سردار میرو خان
میروانی کی وفات پر ان کا لائق فرزند میر عمر
خان سردار مقرر ہوا'' (۱)

آگے میر عمر کی سرداری اور اُس کے کردار کے بارے میں لکھتے ہیں کہ قلات پر مغل ارغون خاندان حکمران تھا اور قندھار ان کا پایہ تخت تھا۔ 1530 میں ارغون حکمران ذوالنون بیگ کو مرزا کامران نے شکست فاش دے کر اس کی حکومت کا تختہ الٹ دیا جس کے نتیجے میں قلات پر ارغون خاندان کا تسلط کمزور پڑ گیا۔ لوگ یوں بھی اس حکومت سے بیزار تھے ،مغلوں کی عیش کوشی اور جور و جبر کے معمولات نے بلوچستان میں جلد ہی ان کو بے وقعت بنا دیا تھا۔ جب قندھار کی ارغون حکومت کا خاتمہ ہوا تو بلوچوں کے سردار میر عمر خان نے موقع غنیمت جان کر قلات پر حملہ کر دیا۔ مغل مقابلہ نہ کر سکے اور دم دبا کر بھاگ گئے۔

....

''مختصر تاریخ ......قوم بلوچ وخوانین بلوچ'' صفحہ 34-33 خان صاحب نے جن صفات کا ذکر میرو اور میر عمر کیلئے کیا ہے محققین نے ان صفات کا حامل میر کمبر رئیس کو قرار دیا ہے۔ دیکھیں ہنری پونگر کی کتاب ''سفرنامہ سندھ و بلوچستان''، انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا، جلد سوئم، نہم ایڈیشن اور نیلسن انسائیکلو پیڈیا جلد سوئم۔ چونکہ خان صاحب کی تاریخی معلومات نہ ہونے کے برابر ہیں اور اُسے مغالطہ ہے کہ وہ میروانی نسل سے ہے، جس کا انہوں نے تذکرہ بھی کیا ہے اس لئے انہوں نے میرو اور میر عمر کے فرضی کردار کو بڑھا چڑھا کر پیش کیا ہے۔

میر عمر خان کے تخت قلات پر قبضہ کرنے کے بعد مضافات پر توجہ دی۔ پہلی بار بلوچی تاریخ میں ایک باقاعدہ بلوچی ریاست کا قیام عمل میں آیا(38)

چونکہ خان کی صاحب کی نوے فیصد تحریریں آخوند محمد صدیق اور میر گل خان نصیر کی تحریروں کا چربہ ہیں اور مذکورہ دونوں مصنفین کی کتابوں کو پچھلے صفحات میں مطالعہ کیا گیا ہے اور ان کی تاریخی حقیقی وضاحتیں بھی پیش کر دی گئی ہیں اس لئے خان صاحب کی تحریروں کا مزید تذکرہ کرنا غیر ضروری ہے۔

''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' معروف محقق جسٹس (ریٹائرڈ) میر خدا بخش بجارانی مری کی ایک محققانہ تصنیف ہے جس میں بلوچ اور بلوچستان کی تاریخ کی محققانہ جستجو کی گئی ہے۔ اصل کتاب انگریزی میں تحریر کی گئی ہے جس کا نام ''سرچ لائٹس آن بلوچیز اینڈ بلوچستان'' ہے جو 1980ء میں شائع ہوئی ہے۔ اس کا اُردو ترجمہ ''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' کے نام سے پروفیسر سعید احمد رفیق نے کیا ہے۔ کتاب میں ''ریاست قلات، ابتداء اور عروج وزوال'' کے عنوان سے ایک باب شامل ہے۔ جس میں وہ لکھتے ہیں:

> ''قلات کی پہاڑیوں اور جنوبی بلوچستان کی
> جانب بلوچوں کی آمد، اگر اس سے پہلے نہیں
> تو کم از کم دسویں صدی کے نصف آخر سے
> شروع ہوئی اور کافی عرصے تک جاری رہی

(39) جب تک میر جلال خان رند مع اپنے
چوالیس قبائل کے یہاں آیا اور اپنے پیچھے
بعض بلوچ قبیلوں کو کرمان، سیستان اور مکران
میں بحیثیت حکمران چھوڑ آیا (40)"

"تمام مؤرخین اس بات پر متفق ہیں کہ قلات
کا علاقہ رند قبیلہ کے قبضہ میں رہا۔ یہ معلومات
انہیں اُس دور کی جنگی نظموں اور مختلف
روایات سے حاصل ہوئی ہیں۔ یہ تو آپ کو
یاد ہی ہوگا کہ گہرام لاشاری نے نلی کی جنگ
کے بعد اپنی ایک نظم میں چاکر کو مخاطب کر کے
کہا تھا کہ:

"میں نے رندوں کو شکست دی اور میں نے
انہیں جنوبی علاقوں (کچھی اور سبی) سے نکال
باہر کیا اور انہوں نے قلات کے پہاڑوں کے
ٹھنڈے علاقے میں جا کر پناہ لی۔" (41)

آگے تحریر کرتے ہیں کہ ''عام طور پر یہ یقین کیا جاتا ہے کہ تقریباً 1518ء میں سبی سے جانے کے بعد میر چاکر نے اپنے رشتہ دار مندو کو کچھ رندوں کے ساتھ بطور اپنے نایب کے قلات میں چھوڑ دیا تھا۔''(۱)

میر چاکر کے پنجاب روانہ ہونے کے بعد جلد ہی قلات میں بلوچوں کے درمیان آپس میں ان بن اور نا اتفاقی ہوگئی ہوگی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا ہوگا کہ میر چاکر کے نائب مندو نے اپنی حکومت قائم رکھنے کیلئے دوسرے بلوچ سرداروں سے جنگ کی ہوگی (42) ہم تاریخی طور پر یہ نہیں بتا سکتے کہ مندو نے میر چاکرؒ کے نائب کی حیثیت سے کتنے عرصے تک قلات پر حکومت کی۔ بہرحال تاریخ میں مندو کا ذکر آتا ہے جو شیر شاہ سوری کے عہد حکومت میں ملتان کے علاقہ کے ایک حصہ پر قابض تھا۔ اس وقت میر چاکر ست گڑھ پنجاب کے ضلع ساہیوال میں پہنچ چکا تھا۔ غالباً مندو تقریباً پندرہ سال تک قلات پر حکومت کرنے کے بعد حالات سے مجبور ہو کر قلات کو چھوڑ کر پنجاب آ گیا تھا۔ اور پھر 1535ء کے لگ بھگ میر چاکر سے آملا تھا۔

ا۔ پچھلے صفحات میں حاشیہ نمبر 15 کے مندرجات ملاحظہ کریں۔ جہاں دپتر ڈومبکی کا حوالہ نقل کیا گیا ہے۔ ب۔ دپتر ڈومبکی دستاویزات سے اس یقین کی تصدیق ہوتی ہے۔ نیز اسی مصنف نے اپنی دوسری کتاب ''قدیم بلوچی شاعری'' میں سردار چاکر خان کا سبّی سے ہندوستان جانے کا سال 1545ء کے قریب'' تحریر کیا ہے۔

''قلات کے احمد زئی حکمران اٹھارویں صدی میں برسرِاقتدار آئے (43)۔
سمندر خان اور اس کے جانشین احمد خان دوئم صدی کے اوائل میں صفحہ تاریخ پر ظاہر ہوئے یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اورنگزیب کا پوتا معز الدین ملتان کا گورنر تھا اور اس نے کلہوڑوں کو سندھ کے ایک حصہ کا منصب دار مقرر کر رکھا تھا۔ سمندر خان ایک قابل شخص تھا اس کے گنداوہ اور سیبی کے علاقوں پر قبضہ کے سلسلے میں یار محمد کلہوڑا سے ان بن تھی۔ گل خان نصیر کا یہ کہنا کہ ''اورنگزیب کے حکم پر محراب خان کو قتل کرنے کے خون بہا کے طور پر کراچی کا ایک حصہ کلہوڑوں سے لے لیا گیا تھا'' تاریخی طور پر صحیح نہیں معلوم ہوتا۔ علاوہ ازیں اس زمانے میں کراچی کا علاقہ ٹھٹھہ حکومت کے ماتحت تھا اور کلہوڑوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں تھا۔

1642ء میں میاں نصیر محمد کلہوڑا کے مرنے کے بعد اس کے لڑکے دین محمد نے کلہوڑا علاقوں میں لوٹ مار کی۔ گرفتار ہو کر سزائے موت سنائی گئی۔ اس کا بھائی یار محمد نے قلات میں سمندر خان کے پاس پناہ لی اور تقریباً دو سال تک وہاں قیام کیا۔ تحفتہ الکرام میں مرقوم ہے کہ جب یار محمد پناہ لینے کی خاطر قلات کی طرف بڑھا تو محراب خان نے یہ خیال کیا کہ وہ فوج لے کر اس کے علاقہ پر حملہ کرنے کی غرض سے آرہا ہے اس لئے وہ اس کے مقابلے پر آیا۔ لیکن محراب خان مارا گیا۔ مگر یار محمد کو اپنے دو لڑکے نور محمد اور داؤد محمد اور کچھ ساتھیوں کو بطور یرغمال دینا پڑا۔ بہر حال بعد میں اُس نے انہیں قلات کے حکمران کے پاس ملتان کے گورنر کی سفارش پہنچا کر آزاد کر لیا۔''

''ایک مرتبہ اس نے ملتان کے گورنر کو یہ تک مشورہ دیا تھا کہ قندھار اور قلات پر یہ یک وقت حملہ کیا جائے اور دونوں کو ایک ہی دفعہ کے حملے میں فتح کیا جائے لیکن یہ اسکیم عملی شکل اختیار نہ کر سکی کیونکہ اسی زمانے میں بہادر شاہ وفات پا گیا اور فرخ سیر دہلی میں اُس کا جانشین ہوا۔''

سمندر خان کے مرنے کے بعد محراب خان کا سب سے بڑا لڑکا احمد خان دوئم خان بنا لیکن اس کی پرورش لاڑ و پیار سے ہوئی تھی اور وہ جسمانی طور پر کمزور بھی تھا۔ وہ اپنے چھوٹے بھائی عبداللہ خان سے خوفزدہ رہتا تھا جو ایک قابل شخص تھا۔ اس نے اُسے شالکوٹ (کوئٹہ) کے قلعہ میں اپنا نائب مقرر کر رکھا تھا۔ عبداللہ خان اولوالعزم، حوصلہ مند، بلند ہمت، بہادر اور ہوشیار شخص تھا۔ اسے قلات کے سلسلے میں جنوب کی طرف سے کلہوڑا خاندان سے اور شمال کی طرف سے ایرانیوں اور افغانوں سے خطرہ محسوس ہوتا تھا۔ اُس نے جھلاوان اور سراوان کے علاقوں کے قبائلی سرداروں سے تعلقات بڑھائے اور وہ اس کے وفادار بن گئے۔ اس کے بعد اس نے مناسب موقعہ پر اپنے بھائی کے خلاف بغاوت کر دی۔ دونوں کے درمیان مستونگ کے مقام پر مختصر سی لڑائی ہوئی۔ عبداللہ خان کو فتح حاصل ہوئی اور اس نے مستونگ پر قبضہ کر لیا۔ احمد خان قلات فرار ہو گیا۔ عبداللہ خان، قلات کا خان بننے کا متمنی تھا اس لئے اس نے اپنے بھائی سے صلح کر لی۔ ایک دن جب احمد خان بہت زیادہ بیمار تھا اور بستر پر دراز تھا تو اس نے احمد خان کو

نہایت بے رحمی سے قتل کردیا۔اور خود خان ہونے کا اعلان کیا۔یہ وہی زمانہ تھا کہ دین محمد کلہوڑا ملتان کے گورنر کی جانب سے کچھی اور سیبی کا زمیندار تھا۔'' (44)

''قلات کی سلطنت جہلاوان کی پہاڑیوں،کوئٹہ اور مستونگ کی وادی تک محدود تھی۔یہ نہ تو خاران،مکران،کچھی اور مری بگٹی علاقہ تک پھیلی ہوئی تھی اور نہ ہی سبی کے میدان تک۔اگرچہ یہ تمام وہ علاقے تھے جو چاکر کے زمانے سے بلوچوں کے پاس تھے۔کچھی ایک بہت زرخیز علاقہ تھا۔اس لئے قلات کے خان ہمیشہ اس پر قبضہ کرنے کی کوشش کرتے رہتے تھے لیکن یا تو سیبی کے پنّی افغان زمیندار (جواب باروزئی کہلاتے ہیں) ان کی مخالفت کرتے تھے یا بالائی سندھ کے کلہوڑا،جو گورنر ملتان کے مقرر کردہ تھے۔جب شہزادہ معزالدین نے بختیار خان پنّی کو شکست دے کر قتل کیا تو اس علاقہ میں طاقت کے مدعی صرف کلہوڑا رہ گئے تھے۔عبداللہ خان جو اپنے کو کوہستان کا شاہین کہلوانے کا متمنی تھا،خود کو گنداوہ کا قانونی حقدار سمجھتا تھا کیونکہ اوّل تو یہ ابتدائی بلوچوں کا پایہ تخت تھا اور بلوچ اب یہاں تک آباد تھے اور دوئم یہ کہ جب کلہوڑہ برادران قید تھے تو انہوں نے اسے سمندر خان کو دینے کا وعدہ کیا تھا اس لئے اس سلسلے میں جدوجہد شروع کی لیکن کلہوڑہ فوج نے جس میں سپاہی اور افسر اکثر بلوچ تھے اس کا مقابلہ کیا۔یہ فوج درہ بولان سے گذری اور جنگ کے بعد عبداللہ خان سے کرتہ کا قلعہ فتح کیا۔عبداللہ خان بہت ہشیار تھا۔اُس نے امن کی بحالی کیلئے اپنی دو لڑکیوں کی شادی دین محمد کلہوڑا کے رشتہ داروں سے کردی۔اس کے بعد اُس نے جلد ہی ایک بڑے لشکر کے ساتھ کچھی کے

میدانوں پر حملہ کیا۔ کلہوڑہ کی فوج نے اس کا مقابلہ کیا اور زبردست لڑائی کے بعد جندر یٹھر کے مقام پر اسے شکست دیدی۔ عبداللہ خان اس جنگ میں قتل ہوا۔ وہ 1731ء میں ایک سپاہی کی موت مرا۔

عبداللہ خان ایک بہادر اور باہمت شہسوار تھا اور ہمیشہ لڑنے بھڑنے کیلئے تیار رہتا تھا۔ اس نے یکے بعد دیگرے بہت سے قبیلوں پر حملے کئے اور انہیں شکست دی۔ یہاں تک کہ اس نے قندھار کو فتح کرنے کا منصوبہ بنایا۔ اس نے اس پر کامیاب حملہ کیا اور اس تاریخی شہر کے اردگرد کے علاقے میں کافی لوٹ مار کی۔ مختلف جنگوں کی وجہ سے وہ ایک تجربہ کار جنرل بن گیا تھا۔ اُس نے بلوچوں کو اپنے جھنڈے تلے جمع کیا۔ اس کے گردونواح کے حکمران اسے ایک خوفناک دشمن خیال کرتے تھے۔ وہ پہلا خان قلات تھا جس نے مکران اور ڈیرہ غازی خان تک حملے کئے تھے۔ مئوخر الذکر پر حملہ اس نے ساراوان اور جہلاوان کی مشترکہ فوج کے ساتھ کیا تھا۔ یہ حملہ اُس نے غازی خان دودائی کے لڑکے نام نہاد حکمران شاہ محمد کی درخواست پر کیا تھا۔ جسے اس کے بھائی صاحب خان نے ملتان کے مغل گورنر کی مدد سے اس کی مملکت سے نکال باہر کیا تھا۔ اس نے صاحب خان کو شکست دی بہت سے دیہاتوں کو بُری طرح لوٹا۔ انہیں نذر آتش کردیا۔ اور بہت سے لوگوں کو قیدی بنالیا۔ کہا جاتا ہے کہ اس کے سردار اسے بمشکل تمام قلات واپس جانے پر تیار کرسکے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ زرخیز علاقہ اس کے دل کو بھا گیا ہو اور وہ مستقل طور پر یہاں قیام کرنا چاہتا ہو۔ بہرحال آخرکار وہ قلات واپس آ ہی گیا۔ جیسا کہ پہلے کہا جاچکا

ہے کہ کلہوڑا کے حکمران کو کچھ عرصہ تک بحالت مجبوری قلات کو چالیس ہزار روپے سالانہ بطور تاوان ادا کرنا پڑتا تھا۔ جندری ھار جو خانپور بھی کہلاتا ہے، کی جنگ میں کلہوڑا فوج میں چالیس ہزار سپاہی تھے اور مشہور جرنیل مثلاً شاہ بہارا، میر چاکر اور میر بہرام ٹالپر، مراد کلیری، دادو، خیرا، شاہ علی اور جام نندہ ٹالپر اس فوج کے سردار تھے۔ شاہ بہارا کے سوا یہ تمام کمانڈر بلوچ تھے۔ کہا جاتا ہے کہ اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کی وجہ سے مغل شاہنشاہ نے اسے ''ثابت جنگ'' کا خطاب عطا کیا اور ''پنج ہزاری'' (پانچ ہزار سپاہیوں کا سردار) عہدہ بھی اسے عنایت کیا۔ مغل دربار کی طرف سے یہ سب سے بڑا شاہی منصب تھا جو کسی بھی کلہوڑا حاکم کو حاصل ہوا تھا۔

اگرچہ ریاست قلات کم آبادی کے پہاڑی علاقوں پر مشتمل تھا لیکن طاقتور ہمسایہ علاقوں مثلاً ایران، قندھار اور ہندوستان کی آنکھوں میں یہ ریاست کانٹے کی طرح کھٹکتی رہتی تھی۔ میر عبداللہ خان کو داد دینی پڑتی ہے کہ اس نے اتنے طاقتور دشمنوں میں گھرے ہونے کے باوجود اپنی آزادی کو برقرار رکھا۔ اس کامیابی کی وجہ اس کی سیاسی پالیسی نہ تھی بلکہ اس کی اصل وجہ اس کی خون آشام تلوار تھی۔ بنا بریں کہا جاسکتا ہے کہ وہ ''کوہستان کا شاہین'' کے لقب کا حقیقی طور پر مستحق تھا، جس کا وہ ہمیشہ متمنی رہا۔'' (1)

ا۔ اٹھارواں باب ''ریاست قلات۔ ابتدا اور عروج و زوال'' صفحات 358-362

حواشی:

1۔ کتاب ''سفرنامہ سندھ وبلوچستان'' حصہ دوئم صفحہ 77، اُردو ترجمہ پروفیسر ایم۔ انور رومان۔ مطبوعہ نساء ٹریڈرز۔ ے جناح کلاتھ مارکیٹ کوئٹہ۔ یادرہے کہ محققین نے عہد وسطیٰ میں بلوچستان میں کہیں بھی کسی ہندو حاکمیت کے وجود سے انکار کردیا ہے۔ ایک بلوچ محقق ملک محمد سعید دہوار نے اپنی تصنیف ''تاریخ بلوچستان'' میں سیوا حکمرانی پر شک کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ:

> ''معلوم نہیں کہ وہ کونسا سیاسی اور سماجی پس منظر تھا کہ جس کی بنا پر ایک ہندو خاندان کو عہد وسطیٰ میں قلات میں اقتدار کی کرسی پر بیٹھنے کا موقعہ ملا۔ اکثر مورخین نے اس سلسلہ میں زیادہ تر روایات کا سہارا لیا ہے۔''

کتاب ''نوٹس آن افغانستان'' میں مسٹر ریورٹی نے صفحات 575-571 میں سیوی کی تاریخ پر بحث کرتے ہوئے سیوا حکمرانی کے بارے میں لکھا کہ عربوں کی فتح کے بعد کوئی ایسی تاریخ یا شہادت کا معمولی سا نشان بھی موجود نہیں جس کی رُو سے یہ ظاہر ہو سکے کہ کسی بھی ہندو ممالک کا اس علاقے کے کسی حصّے میں کوئی وجود تھا۔ اسی طرح ''امپیریل گزیٹر آف انڈیا'' بھی ساتویں صدی عیسوی کے بعد کسی سیوا یا سیوائی حکومت کی روایت کو تسلیم نہیں کرتا۔ کتاب ''تاجپوشی قلات 1932ء'' کے مصنف مولوی دین محمد

کی رائے ہے کہ سیوا خاندان کے ہندو راجے مسلمانوں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے حاکم رہے ہوں گے وہ پھر لکھتے ہیں کہ

''لازم نہیں آتا کہ وہ ہندو مذہب کا

بھی پیروکار تھا۔''

جہاں تک نام ''قلات سیوا'' کا تعلق ہے لازم نہیں آتا کہ اس کی نسبت کسی شخصیت یا سلسلہ حکمرانی سے ہو۔ قلات اور مضافات میں اس نام کی جستجو اور تحقیق میں ایک بھی نشان ایسا دیکھنے یا سننے میں نہیں آیا جس سے کوئی سیوا خاندان کا سیوا قبیلہ کا اظہار ہوتا۔ ہاں البتہ ایک قدیم مندر کے بارے میں معلومات حاصل ہوئی ہیں جو کہ قلعہ (قلات) یا میری کی تعمیرات کے نیچے کہیں موجود تھا بلکہ اب بھی موجود ہے۔ میری کی تمام منزلیں اس مندر کی چھت سے ہٹ کر بنائی گئی تھیں۔ کہتے ہیں کہ خوانین نے زیر زمین مندر کو ہر دور میں احتراماً محفوظ رکھنے کی کوشش کی ہے اس لئے انہوں نے مندر کی چھت پر میری کی کوئی دیوار یا کمرہ کھڑا نہیں کیا۔ خانِ بلوچ میر محمود خان کے زمانہ اقتدار (1893ء----1931ء) تک میری کی مشرقی جانب سے مندر کیلئے ایک سرنگ جاتی تھی جس کے ذریعے قلات کے ہندو کبھی کبھی مندر میں جایا کرتے تھے۔ مذکورہ مندر ''سیوا مندر'' کہلاتا رہا ہے۔ قلات کی روایتی تاریخ سے واقف ہندوؤں کا کہنا ہے کہ ''سیوا قلات'' کا نام اِسی ''سیوا مندر'' کی نسبت سے مشہور رہا ہے جو قلعہ کے نیچے صدیوں سے محفوظ ہے۔ اُن کے مطابق ''سیوا'' دراصل ہندوؤں کا ایک قدیم فرقہ رہا

ہے جو کہ سیوا بتوں کے پجاریوں نے پوری دنیا میں اس کی تبلیغ کر کے اس کے مندر بنوائے تھے۔ ان کے مطابق چونکہ یہ فرقہ کافی عرصہ پہلے نابود ہو چکا تھا اس لئے ان کا مندر بھی عدم توجہی کا شکار ہو کر گوشہ گمنامی میں چلا گیا اور دوسرے فرقوں کے ہندو سیوا مندر نہیں جاتے تھے۔

تاریخی اسناد کی روشنی میں واضح ہوتا ہے کہ ''سیوا'' ہندومت کے قدیم عقیدوں میں سے ایک تھا۔ سیوا اور وشنو عقیدوں کی تبلیغ ہندوؤں کے پرانوں میں وسیع پیمانے پر کی گئی ہے، خصوصاً گپتا عہد میں ان دونوں عقیدوں کے لاکھوں پجاری پیدا ہوئے جنہوں نے وشنو اور سیوا کے بُت بنا رکھے تھے اور انہیں پوجتے تھے پھر ان بتوں اور ان کے مندروں کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنے اور مشہور ہوئے۔ 742ھ تک نئے ہندومت کا پرچار کیا گیا جس میں تین دیوتاؤں کی پوجا کرنے پر سب سے زیادہ زور دیا گیا تھا۔ ان میں ایک ''سیوا'' دوسرا ''وشنو'' اور تیسرا کرشنا تھا۔ پہلے دو دیوتا ہندوؤں میں بہت پھیلے۔ نامی گرامی پرچاریوں میں شنکر اچاریا کا نام قابل ذکر ہے۔ جس نے انتھک تبلیغ کا کام کیا جس کے نتیجے میں سینکڑوں کے حساب سے ''سیوا'' اور ''وشنو'' کے مندر بنائے گئے انہی سیوا مندروں میں سے ایک قلات کا سیوا مندر رہا ہے جو تاریخ میں کئی حملہ آوروں کا نشانہ بنا رہا ہے جو آخر کار تباہ ہو گیا۔ ''سیوا'' کے پجاریوں کو ''سیوائی'' اور ''شیوائی'' کہا جاتا رہا ہے۔ اشوکا کا ایک بیٹا جلوکا، سیوا کے مشہور ترین پجاریوں سے رہا ہے جس نے سیوا دیوتا کے نام کے کئی مندر بنوائے تھے۔ یہاں ہم فرض کرنے میں حق

بجانب ہوں گے کہ مذکورہ سیوا مندر بھی اُسی زمانے کا تعمیر کردہ ہوگا جو کہ بعد میں فرقہ کے زوال پذیر ہونیکی وجہ سے گمنامی کی نذر ہو گیا لیکن اپنا قدیمی نام برقرار رکھ سکا۔ اس طرح درج بالا تحقیقی جائزے سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ قلات پر کسی سیوا راجہ یا سیوا خاندان نے کبھی بھی حکمرانی نہیں کی ہے اور قلات کا نام اسی ''سیوا مندر'' کی وجہ سے ''سیوا قلات'' مشہور ہو گیا ہے۔

2۔ پوٹنگر کا دیا ہوا شجرہ نسب غلط ہے اور اس کے دیئے ہوئے نام غلط ہیں۔ ملاحظہ کیجئے:

''کمبر والدِ سمبر والدِ محمد خان والدِ عبداللہ خان
والدِ حاجی محمد خان والدِ نصیر خان والدِ محمد خان''
(باب ششم)

حقیقی شجرہ نسب یوں ہے:

''کمبر ولد میر سمندر تھا۔ اور میر محراب
خان کا بھائی تھا۔ میر محراب خان کا بیٹا میر
احمد خان تھا، عبداللہ خان میر احمد خان کا
بھائی اور میر محمد خان کا بیٹا تھا، محمد خان
اصل میں میر محبت خان ہے جو میر نصیر
خان کا بھائی اور عبداللہ خان کا بیٹا ہے۔''

3۔ہنری پوٹنگر کا یہ کہنا بھی ایک مفروضہ ہے کہ کمبر کے آباء واجداد حبشی تھے۔ چونکہ اُس نے کمبر کے بارے میں تحقیقی کام نہیں کیا اس لئے یہ فرض کر بیٹھا۔ اگر وہ خود خوانین سے معلومات لیتے یا کمبر کے علاقے پنجگور تک اپنی جستجو کو وسعت دیتے تو وہ اس مشہور فاتح جرنیل کے بارے میں بہت کچھ معلومات حاصل کر سکتے تھے جو انہوں نے نہیں کیا۔ وہ قدیم بلوچ قبیلہ رئیس جس کا سردار طائفہ ''ہوت'' ہوتا تھا، کے ''بورسوار'' طائفہ سے تھے۔ پنجگور میں اُن کا روایتی شجرہ نسب اس طرح دستیاب ہوا ہے:

''میر کمبر رئیس ولد شاہ ملوک عرف شاہو رئیس
ولد میر حسن رئیس ولد میر گہرام رئیس ولد میر
ابراہیم رئیس ولد سردار کمبر رئیس ولد سردار
زہرو رئیس ولد میر سعد رئیس ولد سردار میر عمر
رئیس ولد میر بور رئیس ولد میر حمزہ رئیس''

(کمبران صفحات 20-19)

(ایرانی زیرانتظام بلوچستان کے تحقیقی
دورے میں یہ روایت سننے کو ملی کہ میر حمزہ
رئیس کے باپ کا نام میر زبادر رئیس تھا۔)

آخوند مُلّا محمد صدیق نے اپنی تصنیف ''اخبار الابرار'' میں میر کمبر رئیس کا شجرہ درج ذیل نقل کیا ہے۔ دونوں شجروں میں معمولی سا فرق موجود ہے:

''میر کمبر ولد میر ملوک ولد میر سنجر ولد میر حسن
ولد گہرام ولد میر ابراہیم ولد میر زرّک ولد میر
زھرا ولد میر کمبر ولد سعد ولد عمر ولد حمزہ۔''

میر کمبر کے تفصیلی حالات کے بارے میں ہماری تصنیف ''کمبران'' ملاحظہ کریں۔

4۔ میر کمبر رئیس ایک مذہبی گھرانے کی شخصیت اور دیندار حکمران رہا ہے۔ وہ ایک مذہبی جنونی نہیں تھا کہ زبردستی سے اقلیتوں کا مذہب تبدیل کرے۔ کمبر کے بارے میں کہیں بھی مذکورہ روایت سننے میں نہیں آیا ہے۔ یہ بیان پوٹنگر کی اپنی ذہنی اختراع ہے۔ جس کی کچھ بھی حقیقت نہیں ہے۔

5۔ ''سنگین'' ہندوانہ نام ہی نہیں ہے بلکہ ایک بلوچی نام ہے جو مرد اور عورت دونوں پر رکھا جاتا ہے۔ رحیم داد خان مولائی شیدائی اپنی سندھی تصنیف ''جنت السندھ'' میں اس نام کو ''سنجن'' لکھتے ہیں اور اُس کے باپ کا نام ''سیھرس'' بتاتے ہیں۔ تبدیلی مذہب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں سیھرس کے بیٹے سنجن نے خوشی سے اسلام قبول کیا جسے میر کمبر نے جھالاوان کی ریاست مرحمت کی۔ (صفحہ 346)۔

6۔ ہنری پوٹنگر نے میر کمبر اوّل، جو بانی حکمرانی قلات اور فاتح زہری و قلات تھا، میر سمندر خان کے بیٹے میر کمبر کو سمجھا ہے۔ جو قلات اور خوانین قلات کی تاریخ سے اُس کی عدم واقفیت ہے۔ حکمرانی قلات کا سلسلہ میر کمبر اوّل ولد میر ملوک سے شروع ہوتا ہے جو

قبیلہ رئیس اور پنجگور و سرحد کے بلوچ خطوں کا حاکم تھا۔ اور پنجگور کے موضع گچک کا رہنے
والا تھا۔ جہاں پر اُس کے قلعہ کا خرابہ ''کمبر قلات'' کے نام سے موجود ہے۔

A-6۔ یہ نام محمد خان نہیں بلکہ میر محبت خان ہے جو خوانین کے دوسرے دور کا پانچواں خان بلوچ تھا جس کا عرصہ حکمرانی 1737ء تا 1749ء تھا (قوم بلوچ و خوانین بلوچ'' از خان میر احمد یار خان بلوچ، صفحہ 40)

یہ کمبر کوئی گمنام شخصیت نہیں رہی ہے۔ سولہویں صدی عیسوی کی بلوچی شاعری اس کے ذکر سے خالی نہیں ہے۔ بلکہ وہ واحد ہیرو ہے جسے بلوچی شاعری میں میر چاکر رند کے بعد سب سے زیادہ خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ میر چاکر خان رند بلوچ قبائلی تاریخ میں ایک متنازعہ شخصیت کے مالک تھے جسے بُرے القاب سے بھی یاد کیا گیا ہے خصوصاً لاشاری قبائل اوران کے اتحادیوں نے اُن کے منفی کردار کو اپنی شاعری میں خوب اُچھالا ہے۔ صرف رندوں کی شاعری میں انہیں توصیفی کلمات سے یاد کیا گیا ہے۔ چاکر خان نے بلوچ اتحاد کو بہت نقصان پہنچایا اور پوری قوم کو انتشار میں ڈال کر خانہ جنگی میں جھونک دیا اور ایک عظیم الشان بلوچی طاقت کو تباہ کر کے وطن سے بے وطن ہوگیا۔ اور لاکھوں بلوچوں کو اپنے قومی شناخت سے محروم کر دیا۔ اس نے ایک عظیم بلوچی ریاست تشکیل دینے کے بہترین موقعہ کو ضائع کر دیا جبکہ میر کمبر بہ یک وقت بلوچستان کے دو بڑے خطوں کا مالک تھا اور قلات اور ملحقہ کوہستان تک بلوچی ریاست کو وسعت دے گیا جو سندھ کے طوائف الملوک کے ہاتھوں میں تھا۔ وہ جدھر کدھر لڑتا تھا صرف بلوچی کاز

کیلئے لڑتا تھا۔ اور لڑتے لڑتے اسی دھرتی پر قربان ہو گیا تھا۔ وہ رند سردار میر چاکر خان کا ہم عصر تھا۔ جب اُس نے قلات سیوا پر قبضہ کر لیا تو قلات نیچارا پر میر مندو رند حکمران تھا۔ جس کی حکمرانی کمزور اور عوام اُس سے کافی شاکی تھے۔ میر کمبر نے مذاکرات کر کے اُسے حکمرانی سے دست بردار کرایا جو پھر سردار چاکر خان کے بلاوے پر پنجاب چلا گیا۔

7۔ یہ ایک شیطانی خیالات کا حامل متعصب یوروپی کا مذموم پروپیگنڈہ ہے۔ اُس نے یقیناً سندھی تاریخ میں مذکور ایک ہندو حکمران راجہ دلورائے سے منسوب یہی کہانی پڑھی یا سُنی ہوگی جس کا پایہ تخت آخر کار عذاب الٰہی کی زد میں زیر زمین دھنس گیا تھا۔ یہ کہانی سندھ اور پنجاب میں عوام الناس میں مشہور ہے۔ اُس کے علاوہ کسی دوسرے حکمران سے اس طرح کی کوئی کہانی یا الزام منسوب نہیں ہے۔ بلوچ حکمران تو ایسی بے غیرتی کا تصور بھی نہیں کر سکتے تھے۔ وہ جابر اور ظالم (چند معاملات میں) ضرور رہے ہیں لیکن غیرتوں اور عصمتوں کے پاسبان رہے ہیں اور خصوصی طور پر اقلیتوں کی جان و مال اور عزت کے مسلّم نگہبان رہے ہیں۔

جہاں تک میر کمبر کے کردار کا تعلق ہے وہ ایک دیندار اور خُدا ترس حکمران کے طور پر مشہور رہے ہیں اور پوری تاریخ میں آج تک کسی نے ان کے کردار پر انگلی نہیں اٹھائی ہے۔ یہ سُر خا اپنی قومی شکست اور پسپائی کا بدلہ ایسے بھونڈے پروپیگنڈہ سے لینا چاہتے ہیں جسے ہم اس کا قلمی کمینہ پن کہیں گے۔

8۔ میر نصیر خان، میر محبت خان کا سوتیلا بھائی تھا۔ محبت خان نے خانی قلات پر براجمان

ہوتے ہی میر نصیر خان کو نادر شاہ کے پاس یرغمال کر دیا۔ جب نادر شاہ کو ہندوستان سے واپسی پر اُس کے اپنے سالے نے قتل کر دیا تو نادر شاہ کے جرنیل احمد شاہ درانی نے افغانستان میں خودمختار بادشاہت کا اعلان کر دیا۔ اس افراتفری کے دوران میر نصیر خان فرار ہو کر براہ کیچ مکران قلات پہنچا۔ افغانستان کی نئی حکومت کے وزیر اعظم شاہ ولی خان بامی زئی میر نصیر خان کا بہت قدر دان تھا۔ اُس نے اسے افغانستان آنے کی دعوت دی۔ میر نصیر خان چند بااثر قبائل کے سرداروں کے ہمراہ افغانستان چلے گئے۔ وہاں سرداروں نے افغان بادشاہ اور وزیر اعظم کو میر نصیر خان کی خانی قلات کے منصب پر آنے کی حمایت کرنے کی استدعا کی۔ چنانچہ احمد شاہ درانی نے میر نصیر خان کو "خان بلوچ" تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ جس کے بعد سرداروں نے میر محبت خان کو معزول کر دیا۔ ملاحظہ کیجیے "مختصر تاریخ قومِ بلوچ اور خوانین بلوچ" از خان میر احمد یار خان بلوچ، صفحات ۱۴۱۔۱۴۰۔

آخوند محمد صدیق اپنی فارسی تاریخچہ قلات "اخبار الابرار" میں لکھتے ہیں کہ وزیر شاہ ولی خان کو میر نصیر خان نے کہا تھا کہ میر محبت خان کو میرے راستے سے ہٹا دیں۔ وزیر نے ایسا کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ احمد شاہ ابدالی نے میر محمد خان کو خانی کے منصب پر رہنے دینے کیلئے اُس کی بیٹی گوہر بی بی کا رشتہ طلب کیا تھا مگر خان نے بیٹی کی نسبت دینے سے انکار کیا تھا۔ جس سے افغان بادشاہ غضبناک ہو کر مستونگ پر حملہ آور ہوا اور کئی لوگوں کو قتل کروایا۔ اس پر محبت خان نے انتقام لینے کا وعدہ کیا تھا۔ جس کا سن کر بادشاہ نے اُسے اور

چند سرداروں کو قندھار طلب کیا اور محبت خان کو جیل میں ڈال دیا۔ اسی جیل میں شاہ ولی خان وزیر نے میر نصیر خان سے کیے گئے وعدے پر عمل کرتے ہوئے خانِ بلوچ کو قتل کر دیا۔ اور میر محبت خان کی نعش کو چند معتبرین کے ہمراہ اور بہت ساری رقم دے کر قلات بھجوادیا جو منزل بہ منزل اُس کی نعش پر زرفشانی کرتے ہوئے اُسے قلات لے آئے اور نعش مبارک کو یہاں دفن کر کے واپس چلے گئے (''اخبار الابرار'' کا اُردو ترجمہ بنام ''تاریخ خوانین قلات'' از گل خان نصیر صفحات 58-62)

9۔ اس ''مصالحت کی پیشکش'' کے پس پردہ میر نصیر خان کا افغان بادشاہ کے مصلّے پر سجدہ کے مقام پر گولہ داغنا تھا۔ جس کا مقصد بادشاہ پر ثابت کرنا تھا کہ میرا نشانہ خطا نہیں جاتا لیکن میں نے تمہیں مارنے کا ارادہ نہیں کیا تھا۔ جس سے احمد شاہ میر نصیر خان کا انتہائی ممنون ہوا تھا۔ اس بارے میں ''مہمات وفتوحات احمد شاہ ابدالی'' کے مصنف ڈاکٹر گنڈا سنگھ رقم طراز ہیں:

''(قلات کا) محاصرہ چالیس دن تک چلا۔ اس کے بعد ایک طرف تو احمد شاہ نے قلات پر قبضہ کرنے کی اُمید چھوڑ دی اور دوسری جانب نصیر خان ایسی آزادی سے تنگ آ گیا جس نے اُسے قلات میں مقید کر دیا تھا''

(اُردو ترجمہ، کتاب از سید رئیس احمد جعفری ندوی صفحہ 266)

پھر ہنری پوٹنگر کے سفرنامے کے حوالے سے تحریر کرتے ہیں:

"ایک روز نصیر خان نے احمد شاہ کو اپنے خیمے
کے باہر قالین پر نماز پڑھتے دیکھا۔ اُس نے
فوراً نشانہ باندھ کر توپ کا گولہ عین اُس جگہ
پر مارا جہاں بادشاہ نے چند منٹ پہلے سجدہ کیا
تھا.......... کہا جاتا ہے کہ اس واقع کے فوراً
بعد احمد شاہ نے صلح کی گفتگو شروع کر دی اور
بعد میں نصیر خان کو اس کی نشانہ بازی کی داد
دی۔" (کتاب ایضاً صفحہ 266)

10۔ کراچی بارے اپنی تصنیف "مختصر تاریخ قوم بلوچ و خوانین بلوچ" کے صفحہ 38 پر مصنف خانِ میر احمد یار خان بلوچ لکھتے ہیں:

"(خان سمندر خان بلوچ نے) دہلی کے مغل
شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے باغی
کلہوڑوں داد محمد اور نور محمد کلہوڑہ کو پابہ زنجیر
گرفتار کر کے شہنشاہ کے دربار میں پیش کیا
جس پر شہنشاہ ہند نے میر سمندر خان کو "امیر
الامراء" کا خطاب دیا، لاکھوں روپے نذرانہ

پیش کیا۔ کراچی کی بندرگاہ محراب خان شہید
کے خون بہا کے طور پر سندھ سے الگ کر کے
خانِ بلوچ کے حوالے کی۔"

یادر ہے کہ 1697ء میں میر محراب خان احمد زئی کلہوڑوں سے ایک لڑائی میں شہید ہوگیا تھا۔ وہ براہو جد گال جنگ کے ایک اتحادی ہیرو، خوانین قلات کے دوسرے دور کے پہلے خان بلوچ اور قبیلہ احمد زئی کے جدّ امجد میر احمد ایلتازئی کے بیٹے تھے۔ ان کا پیدائشی نام جورَک خان تھا جسے بعد میں بدل کر محراب خان رکھ دیا گیا تھا۔

11۔ آخوند محمد صدیق کے آباواجداد 1100ء میں ایران کے شیراز سے ہجرت کر کے پنجگور کے موضع تسپ میں آباد ہو گئے تھے۔ وہ معمولی سی فارسی اور عربی پڑھے لکھے ہوتے تھے۔ یہاں پر وہ پیش امامی اور تعویز گنڈوں کے ذریعہ روزی کماتے تھے۔ پیش امام ہونے کی نسبت سے لوگ انہیں مُلا زئی کہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ وہ علاقے میں جمتے گئے یہاں تک ایک موقعہ پر انہوں نے ایک قبیلہ کوٹی کے قلعہ پر شبخون مار کر اُس پر قبضہ کرلیا۔ چند عرصے بعد لوگوں سے رشتے ناطے کئے اور علاقے کے معززین میں شمار ہوئے۔ ان کے خاندان کا ایک مُلاّ شاہرسان نامی نے حاکم پنجگور وسرحد میر کمبر رئیس سے تعلقات استوار کئے۔ اُس کے ایک قریبی عزیز ملا شاہداد نے میر کمبر کے خاندان میں قرآن پڑھایا اور اس کے متعلقین میں شمار ہوئے۔ جب سیوا قلات کے حاکم نے اپنے مخالفین اور باغیوں کے خلاف میر کمبر سے مدد مانگی تو اُس نے لشکر لے کر قلات کا رُخ کیا

اور مُلّا شاہرشان کو بھی ساتھ لیا۔ جسے انہوں نے فتح قلات وزہری کے بعد سوراب میں ملکیت دے کر اپنے نمائندے کی حیثیت سے بٹھایا۔ ملاّ شاہرسان کے پیچھے اُس کے دیگر کئی لوگ بھی سوراب اور قلات چلے آئے جنہیں میر کبمر نے میری کے قریب جگہ دے کر آباد کرایا۔ یہاں وہ شیرازی آخوند مشہور ہوئے۔ ان کا محلّہ بھی محلّہ شیرازیاں کہلایا۔ ان کا ایک جدّ آخوند صالح محمد میر احمد ایلتازئی اور میر محراب ایلتازئی خوانین کا وزیر بنا۔ اور آخوند محمد صدیق تک دربار خوانین سے وابستہ آتے رہے لیکن:

"یہ خاندان خوانین قلات اور بلوچستان کے عوام کے ساتھ کبھی بھی دیانت دار نہیں رہا ہے۔ ہر آن قلات کے حکمرانوں کو بیرونی حکمرانوں کے زیردست اور دست نگر رکھنے کی سازشیں کرتا رہا ہے۔ آخوند محمد صدیق اس خاندان کے وہ آخری فرد تھے جنہوں نے انگریزوں کے ساتھ مل کر خان محراب خان کو موت کے گھاٹ اتروایا۔"

(میر گل خان نصیر صفحات ۱۴۔۱۵)

12۔قلات پر ہندو حکمرانی کا تذکرہ کسی تاریخ میں نہیں ملتا اور جس زمانے میں خراسان وغیرہ میں مغلوں نے یلغار کیا وہ اسلامی دور ہے اور اسلامی دور میں بلوچستان میں کہیں

بھی کسی ہندو بالا دستی کی بات کو مؤرخوں نے تسلیم نہیں کیا ہے۔ کتاب کے مترجم میر گل خان نصیر نے صفحہ 33 کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ روایت ہے کہ قلات کی میری کی بنیاد دو ہزار سال قبل سیوا نامی بادشاہ نے ڈالی تھی۔ لیکن مستند تواریخ میں ایسا کوئی تذکرہ نہیں ملتا۔

13۔ قلات پر مغل قبضہ اور حاکمیت، سیوا ہندو حکمرانی کے تذکرے کی طرح محض ایک مفروضہ ہے۔ البتہ مستونگ میں ایک مغل نایب جعفر مغل کا تذکرہ ملتا ہے جو افغان حکمران کی طرف سے مقرر کیا ہوا تھا۔ جس کا قلات سے کوئی سروکار نہیں تھا کیونکہ ان دنوں مستونگ، قندھار کا حصہ تھا اور قلات الگ تھا۔

آخوند کا یہ کہنا کہ پھر قلات پر میروانیوں نے قبضہ کرلیا تھا بھی ایک خودساختہ مفروضہ ہے۔ میروانیوں کا قلات سے کچھ بھی تعلق نہیں رہا ہے اور نہ کہ میروانی قلات میں بستے تھے۔ میروانی کا تعلق سوراب سے رہا ہے جہاں میروانی سرداری قلعہ نغاڑ میں واقع تھا اور میر عمر جو میروانی سردار طائفہ ''براہو'' سے تھا، میروانیوں کا سردار تھا۔ جو اپنے باپ میران براہو عرف میرو براہو کے قتل کے بعد سردار مقرر ہوا تھا۔ میرو براہو کو شاہی زئی مینگلوں نے اپنے سردار ''شاہی رند'' کے قتل کے بدلے میں محمد رئیس توک کے ہاتھوں قتل کروایا اور اس قتل کے عوض محمد کو وڈھ میں ''باڈری'' کا علاقہ دیا گیا جہاں پر محمد زئی آج تک قابض ہیں۔ واضح ہو کہ شاہی رند، میروانی اور مینگل رندوں کے مابین وڈھ اور ملحقہ چراگاہوں پر لڑائی میں میروانیوں کے ہاتھوں قتل ہو گیا تھا۔ آخوند کا بیان سو فیصد غلط بیانی ہے۔ کوئی میروانی قلات کی حاکمیت پر کبھی بھی نہیں رہا ہے۔

14۔ آخوند کا مذکورہ بیان بھی دروغگوئی ہے۔ رندوں اور میروانیوں کے درمیان قلات پر کوئی لڑائی لڑنا ثابت نہیں ہے۔ نہ کہ میروانیوں کا قلات سے یا اُس کی حاکمیت سے کبھی کوئی تعلق رہا ہے۔ آخوند جس لڑائی کی بات کرتے ہیں وہ سوراب کے مقام پر متنازعہ چراگاہوں کے قبضے پر جدگال قبائل اور میروانیوں کے درمیان ایک عرصے تک لڑی گئی۔ مذکورہ لڑائی کا نام "براہو جدگال جنگ" ہے۔ براہو، میروانیوں کا سردار گھرانہ کا طائفہ تھا جس کی سرکردگی میں جدگالوں سے لڑائی لڑی گئی۔ اس سلسلے کی لڑائیوں میں سے ایک شدید لڑائی میں میروانی سردار میر عمر براہو ولد میر میرو براہو میروانی جدگالوں کے ہاتھوں مقتول ہوئے۔ اس کا ایک بھائی قلندر براہو جو قبیلہ قلندرانی کا جدّ تھا بھی مقتول ہوئے۔ اس لڑائی میں جدگالوں نے میروانی قلعہ نغاڑ پر قبضہ کرلیا۔ اور قلعے کی عورتیں جن میں میر عمر براہو کی بیوی بی بی ماہناز اور اس کا کمسن بچہ بجّار بھی تھا، قلعہ سے بیدخل کی گئیں۔ بی بی ماہناز اپنے کمسن بچے کو لے کر اپنے عزیزوں کے پاس پشین چلی گئی جو پشین کے ایک سید گھرانے سے تھی، مذکورہ لڑائی کی پوری کہانی مشہور رزمیہ داستان "براہو جدگال جنگ ءِ شیئر" (براہو جدگال جنگ کی نظم) کی شکل میں موجود ہے جس کا انگریزی ترجمہ جھلاوان گزیٹر میں شائع ہوا ہے۔

آخوند کی مفروضہ کہانی ایک ذہنی اختراع ہے جس کا ثبوت یہ بھی ہے کہ میروانی سردار میر عمر براہو اور رند سردار میر چاکر خان اور اُس کے والد میر شیہک ہم عصر نہیں تھے۔ میر عمر کا بیٹا میر بجار عین جوانی کے عالم میں جدگالوں پر حملہ آور ہوتا ہے اور قلات کے

سابق خوانین کا ایک شہزادہ میر احمد ایلتازئی اور کئی دوسرے جنگجو اُس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ جدگالوں پر فتح پانے کے نتیجے میں مقبوضات کی براہوا تحادیوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ میر احمد کو قلات اور ملحقہ علاقہ جات بطور حصے میں مل جاتے ہیں۔ 1666ء میں وہ دوسرے دور حکمرانی کا پہلا خانِ بلوچ بن جاتا ہے۔ برسر اقتدار آنے کی تقریب میں میر عمر کا بیٹا میر بجار براہو موجود ہوتا ہے۔ جبکہ مستند تواریخ کے مطابق میر چاکر خان رند نے جام ننده سے سبی 1486ء میں لے لیا۔ (ہسٹری آف بلوچ ریس اینڈ بلوچستان از سردار خان گشکوری) یہی مصنف اپنی دوسری تصنیف ''چاکر اعظم'' میں لکھتے ہیں کہ 1495ء میں امیر ذوالنون کی بیٹی بی بی گراں ناز اور بیگر رند کے معاشقے کے نتیجے میں رندوں اور قندھاری لشکروں کے درمیان درہ بولان کی تاریخی لڑائی لڑی گئی۔ اس وقت سردار چاکر خان بھرپور جوانی میں تھے۔ میر خدا بخش مری نے اپنی تصنیف ''قدیم بلوچی شاعری'' میں لکھا ہے کہ سردار چاکر خان رند، رند لاشار لڑائی کے اختتام پر 1545ء میں ہندوستان چلا گیا تھا۔ ہتورام نے ''تاریخ بلوچستان'' میں لکھا ہے کہ 1540ء میں میر چاکر خان رند اپنے لشکر کے ہمراہ ہمایوں بادشاہ کی مدد کو موجود تھا۔ اور ہمایوں نے شیر شاہ سے 1556ء میں دہلی لے لیا۔ اس طرح میر چاکر خان رند کا زمانہ میر عمر براہو کے زمانہ سے ایک صدی سے زیادہ پیچھے ہے۔ جو آخوند کو دروغگو ثابت کرنے کیلئے کافی ہے۔

''اخبار الابرار'' کے مترجم میر گل خان نصیر نے کتاب کے صفحات 23 اور 24 پر آخوند کے بیان کی تردید کرتے ہوئے لکھا:

''یہ بیان صحیح نہیں۔ یہ لڑائی نغاڑ سوراب کے
مقام پر جدگالوں اور میروانیوں کے درمیان
ہوئی'' ''سردار میرو کا بیٹا میر عمر جہلاوان کے
جدگالوں کے خلاف لڑائی میں مارا گیا۔ ان
دنوں وہ نغاڑ سوراب میں رہتا تھا۔ آخوند کی
رائے کہ میر عمر قلات میں تھے اور رند ولاشار
کے خلاف لڑائی میں مارے گئے، صحیح نہیں
ہے۔ بلوچی اشعار اور دیگر دستاویزات میں
اس کا ثبوت نہیں ملتا جبکہ جدگالوں کے ہاتھوں
اس کے مارے جانے کے ثبوت میں بلوچی
اشعار کی سند موجود ہے۔''

یادرہے کہ اس سے قبل میر گل خان نصیر نے اپنی تصنیف ''تاریخ بلوچستان'' میں اسی میر عمر کو آخوند کی پیروی میں قلات کا حکمران لکھا ہے اور انکی مفروضہ کہانی یوں گڑھی کہ اُس زمانے میں قندھار کے حکمران کی طرف سے ذوالنُّون بیگ ارغون اور شاہ بیگ ارغون قلات میں گورنر تھے۔ جب 1530ء میں مرزا کامران نے قندھار میں ارغونوں کو شکست دی اور ان کی طاقت پاش پاش کی تو میر عمر نے اس صورتحال سے فائدہ اٹھا کر ایک بلوچ فوج جمع کی اور ذوالنون بیگ ارغون کو شکست دی اور اسے افغانستا

بھاگ جانے پر مجبور کر دیا۔اس طرح قلات میں میروانی حکومت کی بنیاد پڑی۔

میر گل خان نصیر کی مذکورہ ذہنی اختراع کی تردید کرتے ہوئے معروف محقق جسٹس (ر) میر خدا بخش بجارانی مری نے اپنی تصنیف ''بلوچستان تاریخ کے آئینے میں'' کے صفحہ 356 پر یوں لکھا ہے:

''مندرجہ بالا بیانات بے بنیاد اور نا قابل قبول ہیں بلکہ حقیقتاً وہ تاریخی واقعات اور دوسرے مقامات پر اس کتاب کے پیش کردہ مواد کے بالکل برخلاف بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہنا کہ قندھار کے حکمران نے ذوالنون بیگ ارغون اور شاہ بیگ کو قلات کے گورنر مقرر کیا تھا اور 1530ء میں ذوالنون بیگ ارغون میر عمر خان میرواڑی سے ایک لڑائی میں شکست کھا کر قلات سے چلا گیا، اُس دور کے تاریخی واقعات سے ناواقفیت کا مکمل اظہار ہے۔ ذوالنون بیگ ارغون قندھار کے حکمران کا مقرر کردہ نہیں تھا۔ نہ ہی 1530ء میں اُس نے میر عمر میروانی سے شکست کھائی تھی۔ اور

نہ ہی شہنشاہ بابر کے لڑکے کامران مرزا نے
اسے قندھار سے نکالا تھا۔ اِس کے برخلاف
ذوالنون بیگ خود قندھار کا گورنر تھا جسے ہرات
کے بادشاہ شاہ حسین نے مقرر کیا تھا اس لئے
میر گل خان نصیر کے بیان کے برعکس نہ وہ کبھی
قلات کا گورنر رہا اور نہ کبھی اس کی لڑائی میر عمر
میرواڑی سے ہوئی۔ علاوہ ازیں ذوالنون
بیگ تو 1530ء میں زندہ بھی نہیں تھا۔ کیونکہ
1507ء میں محمد خان شیبانی اُزبک کے
خلاف ہرات میں ایک لڑائی میں مارا گیا تھا۔
اور پھر یہ بات بھی یاد رہے کہ ذوالنون بیگ
کے لڑکے شاہ بیگ کو 1522ء میں قندھار
کے بادشاہ بابر کے حوالے کرنا پڑا تھا نہ کہ اس
کے لڑکے کامران کے۔ بنابریں میر گل خان کا
یہ تمام بیان درست نہیں اور ارغونوں سے اُس
کی جنگ غیر تاریخی باتیں ہیں۔''

میر گل خان نصیر کی غیر سنجیدہ تاریخ نویسی کے بارے میں معروف دانشور، محقق

اور گوریلا کمانڈر میر شیر محمد مری عرف شیروف اپنی تصنیف ''بلوچی کہنیں شاعری'' کے صفحہ 69 پر لکھتے ہیں:

''ان دوستوں نے اپنے دلپسند واقعات کا
مجموعہ لکھ کر اُس کا نام ''بلوچ قوم کی تاریخ''
رکھا ہے۔ انہوں نے قومی قدح میں زہر گھول
کر بلوچ قوم کی تاریخ کے نام پر زہریلے
پیالے بھر کر بلوچ اور غیر بلوچوں کو پلایا
جنہوں نے آنکھیں بند کر کے یہ زہر نوش
کیا۔''

اسی طرح ''تاریخ سندھ۔ کلہوڑہ دورِ حکومت کے مصنّف غلام رسول مہر نے احمد زئی خوانین اور کلہوڑوں کے مابین لڑائیوں اور دیگر واقعات کے بارے میں میر گل خان نصیر کے تمام بیانات کو جو انہوں نے ''تاریخ بلوچستان'' نامی کتاب میں درج کئے ہیں، سنداً جھٹلا دیا ہے اور انہیں غیر تاریخی قرار دیا ہے۔ ملاحظہ کریں اُن کی کتاب ''تاریخ سندھ۔ کلہوڑہ عہد'' جلد اوّل صفحات 204، 390 اور 449۔

15۔ جب چاکر رند اور اُس کے والد شیہک ڈھاڈر میں اُترے اور گواہرام لاشاری گنداوہ پہنچے تو قلات میں کیسے انہوں نے میر مندو پُھشّو کو حاکم مقرر کیا؟ یہ ادھوری کہانی کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ حقیقت یہ ہے کہ رند قبائل گروہ در گروہ اور وقتاً فوقتاً قلات ہی

کے آس پاس پہنچے تھے اور مختلف ڈیرے ڈال چکے تھے۔ منگچر کا علاقہ رندوں کی بڑی چھاؤنی ہوتی تھی۔ لاشاریوں کا رندوں کے ساتھ آنے کا نہ کوئی ثبوت ہے اور نہ کوئی نشان پا۔ رندوں کا ایک بڑا مسلح گروہ سردار چاکر خان کی سرکردگی میں نیچارہ قلات پہنچا تھا جہاں پر ایک جٹ سردار یا حاکم حمیر نامی تھا جو حمیر جدگال کے نام سے مشہور ہے۔ اس سردار نے رند جھتوں کے خلاف لشکر کشی کی اور ان کے درمیان کافی دنوں تک جھڑپیں ہوتی رہی تھیں۔ جب رند قبائل کے پیچھے آنے والے لشکر پہنچتے گئے اور ان کی پوزیشن مضبوط ہوتی گئی تو سردار چاکر خان رند نے اپنے ایک جرنیل موسیٰ رند کو گفت وشنید کیلئے حُمیر کے پاس بھیجا۔ لیکن اس کا کوئی خاص نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور حمیر کے لوگوں نے رند بستیوں پر لگاتار حملے کئے اور کئیوں کے مال مویشی بھی لوٹ کر لے گئے۔ تب سردار چاکر خان نے موسیٰ رند کی سربراہی میں ایک لشکر جدگالوں اور جٹوں پر حملے کیلئے بھیجا اور دوسرا لشکر بنگل خان رند (جدّ امجد بنگلزئی) کی کمان میں قلعہ نیچارہ پر دھاوا بول دیا۔ چار دنوں کی لڑائی میں دشمن کا ایک سردار کانبو خان (اوّل) مارا گیا اور نیچارا قلات پر رندوں کا قبضہ ہوگیا اور سردار چاکر خان کی حاکمیت تلے آ گیا۔ اس دوران سیوا قلات کسی مُورک یا میرک کی بالا دستی میں تھا۔ جو اکثر و بیشتر باغیوں اور ڈاکوؤں کی بار بار کی یلغاروں سے پریشان تھا۔ چاکر خان سیوا قلات کو بھی زیر نگیں لانا چاہتا تھا مگر سبی سے اُس کیلئے پیغام آ گیا تھا کہ وہاں پہنچ جائے۔ چنانچہ انہوں نے نیچارہ میں میر مندو کو نائب حکومت بنا کر سبی کا رُخ کیا اور پھر واپس قلات نیچارہ کبھی نہیں آیا۔

جھالاوان گزیٹر نے قلات نیچارہ پر حملے کے بارے میں لکھا ہے کہ قلعہ نیچارہ پر رندوں کے حملے میں الکوزئی خانہ بدوش افغان قبیلہ نے بھی رندوں کی مدد کی تھی جس پر نیچارا کی وادی کا ایک حصہ الکوزئیوں کو خدمات کے عوض دیا گیا تھا۔ موجودہ وقت میں الکوزئی نیچاری کہلاتے ہیں۔ رئیسانیوں کا بھی کہنا ہے کہ وہ بھی رند اتحادیہ کے دست وبازو رہے تھے۔ اور انہوں کو بھی میر مندو رند نے ساتھ دینے اور رشتوں کے ناطے چھپر اور منگچر میں اراضیات دی تھیں۔ اور سراوان کا بیرک دار میر ہیبتان رئیسانی کو بنایا تھا۔ لیکن بعد میں جب یہ اہم منصب رئیسانیوں سے لے کر شاہوانیوں کو دیا تو رئیسانیوں نے چھپر اور منگچر کی دی ہوئی اراضیات واپس کر دی تھیں۔

قلات پر میر مندو رند کی حاکمیت کا تذکرہ ڈومبکی قبیلہ کے ہاں محفوظ دستاویزات جو ''دفتر ڈومبکی تمن'' کے نام سے ہیں، میں موجود ہے جو اِس طرح ہے:

''بخیال گرفتن مُلک پنجاب وہندوستان کو
چیدہ رواں گشت..............وقت کوچیدن
از کچھی، یکے نایب خود در سیوی دوئم درشوران،
سوئم نائب مسمی مندو در قلات مقرر نمود رفتہ
بود۔''

یعنی

''(سردار چاکر خان رند نے) ملک پنجاب
وہندوستان قبضہ کرنے کے ارادے سے کوچ کیا۔

کچھی سے روانہ ہوتے وقت انہوں نے اپنے
تین نائب مقرر کیے۔ ایک نائب سیوی میں،
دوسرا شوران میں اور تیسرا نائب مسمی مندو کو
قلات میں مقرر کر کے چلے گئے۔"

16۔ آخوند کا لکھا قطعی غلط ہے۔ اُسے یہ دہواروں نے لکھوایا ہے جس کی کوئی سند نہیں ہے۔ براہو جدگال جنگ کی بلوچی رزمیہ داستان کے مطابق وہ اپنے بچے کو لے کر اپنے خواجہ سیدّ قبیلہ میں پشین چلی گئی اور وہاں اٹھارہ سال تک اپنے بیٹے بجّار کی تربیت کرتی رہی اور اُسے جدگالوں سے انتقام لینے کے ارادے سے پرورش کرتی رہی۔

17۔ یہ لکھوائی گئی کہانی بھی جھوٹی ہے۔ دہواروں اور میروانیوں کے مابین کسی بھی دور میں کوئی رشتہ داری ثابت نہیں ہے۔ اور نہ کہ بی بی ماہناز خواجہ خیلوں یا دیگر دہواروں کی پناہ میں گئی تھی۔ اگر اُس کی شادی دہواروں میں ہوتی تو براہو جدگال جنگ کی طویل شعری داستان میں اُس کا ذکر ضرور ہوتا۔ اور خواجہ خیلوں سے اُس کی کوئی اولاد تو ظاہر ہو ہی جاتی تھی۔ لیکن ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔

18۔ مذکورہ بیان کا تعلق خواجہ خیلوں سے نہیں ہے۔ بلکہ بجّار اپنی ماں سے کہتی ہے کہ اُسے گھر بیٹھنے کی بُزدلی کی زندگی پسند نہیں ہے۔ اور وہ ساری زندگی شرمندگی سے نہیں گذار سکتا۔ براہو جدگال جنگ کی شعری داستان کے اشعار کا ترجمہ یوں ہے:

”جب بجار جوان ہوا تو ایک روز نہایت
افسردگی سے اپنی ماں سے اپنے باپ کے قتل
اور براہو طائفے اور قبیلہ میروانی کی بربادی کا
ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ ہر حال میں اپنے
باپ اور عزیزوں کا انتقام جدگالوں سے لے
کر رہیگا۔ وہ جدگالوں کو سوراب کی سرزمین پر
دندناتا ہوا نہیں چھوڑے گا۔ اُن کی لاشوں
کے پُشتے لگا دے گا۔ یا پھر خود جان دے کر
شہید ہوگا۔“ ”ملک بجار کی ماں نے بیٹے کی
زبان سے سب کچھ سننے کے بعد کہا کہ اپنی خنجر
آبدار سجالو اور سوراب کی طرف جا کر کہیں
چھپ جاؤ اور اپنے باپ کے ایک وفادار غلام
جس کا نام گوشو ہے اُسے تلاش کرو اور اپنا مدعا
اُسے بتادو اور گوشو کے مشورے پر عمل کرو۔“

دہواروں اور خواجہ خیلوں سے منسوب آخوند کی بیان کردہ تمام تر کہانیاں پروپیگنڈہ اور دروغگوئی ہیں۔ ان بیانات سے ایسا لگتا ہے کہ اُن دنوں قلات میں ماسوائے دہواروں کے کوئی دوسرا ذی نفس تھا ہی نہیں۔ آخوند کی تصنیف قلات اور خوانین

قلات کی تاریخ سے زیادہ ایک ''دہوار نامہ'' معلوم ہوتا ہے۔ جو قلات کی تاریخ سے ایک بیہودہ مذاق ہے۔

19-20۔ یہ سارا دروغگوئی کا ایک ہی سلسلہ چل رہا ہے۔ بجار اپنی ماں سے اجازت لیکر سوراب کی طرف جدگالوں سے انتقام لینے جارہا ہے۔ تو وہ منگچر میں کیونکر لوگوں سے مندو رند کا پوچھتا پھرے گا۔ دہواروں اور آخوند سے زیادہ اُسے اپنے دشمنوں کا پتہ ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ منگچر رند قبائل کا گڑھ اور رندوں کی ایک بڑی چھاؤنی تھی اور بجار خود بھی میروانی بلوچ تھا۔ اُسے رندوں سے کوئی خوف نہ تھا۔ آخوند صاحب نے یہ بھی نہیں بتایا ہے کہ منگچر کے زمیندار کون تھے اور کس قبیلے کے لوگ تھے۔ میروانی قبیلہ تو وہاں رہتا بھی نہیں تھا جن کی ہمدردیاں وہ حاصل کرنا چاہتے ہوں۔

21۔ مذکورہ بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ آخوند صاحب کو رئیسانی قبیلہ کے رند الاصل ہونے کا بھی علم نہیں تھا ورنہ وہ یہ سب کچھ تحریر نہیں کرتے تھے۔ جبکہ میر بجار کو یقیناً یہ علم تھا کہ رئیسانی رند قبیلہ ہے لیکن اُسے تو رندوں یا رند حکمران سے کچھ لینا دینا تھا ہی نہیں۔ آخوند کے وقت کے بعد کے یورپیوں کو تو رئیسانیوں کے اصل و نسل کا پتہ تھا۔ جنہوں نے ان کا پورا شجرہ نسب شائع کیا، آخوند کورے کے کورے رہے یا پھر اُس نے جانتے بوجھتے ہوئے کہانی کا رُخ بغض رندی کے تحت موڑ دیا ہے۔ مزید برآں یہ کہ رئیسانی بحیثیت قبیلہ میر بجار کے زمانے سے ایک صدی پہلے موجود تھا۔ اس حقیقت کے پیش نظر رئیس سیاہی کو رئیسانی قبیلہ کا جدّ امجد بتانا رئیسانی تاریخ سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ مزید

برآں شعری داستان آخوند کے بیانات کے برعکس بتاتی ہے کہ میر بجّار کو اُس کی ماں نے سیدھا سوراب چلے جانے اور اپنے والد کے غلام گوشو سے مشورہ کرنے کی ہدایت کی اور اُسے گوشو کو پہچاننے کیلئے اُس کی نشانیاں بھی بتادی تھیں۔

22۔ حیرت کی بات ہے جب سیاہی نے میر بجّار کو مدد کرنے کے بارے میں کورا سا جواب دیا تھا تو پھر اچانک وہ بجّار کے ساتھ کیوں کر ساز باز میں شامل ہوئے اور پھر بجائے قلات جاکر مندو رند حاکم قلات سے لڑتا، سیدھا واپس منگچر جاکر مندوانیوں کے اونٹوں کے گلے چُرالائے۔ یہ عجیب مؤرخ ہے کہ ایک جگہ میر بجار کو ایک قبائلی منتقم اور سردار زادہ بتاتا ہے جو جدگال دشمنوں کو جانتے ہوئے رند حاکم قلات کو قتل کرنے اور قلات کا حکمران بننے کا خواہشمند ہے۔ دوسری جگہ اُسے ایک ڈاکو اور چور بتاتا ہے جو حاکم قلات سے لڑنے کی بجائے منگچر ڈکیتی ڈالنے چلا جاتا ہے۔

23۔ یہ آخوند ہی ہیں جو گھوڑوں کے مرنے پر سیاہی کو ایک سنگدل اور لالچی باپ کے روپ میں پیش کرتا ہے جسے اپنی اولاد سے زیادہ ایک گھوڑا عزیز ہے۔ جو کہتا ہے کہ گھوڑوں کے بدلے میں بیٹے کیوں نہ مرے۔ انسانی نفسیات کو اس شکل میں پیش کرنا کسی اُجڈ، گنوار شخص کا کام شاید ہو، مؤرخ اور قلمکار کا کام ہرگز نہیں۔

24۔ اُس وقت ''براہوئی'' کی تشکیل نہیں ہوئی تھی اور نہ کہ لفظ ''براہوئی'' وجود رکھتا تھا۔ دروغگوئی قدم قدم پر ظاہر ہورہی ہے۔

25۔ مصنف نے یہ نہیں بتایا ہے کہ براہوئی قبائل کون کون سے تھے اور بلوچ قبائل کون کون سے تھے۔

26۔ مندو کی موت اور اُس کے قبر کی نشاندہی بھی دروغگوئی ہے۔ مذکورہ مقام پر مندو کی قبر کے بارے میں ملک سعید نے بھی آخوند کی خوشہ چینی کرتے ہوئے اپنی کتاب ''تاریخ بلوچستان'' مطبوعہ بلوچی اکیڈمی کوئٹہ (2007) کے صفحہ 438 پر وہی لکھا جو آخوند نے لکھا ہے۔ پھر اِسی کتاب کے صفحہ 419 پر وہ اِسی قبر کو بجائے میر مندو کے، میر عمر میروانی کا لکھتے ہیں۔ دونوں حوالے انہوں نے آخوند مُلّا محمد صدیق کی اسی کتاب یعنی ''اخبار الابرار'' کے دیئے ہیں۔ جبکہ آخوند نے اپنی کتاب میں میر عمر میروانی کے قبر کی نشاندہی نہیں کی ہے۔

چہ دُزدے است کہ بکف چراغ دارد

چونکہ میروانیوں اور رندوں کے مابین کوئی لڑائی لڑنا ثابت نہیں ہے اور جیسے کہ گذشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ میر بجّار اور رند سردار میر چاکر اور اس کا والد میر شیہک رند ہم عصر نہیں گذرے ہیں بلکہ ان کے درمیان ایک صدی سے زیادہ عرصہ حائل ہے اس لئے رندوں اور میروانیوں کے مابین آخوند کی بیان کردہ جنگ کی کہانی ایک مفروضہ اور واضح غلط بیانی ہے۔ اس کے پیش نظر میر مندو رند کے مارے جانے اور قبر کی نشاندہی بے بنیاد قصہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب سولہویں صدی میں میر کمبر رئیس نے سیوا قلات کے حکمران کی دعوت پر زہری و قلات پر لشکر کشی کی اور پھر قلات کے حاکم کو معزول کر کے خود حکمران بن بیٹھا تو ان دنوں قلات نیچارہ پر میر مندو رند حکمران تھا۔ جسے میر کمبر نے قلات کے لوگوں کی شکایت پر حاکمیت سے دستبردار کر لیا تھا۔ میر مندو نے بھی میر کمبر کی حاکمیت

کو قبول کر لیا تھا اور قلات سے پنجاب جانے کی تیاریوں میں تھا کیوں کہ سردار چاکر خان رند نے اُسے پنجاب آنے کا کہا تھا۔

مستند تواریخ سے ثابت ہے کہ میر مندو رند اپنے ایک چھوٹے لشکر کے ساتھ ''امیر بلوچستان'' کی حیثیت سے پنجاب سردار چاکر خان رند کے پاس پہنچ چکے تھے۔ جہاں پر سردار چاکر خان نے اپنی ریاستی جاگیر کے حدود میں ایک علاقہ اور پاک پتن کے قریب فتح پور کا قلعہ اُسے رہائش کیلئے دیا تھا۔

شیر شاہ جب ملک پر قابض ہوا تو اُس نے ملتان اور گردونواح کا علاقہ بلوچوں سے چھیننا چاہا اور اس مقصد کیلئے اُس نے اپنے جرنیل ہیبت خان نیازی کو یہ مہم سونپ دیا۔ جو پہلے ہی شیر شاہ کے ایک باغی فتح خان کمبوہ کی گرفتاری کے پیچھے چل پڑا تھا۔ جو قبولہ کے اطراف میں موجود تھا۔ جب فتح خان کو ہیبت خان کے آمد کی اطلاع ملی تو وہ بھاگ کر فتح پور میں میر مندو خان کے قلعہ میں آ کر پناہ کا طالب ہوا۔ مزید احوال جناب مولانا نور احمد خان فریدی کی تصنیف ''بلوچ قوم اور اُس کی تاریخ'' سے قارئین کی خدمت میں پیش کریں گے:

''اگرچہ مندو خان کے پاس تین چار سو سے
زیادہ سپاہی نہیں تھے۔ تاہم اُس نے ایک
در پر آئے ہوئے پناہ گیر کو مایوس کرنا بلوچی
حمیت کے خلاف جانا اور قلعے کا دروازہ کھلوا

کر اُسے اندر بلوالیا۔ ہیبت خان کی فوجیں پہنچ
گئیں اور انہوں نے شہر کا محاصرہ کرلیا۔ اور
طرفین کے درمیان جنگ شروع ہوئی۔ عین
اُس وقت جب کہ بلوچ اپنی طاقت کے کم
ہونے کے باوجود مردانہ وار لڑ رہے تھے، فتح
خان کمبوہ نے اپنے محسنوں کو جنہوں نے محض
اُس کی خاطر جنگ مول لی تھی، دشمن سے تنہا
نبرد آزما ہونے کیلئے چھوڑ دیا۔ اور اُس نے
حضرت شیخ الاسلام فرید الدین مسعود گنج
شکر علیہ الرحمتہ کے صاحب سجادہ شیخ ابراہیم
کے ذریعے ہیبت خان سے صلح کی بات چیت
شروع کی اور انجام کار اپنے آپ کو شیخ کی
وساطت سے ہیبت خان کے حوالے کیا۔

اس کے بعد کیا ہوا وہ تاریخ افاغنہ کے مصنف نعمت اللہ سے سُنئے لکھتا ہے:

''محاصرہ کے دوران رات کے وقت
بلوچستان کا امیر جس کا نام مندو خان بلوچ
تھا، اپنے قلعے کی حفاظت کیلئے انتہائی پامردی

سے لڑتا رہا لیکن جب اُسے کامیابی کی کوئی صورت نظر نہ آئی تو اُس نے وہی کچھ کیا جو غیور اور جسور لوگ ایسے اوقات میں کر گزرتے ہیں۔ یعنی بلوچوں نے بے عزتی کے خوف سے خود اپنی عورتوں اور بچوں کو قتل کر دیا اور مندو خان مع اپنے تین سو رفیقوں کے قلعہ سے باہر آ گیا۔ اور محاصرین پر شدت سے ٹوٹ پڑا۔ اُس نے نہایت شجاعت سے جنگ کی اور بزور شمشیر اپنا راستہ بنا کر فرار ہو گیا۔ جب صبح ہوئی تو افغانوں نے قلعے پر قبضہ کر لیا۔ معزز خواتین تو اپنے غیور وارثوں کے ہاتھوں جام شہادت نوش کر چکی تھیں لیکن بچے کھچے لوگوں کو ہیبت خان نے قید کر لیا۔

میر مندو خان لڑتا بھڑتا بخشو لنگاہ کے پاس پہنچا۔ وہ کچھ دیر ستانا چاہتا تھا مگر بخشو نے دھوکہ اور فریب سے اُسے گرفتار کر کے ہیبت خان کے پاس بھجوا دیا''

''تاریخ شیر شاہی'' میں اُس کے مصنف عباس خان شیروانی لکھتے ہیں کہ ہیبت خان نے شیر شاہ کو فتح نامہ تحریر کیا تو وہ بڑا خوش ہوا اور اُس نے ہیبت خان کو ''اعظم ہمایون'' کا خطاب مرحمت کیا۔ نیز حکم دیا کہ فتح خان کمبوہ، مندو خان اور بلوچ خان (اصل نام میران خان جو چاکر رند کا فرزند تھا) کو قتل کر دو اور بخشو لنگاہ یا اس کے بیٹے کو اپنی خدمت میں رکھو۔ ہیبت خان نے حکم ملتے ہی میران خان بلوچ کو شہید کر دیا اور فتح جنگ کو قائم مقام چھوڑ کر فوراً لاہور پہنچا اور وہاں اُس نے فتح خان کمبوہ اور میر مندو خان کو دارِفانی سے عالم باقی کو رخصت کیا۔''

یہ ہوئی میر مندو خان کی حقیقی کہانی جس کے قبر کی جھوٹی نشاندہی آخوند اور اس کے دروغ نویس مصنفین قلات میں کرتے ہیں۔

27۔ بجّار کبھی قلات کا حاکم نہیں رہا تھا۔ وہ براہوا تحادیہ کا سربراہ تھا۔ جنگ کے اختتام پر اُسے نئے اتحادیہ کا چیف سردار منتخب کیا گیا۔ سوراب کے مقام پر تمام اتحادیوں کے سرکردگان نے بحیثیت میروانی سردار اور چیف کے اُس کی دستار بندی کی۔ مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کی گئی اور ہر اتحادی لشکر کو اُس کے جنگی خدمات کے عوض اراضیات دی گئیں۔ ایلتازئی شہزادہ میر احمد کو، رزمیہ داستان کی رُو سے مستونگ کے کھڈ کوچہ سے خضدار قلعے تک کے درمیانی علاقے دیئے گئے یعنی قلات کا پورا علاقہ اُسے مل گیا۔ یاد رہے کہ خطّہ قلات پر سولہویں صدی کی ابتداء سے میر احمد کے اجداد کی حکمرانی چلی آرہی تھی کہ درمیان میں حاکمی ان سے چھن گئی تھی۔ اسی حاکمیت کے دوبارہ حصول کیلئے میر احمد نے میر بجار کی

سر براہی میں براہو اتحادیہ کا ساتھ دیا تھا۔ اس شمولیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قلات پر اس عرصے میں دوبارہ جدگالوں نے تسلط کیا ہوگا۔ بہر حال قلات کا علاقہ خضدار تک قلات کے سابق حکمران خاندن کو مل گیا اور میر احمد ایلتازئی 1666ء میں، جو براہو جدگال جنگ کا اختتامی سال تھا، قلات میں برسر اقتدار آیا۔ یہی میر احمد ایلتازئی پھر نئے تشکیل شدہ قبیلہ احمد زئی کا جد امجد ہوا۔ جو بانی خوانین بلوچ میر کمبر رئیس کے سلسلے کا آٹھواں خان اور جدید اتحادیہ "براہوئی" کا پہلا خان بلوچ ہوا۔ میر بجار نہ کبھی قلات میں رہا تھا اور نہ قلات کی حاکمیت پر اس کا کوئی دعویٰ تھا۔ اُس کی موجودگی اور سر براہی میں میر احمد کی بحثیت خان قلات دستار بندی کی گئی۔ لہذا آخوند کا یہ کہنا کہ قلات بغیر حاکم کے رہا ایک دروغگوئی ثابت ہوئی ہے۔

جس طرح آخوند کے بیانات "براہو جدگال جنگ کی رزمیہ داستان" کی روشنی میں غلط ثابت ہو رہے ہیں بالکل اسی طرح اُس کا بیان بجار کی بادیہ نشینی کے بارے میں بھی غلط اور اُس کا مفروضہ ہے۔ اگر بجار کو بادیہ نشینی کا شوق ہوتا تو نہ وہ یہ لڑائی لڑتا نہ کہ اپنی دستار بندی کرواتا اور نہ سرداری کی قومی ذمہ داریاں اٹھاتا۔ میروانی قبیلہ کی روایتوں کے مطابق اُس نے 88 سال کی عمر تک قبیلے کی سرداری کی۔ پھر اپنی زندگی میں اپنے بڑے بیٹے میر دوستین براہو کی بحثیت میروانی سردار دستار بندی کی اور 91 سال کی عمر میں اُس کا انتقال ہوا تھا۔

28۔ مغلوں کا قبضہ بھی ایک بے بنیاد، بے سند، بے روایت بات اور صرف ایک دروغگوئی

ہے۔ بجار کی زندگی میں میر احمد ایلتازئی قلات میں خان بلوچ کی حیثیت سے برسر اقتدار آئے۔ اُس دن سے لے کر آخری خان بلوچ میر احمد یار خان تک احمد زئی برسر اقتدار آرہے ہیں۔ اس درمیان میں مغل کیسے اور کہاں سے آ گئے۔

29۔ ایسے لگتا ہے کہ قلات میں بغیر کسان دہواروں کے اور کوئی ذی روح بستا نہیں تھا۔ اور مغل صاحب کسی اندھیری رات میں بستر بغل میں دبائے دہواروں کے بیٹھک میں بیٹھ کر ایک کمزور اور شریف مہمان کی حیثیت سے چوری چھپے قلات پر خاموش حکمرانی کرنے لگا۔ اور پھر اپنے قتل ہونے کے خوف سے کسی بیٹھک میں دہواروں کو بلا کر لڑائی نہ لڑنے معاہدہ کیا۔

اگر آخوند کو ڈکٹیشن دینے والا دہوار مغل لشکروں کے بارے میں تھوڑا سا علم رکھتا تھا کہ وہ کیسے یلغار کرتے ہیں، شہروں کو کیسے لتاڑ کر خون کی ندیاں بہا کر مکینوں کے سروں کی میناریں کھڑی کر کے پھر برسر اقتدار آتے ہیں تو مذکورہ مغل کہانی کا ایک لفظ اُس کے منہ سے نکل نہیں سکتا تھا۔ روئے زمین پر آج تک ایسا مغل کہیں بھی پیدا نہیں ہوا ہے کہ کرے حکمرانی اور طاقتور قبائل کو چھوڑ کر ایک کمزور اور مختصر قبیلہ سے نہ لڑنے کا معاہدہ کرے اور معاہدہ بھی لکڑی اور جوتے سے لڑنے کی۔ واہ مؤرخ صاحب واہ! کیا زبردست طریقہ سے مغل حاکم کو پیش کیا ہے۔

30۔ جھوٹ کے اس سلسلے پر مزید تبصرہ فضول ہے۔ صرف ''ڈوڈکی'' کی وضاحت کریں گے۔ جنہیں ڈوڈکی کہا جاتا ہے یہ بنیادی اور نسلی دہوار نہیں ہیں بلکہ ڈیرہ غازی خان کے

علاقہ ''ڈوڈھک'' سے آئے ہوئے چند لوگ تھے جو قلات میں بس گئے اور کشاورزی سے وابستہ رہے، دہواروں سے خلط ملط ہو کر دہوار بن گئے لیکن ''ڈوڈھک'' کی نسبت سے ''ڈوڈکی'' کا علاقائی نام اُن کی ابھی تک شناخت ہے۔ آخوند نے اپنی تحریر میں ''ڈوڈکی'' کی اگرچہ وضاحت نہیں کی ہے لیکن اُس کا کہنا یہ ہے کہ باجرے کی سخت کی ہوئی روٹی کو مقامی زبان میں ''ڈوڈکی'' کہتے ہیں اور روٹیوں سے حملہ آور دہوار ''ڈوڈکی زئی'' مشہور ہوئے لیکن اُس کا کہنا غلط ہے۔ مذکورہ روٹی کو ''ڈوڈی'' اور کہیں ''ڈڈی'' کہتے ہیں۔ ''ڈوڈی'' نہیں کہتے۔

31۔ کمبرانی قبیلہ کا جدّ براہو جدگال جنگ میں شامل میر احمد ایلتازئی کے لشکر کا سپہ سالار ''میر کمبر کہدائی تھا جس کے باپ کا نام سلیمان تھا جسے ایلتازئی شاہزادوں کا داماد کہا جاتا ہے۔ اس کمبر کے لشکری اور اتحادی کمبرانی کہلائے۔ اس کمبر کا نسبی سلسلہ میر ابراہیم تک نہیں جاتا۔

32۔ میر حسن کی حکمرانی کی جھوٹی کہانی کی قلعی اب آخوند کی اپنی تحریروں کی روشنی میں کھول دی جائیگی۔ یہ تو ثابت ہے کہ میر احمد ایلتازئی، میر بجار کا جنگی اتحادی تھا جسے اختتام جنگ پر کھڈ کوچہ سے خضدار تک کا علاقہ خدمات کے عوض دیا گیا جس کے اکثر حصے اُس کے آباؤ اجداد کی ملکیت میں ہوتے آئے تھے۔ میر بجار کی زندگی میں اور اُس کی موجودگی میں میر احمد ایلتازئی 1666ء میں قلات کی گدّی پر بیٹھا۔ اس تاریخ پر تمام مصنّفین اور مورخین متفق ہیں۔ یعنی میر احمد اور میر بجار ہم عصر ہیں اور جدگالوں کے

خلاف مشترکہ لڑ رہے تھے۔ آخوند نے اپنی اسی کتاب میں خوانین کا شجرہ نسب بھی دیا ہے۔ جس میں میر حسن، میر احمد سے گیارہ پُشت پیچھے ہے۔ اگر ہر پُشت کو پچیس سال کا عرصہ دیا جائے تو میر احمد اور میر بجار اور میر حسن کے درمیان دوسو پچھتر سال کا عرصہ حال ہو جاتا ہے۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ دوسو پچھتر سال قبل فوت ہونے والا شخص میر بجار و میر احمد کے بعد حاکم بنے گا۔ قدم قدم پر ثابت ہو رہا ہے کہ آخوند محمد صدیق کی تصنیف ایک بے بنیاد اور ناقابل اعتبار اور فرضی تصنیف ہے خاص طور پر میر نصیر خان کی حکمرانی سے قبل کے واقعات کے بارے میں ان کے کتاب کی ایک ایک سطر ناقابل بھروسہ ہے۔

34۔ احمد زئی قبیلہ، میر احمد ایلتازئی سے شروع ہوتا ہے۔ میر احمد ایلتازئی سے قبل کے خوانین ایلتازئی خاندان سے تھے جن کا آخری فرد میر احمد ہے جس کے نام سے نیا قبیلہ ''احمد زئی'' تشکیل پا گیا۔

35۔ ''تاریخ بلوچستان'' نامی اپنی تصنیف میں ملک سعید دہوار صفحہ 468 پر لکھتے ہیں کہ آغا میر جعفر ایرانی فوج کے شکست خوردہ دستوں کو لے کر قندھار کی طرف پسپا ہوا۔ مستونگ کے علاوہ شال اور چاغی پر بھی خان کا قبضہ ہو گیا۔

جہاں تک باغبانہ، خضدار، کرخ اور چکو کے علاقے بزور شمشیر حاصل کرنے کی بات ہے یہ ''براہو اتحادیہ'' کے مشترکہ لشکر نے جدگالوں پر فتح حاصل کر کے پالئے اور پھر خدمات کے عوض میر احمد کے حصے میں دیئے گئے۔ یہ پوری تفصیل ''براہو جدگال جنگ کی بلوچی رزمیہ داستان میں بیان کیا گیا ہے۔

36۔خان صاحب کا کہنا غلط اور آخوند مُلا محمد صدیق کی فارسی کتابچہ ''اخبار الابرار'' کی تقلید ہے۔ جو کہ ایک من گھڑت اور مفروضوں سے بھر پور کتاب ہے اور خان صاحب انہی مفروضوں کی تشہیر کر رہے ہیں۔قلات کی بلوچی مرکزیت کا سہرا میرو میروانی کے سر نہیں بندھتا بلکہ خان صاحب کے اپنے اجداد میں سے میر کمبر رئیس حاکم پنجگور و سرحد کے سر بندھتا ہے۔جس نے قلات کے دو مشہور قلعوں قلات نیچارا اور قلات سیوا کو زیر نگیں لا کر خان اوّل کی حیثیت سے اسے بلوچ مرکزیت کی حیثیت دی۔دیکھیں پچھلے صفحات میں موضوع ''بلوچ نسل'' کا حاشیہ نمبر 29۔

خان صاحب کا متذکرہ میرو خان میروانی کوئی حاکم قلات نہیں تھا۔اُس کا قلات اور اس کی تاریخ سے کسی قسم کا تعلق نہیں رہا ہے۔میرو خان جو میرو براہو کہلاتا تھا سوراب کا باشندہ تھا اور قبیلہ میروانی کا ایک جنگجو سردار تھا۔میروانیوں کا تاریخی اور قبیلائی قلعہ سوراب کے موضع نغاڑ میں تھا۔قلات سے اُس کا کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ تفصیل کیلئے دیکھیں حاشیہ نمبر 13۔جہاں تک قلات میں کسی سیوائی حکمرانی کا تذکرہ ہے وہ بھی آخوند محمد صدیق کی کتاب سے اخذ شدہ ہے محققین نے اسے بھی تسلیم نہیں کیا ہے۔اس بارے میں ملاحظہ کریں حاشیہ نمبر 1۔

37۔قلات اور مضافات پر مغل غلبہ خان صاحب کے قائم کیے گئے دیگر کئی مفروضوں کی طرح ایک مفروضہ ہے۔وہ بغیر سن و سال کے حوالے اور تذکرے کے ہزاروں سال قدیم دراوڑوں کی بھی بات کرتے ہیں اور پندرھویں سولھویں صدی کے جاموٹوں اور

جدگالوں کا بھی ایک ساتھ تذکرہ کر کے تفصیلات گول کر جاتے ہیں۔ جو غیر تاریخی قلمکاری بھی ہے۔اور تاریخ اور تاریخی واقعات کے بارے میں ان کی عدم علمیت کا ثبوت بھی ہے۔نیز ملاحظہ کیجئے حاشیہ نمبر 12 اور حاشیہ نمبر 13۔

38۔خان صاحب کا مذکورہ بیان میر گل خان نصیر کی تحریر کا چربہ ہے اور میر گل خان نصیر کی من گھڑت تاریخ نویسی کو کافی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔اس بارے میں ملاحظہ کریں حاشیہ نمبر 14 کے مندرجات میں معروف محقق جسٹس (ریٹائرڈ) میر خدابخش بجارانی مری کا تبصرہ۔

39۔یہ اُن بلوچوں کی آمد نہیں جو زمانہ قبل مسیح سے بلوچستان میں موجود تھے اور کیخسرو اور کیکاؤس کی افواج میں ان کے مضبوط دستے شامل تھے جن کا تذکرہ شاہنامہ فردوسی اور ایران کی قدیم تواریخ میں بھی کیا گیا ہے۔ پانچویں چھٹی صدی کے دوران سراوان خطے سے لے کر ہرات تک ''بلوچ'' نام سے ان کا ایک وطن موجود تھا جس کا مرکزی مقام کبھی بُست اور کبھی قندہار ہوتا تھا۔ جسے عرب حکمران اور تاریخ نویس معرب کر کے ''بیلوص'' اور ''بعلوص'' لکھتے رہے ہیں۔ملاحظہ کیجئے موضوع ''بلوچ نسل'' کے حواشی کا حاشیہ نمبر 6۔

مصنف جن بلوچ قبائل کے خطہ قلات میں ورود کی بات کر رہے ہیں۔وہ ترک نژاد رند قبائل تھے۔جو ایرانی بلوچستان میں پانچ سو سال بود و باش کے دوران بلوچوں میں مدغم ہوئے۔ پندرھویں صدی عیسوی کی شروعات میں یہ قبائل قلات اور مضافات میں پھیل رہے تھے اور منگچر خطے کو ان رند قبائل نے مرکزی حیثیت دی ہوئی تھی۔

40۔ سیستان و مغربی مکران (موجودہ ایرانی زیر انتظام مکران) میں رند قبائل کی چند مضبوط و مستحکم سرداریاں ضرور قائم رہی ہیں جو بلوچ قوم کے نام پر نہیں بلکہ رند قبائل کے نام پر رہی ہیں۔ لیکن ان کے حکمرانی کرنے کی روایت محض ایک مفروضہ ہے۔ البتہ قلعہ کیچ سے متعلق ایک روایت موجود ہے کہ ایک محدود عرصہ کیلئے قلعہ کسی رند شخصیت کے قبضے میں رہا تھا جس سے پھر ہوت رئیس نے بزور طاقت قبضہ کیا۔ لیکن مذکورہ رند شخصیت کا نام کوئی نہیں جانتا۔ ''ہوت'' رئیس قبیلہ کا سردار گھرانہ رہا ہے اور مشرقی مکران خطے پر صدیوں سے حاکم اور مقتدر رہا ہے۔ اس قبیلے کی ایک تاریخی شخصیت میر حمزہ بن زیاد رئیس ،دسویں صدی عیسوی میں سندھ کے ہباری عرب حکمرانوں کی طرف سے مکران میں برسر اقتدار تھا۔ وہ ایک عالمی شہرت کا حامل شخص تھا جس کی شہرت صدیوں پر محیط تھی اسی شہرت کی بناء پر پانچ سو سال بعد ورود کرنے والے رندوں کے قومی شاعر نے رندوں کو میر حمزہ کی نسل سے منسوب کیا جسے مترجمین نے قریش کا حضرت امیر حمزہ بنا دیا۔ تفصیل کیلئے ملاحظہ کیجئے موضوع ''بلوچ نسل'' کے حواشی میں حاشیہ نمبر 19۔

واضح ہو کہ ''ہوت'' طائفہ کا رندوں کی مشہور شخصیت میر جلال خان کے مبینہ بیٹے ''ہوت'' سے کوئی نسبت نہیں ہے۔ یہ کیسپئن کے اوغز نسل رئیس قبیلہ کا سردار خیل طائفہ ہے۔ نیز ملاحظہ کیجئے ''بلوچستان کے بلوچ'' کا حاشیہ نمبر 3 اور 7۔

41۔ رند قبائل، رند لاشاری لڑائی شروع ہونے سے پہلے قلات کے مضافات میں آباد تھے اور بیسویں گاؤں بسا چکے تھے۔ قلات کا تاریخی ترک قلعہ ''قلات نیچارہ'' کے جاٹ

سردار سے جنگ کر کے قلعے پر قابض تھے۔ اور میر مندو کو اقتدار میں لانے سے قبل وہ خود حکمران تھے۔ جب بی وہاں کے رندوں کے گرفت میں آ گیا تو پھر سردار چاکر خان نے میر مندو کو برسر اقتدار لا کر بی کا رُخ کیا۔ ممکن ہے کہ لڑائی کے نتیجے کی تباہ حالی و بربادی کے بعد بعض رند طائفے واپس کوہستان قلات میں آ گئے ہوں لیکن سردار چاکر خان کی ذات اور اس کے دست راست شخصیتیں ان میں شامل نہیں تھے۔

42۔ میر مندو، نمبر دیوں اور جاٹوں جنہیں غلط طور پر جدگال روایت کیا گیا ہے، کے مابین لڑائیوں کی کافی روایات موجود ہیں لیکن آخوند ملا محمد صدیق نے میر مندو کی حمایت میں رندوں اور لاشاریوں اور براہوئیوں کے درمیان ایک جھوٹی لڑائی کا تذکرہ کیا ہے۔ جب کہ قلات میں لاشاریوں کا وروو ثابت نہیں ہے اور اُس وقت براہوئی قبائل کی تشکیل بھی نہیں ہوئی تھی اور رند اور براہوئی قبائل اور ان کے سرکردگان ہم عصر نہیں رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ملاحظہ کریں حاشیہ نمبر 15 اور حاشیہ نمبر 26،

43۔ قلات کے احمد زئی حکمران اٹھارویں صدی میں نہیں بلکہ سترھویں صدی کے وسط میں تاریخی لڑائی براہو جدگال جنگ کے اختتام پر مفتوحہ علاقوں کی تقسیم کے نتیجے میں برسر اقتدار آئے۔ مذکورہ لڑائی کا اختتام 65-1664ء میں ہوا۔ جدگالوں کے خلاف میروانی قبیلہ کے سردار گھرانہ ''براہو'' کے اتحادیوں میں قلات کے سابقہ حکمران خاندان ایلتازئی رئیس کے میر احمد خان ایلتازئی بھی شامل تھے۔ اس لئے قلات کے سابقہ حدود کے ساتھ ساتھ نئے مفتوحات سے بھی اُسے حصہ دیا گیا۔ اس طرح توسیع شدہ قلات

میں میر احمد خان ایلتازئی کی ''خان'' کی حیثیت سے دستار بندی کی گئی ۔ یہ سال 1666ء کا تھا۔ اس سنہ وسال پر تمام مورخین کا اتفاق ہے۔ جن میں آخوند محمد صدیق، میر گل خان نصیر، خان میر احمد یار خان، ملک صالح محمد لاہڑی، ملک سعید دہوار وغیرہ شامل ہیں۔ اٹھارویں صدی کی شروعات میں میر احمد خان احمدزئی (میر احمد دوئم) نے 1714ء سے 1718ء تک حکمرانی کی(۱)۔

میر احمد خان ایلتازئی کیلئے ملاحظہ کریں حاشیہ نمبر 27۔

44۔ میر احمد دوئم کے قتل کی بات میر گل خان نصیر نے اپنی کتاب ''تاریخ بلوچستان'' کے صفحہ نمبر 27 پر لکھی ہے۔ جو مشکوک ہے۔ لکھتے ہیں:

''میر عبداللہ کے ساتھ صلح کو زیادہ دن نہیں گزرنے پائے تھے کہ میر احمد خان بیمار پڑ گیا۔ بلوچی علاج کے مطابق کسی طبیب نے ان کو دُنبے کی کھال پہنائی۔ میر عبداللہ خان کو جب اطلاع ہوئی، موقع کو غنیمت جان کر مزاج پُرسی کے بہانے میری میں داخل ہوا۔ میر احمد کھال پہنے پڑا تھا کہ میر عبداللہ خان نے تلوار نکال کر اُس کا کام تمام کر دیا۔''

آخوند محمد صدیق نے جو خوانین کے درباری اور قریب ترین شخص تھے اور خوانین قلات کے مورخ بھی تھے، نے اپنی فارسی کتابچہ ''اخبار الابرار'' میں گل خان نصیر

۱۔ تاریخ خوانین قلات، ترجمہ میر گل خان نصیر، حاشیہ صفحہ 41۔ یہ میر گل خان نصیر کا اپنا موقف ہے۔ جبکہ اپنی کتاب ''تاریخ بلوچستان'' کے صفحہ نمبر 27 پر عرصہ حکومت 1714ء سے 1716ء تک لکھتے ہیں۔

کے بیان کے برعکس لکھا ہے:

''ایک دن دوپہر کے وقت میر احمد کو بیماری کی
وجہ سے کھال پہنا دی گئی تھی۔ براہوئیوں کا
طریقہ یہی ہے کہ بعض امراض میں دُنبے کی
کھال مریض کو جسم پر پہنا دیتے ہیں۔
میر عبداللہ خان اِس دن کو موزوں جان کر
میری میں داخل ہوئے اور میر احمد خان کو
گرفتار کرلیا۔ میر احمد خان نے چار سال
حکومت کی۔ میر عبداللہ خان نے اُسے گرفتار
کر کے آخوند محمد صالح کو طلب کیا اور خلعت
دے کر وزارت پر سرفراز کیا۔''(۱)

ا۔''اخبار الابرار کا اردو ترجمہ بنام''تاریخ خوانین قلات''از میر گل خان نصیر صفحہ 44۔ اِسی صفحہ کے حاشیہ میں مترجم نے نوٹ لکھا کہ''بعض مورخین کے خیال میں اُسے قتل کر دیا گیا، یہی صحیح ہے''۔ واضح ہو کہ مترجم کا''بعض مورخین'' وہ خود ہیں اور کسی نے نہیں لکھا ہے۔

بلوچ: ایک توضیحی مطالعہ

''بلوچ۔ایک تاریخی توضیحی مطالعہ'' ہمارے زیر مطالعہ رہنے والی بے شمار تحقیقی تصنیفات کا حاصل ہے۔ جو بلوچ تواریخ سے دلچسپی رکھنے والوں کی خدمت میں پیش کیجا رہی ہے۔

تاریخ نویسی کی بنیاد تحقیق پر رکھی گئی ہے جو ایک مشکل اور جہادی کام ہے۔ جو کئی کئی سالوں پر محیط ہوتی ہے۔ پھر ''تاریخ بلوچ و بلوچستان'' کے موضوع پر تحقیقی کام کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ جس نے بھی شروع میں تاریخ کی دلچسپی کے پیش نظر کمر باندھ کر اس بحر بیکراں میں غوطہ لگایا۔ جلد ہی جان کی امان پا کر نکل آیا اور پھر اسے آلودہ کرنے کی ٹھان لی۔ اور اسے دروغگوئی اور خود ساختہ مفروضات سے گدلا کر دیا نتیجہ یہ نکلا کہ اس بحر کی تہہ میں پڑے ہوئے ہیرے تب تک کوئی نہیں پاسکتا جب تک کہ اسکی سطح کے گدلے پن کو شفاف نہ کیا جائے۔ ہماری بھی دو ڈھائی دہائیوں کی ''شوہاز کاری'' اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔

گذشتہ چند مطالعاتی سالوں میں ''بلوچ'' موضوع پر جو کچھ ہماری نظر سے گذرا اُسے پلے باندھا اور اپنی تحقیقات اور معلومات کی روشنی میں ان کو جانچا اور رائے زنی کی۔ اس کتاب میں یہی کچھ ہم اپنے قارئین کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

الفت نسیم

بلوچی اکیڈمی کوئٹہ